کلیاتِ مصحفی

جلد ہفتم

مشتمل بر

دیوان ہفتم

غلام ہمدانی مصحفی امروہوی [متوفی 1240ھ / 1825ء]

بتصحیح

نورالحسن نقوی

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
ویسٹ بلاک۔1۔ آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی 110066

کلیاتِ مصحفی

جلد ہفتم

مشتمل بر

دیوان ہفتم

غلام ہمدانی مصحفی امروہوی [متوفی 1240ھ / 1825ء]

بتصحیح

نورالحسن نقوی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
ویسٹ بلاک-ا-آر-کے-پورم، نئی دہلی 110006

Kulliyat-e-Mus'hafi-Vol. VII

by

Prof. Noorul Hasan Naqvi

پہلا ایڈیشن : 550

سنہ اشاعت : 2006

قیمت : 236 روپے

سلسلۂ مطبوعات : 1267

ISBN: 81-7587-193-8

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

فون نمبر: 26103938، 26103381، 26179657، فیکس: 26108159

ای۔میل: urducoun@ndf.vsnl.net.in، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد دہلی-110006

پیش لفظ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ایک قومی مقتدرہ کی حیثیت سے کام کررہی ہے۔ اس کی کارگزاریوں کا دائرہ کئی جہتوں کا احاطہ کرتا ہے جن میں اردو کی ان علمی و ادبی کتابوں کی مکرّر اشاعت بھی شامل ہے جو اردو زبان و ادب کے ارتقاء میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں اور نایاب ہوتی جارہی ہیں۔ ہمارا یہ ادبی سرمایہ محض ماضی کا قیمتی ورثہ ہی نہیں، بلکہ یہ حال کی تعمیر اور مستقبل کی منصوبہ بندی میں ہماری رہنمائی بھی کرتا ہے اور اس لیے اس سے کماحقہ، واقفیت نئی نسلوں کے لیے ضروری ہے۔ قومی اردو کونسل ایک منضبط منصوبے کے تحت عہدِ قدیم کے شاعروں اور نثرنگاروں سے لے کر عہدِ جدید کے شاعروں اور نثرنگاروں تک تمام اہم اہلِ فکروفن کی تصنیفات شائع کرنے کی خواہاں ہے تاکہ نہ صرف اردو کے اس قیمتی علمی و ادبی سرمائے کو آنے والی نسلوں تک پہنچایا جاسکے اور زمانے کی دستبرد سے بھی اسے محفوظ رکھا جاسکے۔

عہدِ حاضر میں اردو کے مستند کلاسیکی متون کی حصولیابی، نیز ان کی کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، لیکن قومی اردو کونسل نے حتی الوسع اس مسئلے پر قابو پانے کی کوشش کی ہے۔ کلیاتِ غلام ہمدانی مصحفی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جسے کونسل قارئین کی خدمت میں پیش کررہی ہے۔

اہلِ علم سے گزارش ہے کہ کتاب میں کوئی خامی نظر آئے تو تحریر فرمائیں تاکہ اگلی اشاعت میں دور کی جاسکے۔

رشمی چودھری
ڈائرکٹر انچارج

فہرست

(غزلیات)

ردیف غ

ردیف ف

ردیف ق

ردیف ک

ردیف گ

ردیف ل

ردیف م

ردیف ن

ردیف و

ردیف ہ

ردیف ی

دیگر اصنافِ سخن

شمس الرحمٰن فاروقی:

مصحفی ریختہ کہتا ہوں میں......

یہ بات عام ہے کہ ہم نے ابھی مصحفی کا حق نہیں ادا کیا۔ اس کی وجہ بھی عام ہے کہ ان کا کلام اتنا زیادہ ہے اور اتنی مشکل سے دستیاب ہوتا ہے کہ کوئی ان پر کیسے لکھے اور کیا لکھے؟ یہ دوسری بات تو صحیح ہے کہ مصحفی کا کلام بہت ہے۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں کہ ان کا کلام مشکل سے دستیاب ہے۔ یہ بات اس وقت صحیح تھی جب فراق صاحب نے اپنا شہرۂ آفاق مضمون (''نگار'' لکھنؤ مدیر نیاز فتح پوری، کے مصحفی نمبر مطبوعہ 1939 میں) لکھا تھا۔ گذشتہ پچیس برسوں میں آہستہ آہستہ کر کے مصحفی کا سارا کلیات سامنے آچکا ہے۔ یہ درست ہے کہ دیوان پنجم کے بعد کئی دیوان بہت دیر میں، یعنی ہشتم 1995 میں اور دیوان نہم (یعنی قصائد) 1999 میں سامنے آئے۔ لیکن باقی سب کلام نور الحسن نقوی کا ترتیب دیا ہوا، یا حفیظ عباسی کا ترتیب دیا ہوا، کئی دہائیوں سے ہمارے سامنے ہے[1]۔ مصحفی پر فراق صاحب کے مضمون کے بعد صرف ایک مفصل اور عمدہ تنقیدی مضمون سید حامد کا سامنے آیا اور وہ ان کے مجموعے ''نگار خانۂ رقصاں'' (1984) کے صفحات ہی میں خاموش دبارہ گیا کیونکہ اس نے (کم سے کم میری دانست میں) کسی تفصیلی مطالعے کے لیے کسی نقاد یا طالب علم کو مہمیز نہ کیا، حالانکہ سید حامد کے بھی مضمون میں وہی خوبی تھی جو فراق صاحب کے مضمون میں تھی، کہ وہ اپنے پڑھنے والے کو مصحفی کے لیے تشویق اور ترغیب دیتے ہیں۔ مصحفی کے تئیں ان کا لگاؤ متعدی ہے اور پڑھنے والے کو مائل کرتا ہے کہ وہ بھی مصحفی سے وہی لگاؤ یا گرم جوشی پیدا کرے جو فراق صاحب یا سید حامد کو ہے۔ دوسری بات یہ کہ فراق صاحب اور سید حامد دونوں نے اپنے مضامین میں مصحفی کے عمدہ اشعار کثرت سے جمع کر دیے ہیں۔ یہ سب

ہوتے ہوئے بھی ہمیں مصحفی سے لگاؤ اگر پیدا نہ ہوسکا تو اس کا مطلب شاید یہی ہے کہ مصحفی کے بارے میں کچھ ایسے تعصبات مشہور ہوگئے ہیں کہ وہ مضامین مذکورہ بالا کی تشویق پر بھی حاوی آجاتے ہیں۔

حق یہ ہے کہ مصحفی کے ساتھ پے بہ پے کئی زیادتیاں ہوئیں اور ان زیادتیوں کا افتتاح اردو ادب کے سب سے موثر مؤرخ اور تنقید کے بنیاد گزار، یعنی محمد حسین آزاد کے جادونگار قلم سے ہوا:

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ محمد حسین آزاد کو امروہہ سے کیا پرخاش تھی۔ لیکن یہ بات صاف ظاہر ہے کہ وہ مصحفی سے اتنے بے دماغ نہیں ہیں جتنے امروہہ سے ہیں۔ چنانچہ ''امروہہ پن'' والے مشہور زمانہ (یا بدنام زمانہ) جملے سے ایک صفحہ پہلے بھی وہ ایک تیر سے دو شکار کر چکے ہیں کہ مصحفی کا کوئی خاص رنگ نہیں اور اس کی وجہ تو یا تو پُرگوئی ہے یا پھر یہ امروہہ کا قصور ہے۔ محمد حسین آزاد کہتے ہیں کہ مصحفی کی غزلوں میں:

> غزلوں میں سب رنگ کے شعر ہوتے تھے۔ کسی طرز خاص کی خصوصیت نہیں۔ بعض تو صفائی اور برجستگی میں لاجواب ہیں، بعض میں یہی معمولی باتیں جنھیں ڈھیلی ڈھیلی بندشوں میں باندھ کر پھسر پھسر برابر کہتے گئے ہیں۔ اس کا سبب یا تو پُرگوئی ہے، جس کی تفصیل آگے آتی ہے، یا دہلی اور امروہہ کا فرق ہے [2]۔

ذرا غور کیجیے، مصحفی کے یہاں سب رنگ کے شعر ہیں، بعض تو لاجواب ہیں، لیکن بعض میں بس معمولی باتیں ''پھسر پھسر'' کہہ دی گئی ہیں اور اس کا سبب یا تو پُرگوئی ہے، یا دہلی اور امروہہ کا فرق۔ دہلی اور امروہہ میں وہ کون سا پُراسرار فرق ہے، اس کی کوئی تفصیل نہیں۔ پُرگوئی نے خسرو اور بیدل کا کچھ نہیں بگاڑا، خود اردو میں میر کچھ کم پُرگو نہ تھے، مصحفی

کے برابر نہ سہی، لیکن بچارے مصحفی میں پُر گوئی عیب ہے اوروں کے یہاں ہنر اور پھر ان دو لفظوں پر غور کیجیے: ''رنگ'' اور ''طرز''۔ اول الذکر اصطلاح پرانے زمانے کی نہیں ہے۔ یعنی فارسی کے تذکرہ نگاروں یا شعرا کے یہاں مجھے یہ اصطلاح نہیں ملی۔ آج اردو میں ہم لوگ اسے ''اسٹائل'' یا ''اسلوب'' کے معنی میں استعمال کرتے ہیں، لیکن ممکن ہے محمد حسین آزاد یہ مفہوم نہ لیتے ہوں۔ انھوں نے فوراً ہی ''طرز'' کا لفظ لکھا ہے۔ یہ اصطلاح پرانے زمانے سے چلی آرہی ہے اور ہم لوگ اسے بھی ''اسٹائل'' یا ''اسلوب'' کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ یوں کہیں تو غلط نہ ہوگا کہ ''اسلوب/اسٹائل'' کے معنی میں ''طرز'' ہمارے یہاں جس کثرت سے مستعمل ہے اس کثرت سے ''رنگ'' بھی مستعمل نہیں ہے۔ لیکن فارسی اور پرانی اردو شعریات میں اس کے معنی ''اسلوب/اسٹائل'' کے نہ تھے۔

''رنگ'' کا لفظ تو پرانے فارسی تذکروں میں بہت شاذ ہے، لیکن انیسویں صدی تک یہ جہاں بھی شعر یا کلام یا شاعر کے حوالے سے آیا ہے، اسی ''طرز'' یا ''روش'' کے معنی میں آیا ہے اور محمد حسین آزاد کا یہ قول بھی کہ مصحفی کے یہاں ''سب رنگ کے شعر ہوتے تھے، کسی طرز خاص کی خصوصیت نہ تھی'' اس بات کو ظاہر کر رہا ہے کہ ''طرز'' وہ چیز ہے جس کی پیروی بہت سے لوگ کر سکتے ہیں۔ یعنی آزاد یہ نہیں کہہ رہے ہیں کہ مصحفی کا کوئی طرز نہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ وہ کسی طرز خاص کی پیروی نہ کرتے تھے۔ لہٰذا ''طرز خاص'' سے مراد ہوئی کہ کئی مختلف طرزیں جو اس وقت موجود تھیں، مصحفی نے ان میں سے کسی ایک کو بالخصوص اختیار نہ کیا، بلکہ ہر طرز میں شعر کہتے رہے۔

امروہہ اور دہلی کے فرق کو فی الحال طاق پر رکھیے۔ یہ غور کیجیے کہ ہم لوگوں نے ''طرز'' اور ''رنگ'' کو ''اسلوب/اسٹائل'' کے معنی میں لے کر مصحفی ہی نہیں، بلکہ محمد حسین آزاد کے ساتھ بھی شاید زیادتی کر دی ہے، کیونکہ آزاد نے ''طرز رنگ'' سے اسٹائل نہیں مراد لی تھی، بلکہ وہ مضامین و موضوعات مراد لیے تھے جو ان کے خیال میں مصحفی کے زمانے میں عام تھے اور شعرا اُن میں سے کوئی ایک طرز، یا کچھ طرزیں، اختیار کر لیتے تھے۔ مصحفی

نے کسی ایک طرز پر قناعت نہ کی۔ ان باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ محمد حسین آزاد نے ''طرز'' سے شاعری کے علاقوں میں ایک علاقہ (Territory) ، یا شعر کے طرز وجود (Ontology) کا ایک طریقہ قرار دیا ہے۔ ان کے یہاں ''طرز''، ''روش'' اور کبھی کبھی ''انداز'' کے الفاظ اسی طرز وجود یا علاقے کے معنی میں استعمال کیے گئے ہیں۔ فارسی میں بھی ''طرز'' اور ''شیوہ'' انھی معنی میں برتے گئے ہیں، اسلوب/اسٹائل کے معنی میں نہیں۔

یہ بات کہ ہر اچھے شاعر کا اپنا ذاتی اسٹائل/اسلوب ہوتا ہے، ہماری تنقید میں بیسویں صدی میں داخل ہوئی۔ ہم لوگوں نے لفظ ''طرز''، ''شیوہ'' جیسے الفاظ کے بارے میں گمان کیا کہ ان کے وہی معنی ہیں جو ''اسٹائل'' کے ہیں۔ لہٰذا ہم لوگوں نے سمجھا کہ پرانے لوگوں کے یہاں شعرا کے ذاتی ''اسٹائل'' کا تصور تھا اور اگر مصحفی کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ انھوں نے کسی ''طرز خاص'' کو اختیار کیا، بلکہ ''سب رنگ'' کے شعر کہے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ مصحفی کے یہاں انفرادیت نام کی چیز نہیں ہے۔ ان کا اپنا کچھ نہیں ہے، جو جہاں سے ملتا ہے وہ اسے اُٹھا لاتے ہیں۔

اگر ''طرز''، ''شیوہ''، ''رنگ'' جیسے الفاظ کے بارے میں ہمیں یہ معلوم ہوتا کہ یہ اصطلاحیں اور انفرادی ''اسٹائل/اسلوب'' کے جس تصور کو بیان کرنے کے لیے ہم انھیں استعمال کر رہے ہیں، وہ تصور پرانے زمانے میں، بلکہ آزاد، حالی وشبلی تک کے زمانے میں بھی موجود نہ تھا، تو ہم پر یہ بات واضح ہوتی کہ اگر کسی پرانے تذکرہ نگار یا شاعر نے کسی کے بارے میں لکھا کہ اس کا کوئی خاص طرز نہ تھا، تو کوئی بری بات نہیں لکھی۔ اس کا مفہوم یہ ہرگز نہیں کہ اس شخص کی کوئی انفرادیت نہیں ہے۔ بے شک شبلی نے ''طرز'' کا ترجمہ ''اسٹائل'' کیا، لیکن یہ ان کی غلطی تھی۔ اس غلطی کی وجہ یہ ہے کہ وہ ''طرز'' کے معنی تو سمجھتے تھے، لیکن انگریزی بخوبی نہ جانتے تھے۔

''طرز'' کے معنی سمجھنے کے لیے شبلی کے حسب ذیل بیانات کو ذہن میں لائیے:

1۔ غزل میں مختلف طرز (اسٹائل) قائم ہوئے۔

2۔ واقعہ گوئی کے موجد سعدی ہیں اور امیر خسرو نے اس پر معتد بہ اضافہ کیا......اس طرز کو جن لوگوں نے اپنا خاص موضوع بنالیا تھا، وحشی یزدی، علی قلی میلی اور علی نقی کمرہ ہیں......اس (وحشی) نے اس طرز کو کسی قدر اعتدال سے بڑھادیا......

3۔ غزل میں فلسفہ کی آمیزش عرفی نے خاص طور پر کی، لیکن اس طرز کو بہت ترقی نہیں ہوئی......

4۔ خیال بندی اور مضمون آفرینی: اس طرز خاص کا نمایاں کرنے والا جلال اسیر ہے......

5۔ قصیدے کا ایک خاص طرز عرفی نے قائم کیا جس کی کوئی تقلید نہ کرسکا......

6۔ شاعری کا جو انداز مقبول عام تھا، سلطان حسین مرزا کے شعرا کا انداز تھا، چونکہ فغانی کا رنگ ان سے الگ تھا۔ اس لیے کسی نے ان کی قدر نہ کی۔

یہ بیانات ''شعرالعجم'' کی جلد سوم (صفحہ 17 تا 24) سے ماخوذ ہیں[3]۔ صاف ظاہر ہے کہ شبلی کی نظر میں:

1۔ موضوع شعر اور طرز شعر میں کوئی فرق نہیں (بحوالہ نمبر 2 اور نمبر 3)۔

2۔ کسی طرز کا موجد کوئی شخص ہوسکتا ہے، لیکن دوسرے اس طرز کی تقلید بھی کرتے یا کرسکتے ہیں (بحوالہ نمبر 4 اور نمبر 5)۔

3۔ ''طرز''، ''رنگ''، ''انداز''، ''موضوع'' ہم معنی ہیں (بحوالہ نمبر 1 تا نمبر 6)، لیکن ان الفاظ کا ترجمہ ''اسٹائل'' نہیں ہوسکتا۔ مثلاً کیٹس، شیلی، بائرن، یہ سبھی رومانی طرز کے شاعر ہیں، لیکن ان کا ''اسٹائل'' الگ الگ ہے۔

4۔ خیال بندی اور مضمون آفرینی استعارے کے عالم سے ہیں۔ چونکہ استعارہ تو تمام

شاعری میں ہے، لہٰذا ظاہر ہے کہ شبلی اگر خیال بندی اور مضمون آفرینی کو"طرز" کہہ رہے ہیں تو یہاں بھی"طرز" کا مفہوم فن پارے کا طرز وجود ہے۔ استعارے کا تعلق اسٹائل یا اسلوب سے نہیں۔ استعارہ اگر تمام شاعری میں ہے تو اسلوب/اسٹائل اور استعارے میں کوئی فرق نہ ٹھہرے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ بات مہمل ہے۔ لہٰذا اسٹائل/اسلوب سے مراد استعارے کا وجود نہیں، بلکہ استعارے کو استعمال کرنے کا طریقہ ہے۔ یعنی"خیال بندی/مضمون آفرینی" استعارے کا ایک خاص طرز وجود ہیں۔

ممکن ہے بعض لوگوں کا خیال ہو کہ جب شبلی نے"طرز" لکھ کر خود ہی اس کے آگے "اسٹائل" لکھ دیا ہے تو ہم بھی ان کے پیرو کیوں نہ ہوں۔ لیکن یہاں مشکل یہ ہے کہ پھر ہمیں"طرز" کی نہیں، بلکہ"اسٹائل" کی تعریف بدلنی ہوگی۔ بہر حال دیکھیے غالب اس مسئلے کو کس طرح حل کرتے ہیں۔ عبدالغفور سرور کے نام ایک خط میں غالب نے لکھا ہے:

رودکی و فردوسی سے لے کر خاقانی و سنائی و انوری وغیرہم تک ایک گروہ۔ ان حضرات کا کلام تھوڑے تفاوت سے ایک وضع پر ہے۔ پھر حضرت سعدی طرز خاص کے موجد ہوئے......فغانی اور ایک شیوۂ خاص کا مبدع ہوا......اس شیوے کی تکمیل ظہوری و نظیری و عرفی نے کی......اس روش کو بعد اس کے صاحبان طبع نے سلاست کا چربہ دیا۔ صائب و کلیم و سلیم و قدسی و حکیم شفائی اس زمرے میں ہیں......فغانی کا انداز پھیلا اور اس میں نئے نئے رنگ پیدا ہوتے گئے۔ تو اب طرزیں تین ٹھہری ہیں: خاقانی اور اس کے اقران، ظہوری اور اس کے امثال، صائب اور اس کے نظائر[4]۔

مندرجہ بالا عبارت سے یہ نتائج نکلتے ہیں:

1۔ "وضع"، "طرز"، "شیوہ"، "روش"، "انداز"، "رنگ"، یہ سب لفظ شاعری کے سیاق و سباق میں غالب کے لیے ہم معنی ہیں۔

2۔ کسی طرز میں کئی شاعر شریک ہو سکتے ہیں اور اس بات سے ان کی عظمت پر کوئی بٹہ نہیں لگتا۔

3۔ غالب کے حساب سے تو صرف تین طرزیں ہیں اور تمام فارسی شاعر انھی تین طرزوں میں سمائے ہوئے ہیں۔

4۔ کسی طرز خاص کا موجد کوئی ایک شاعر ہوتا ہے، یا کبھی کبھی دو تین شاعروں کے کلام سے ایک طرز ترتیب پاتی ہے اور پھر بہت سے شاعر اس کی تقلید کرتے ہیں۔

ان باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ غالب کے حساب سے ''طرز'' وغیرہ الفاظ کا ترجمہ ''اسٹائل'' ہو ہی نہیں سکتا اور نہ یہ ضروری ہے کہ ہر شاعر کا اپنا کوئی طرز ہو۔ اب غالب سے ایک صدی کچھ اوپر، جب اردو شاعری میں نئی طرزوں کی بنیاد پڑ چکی تھی، میر کو سنیے، ''نکات الشعرا'' (1752) کے پہلے ہی صفحے پر ہے:

> فن ریختہ کہ شعریست بطور شعر فارسی بزبان اردوے معلّٰی شاہجہاں آباد دہلی[5]......

اب یہاں ہم ایک نئے لفظ ''طور'' سے متعارف ہوتے ہیں اور صاف ظاہر ہے کہ میر کی نظر میں یہ بات باعث شرم نہیں بلکہ باعث اطمینان ہے کہ ریختہ کا فن شعر فارسی کے طور یا طرز پر ہے اور چونکہ فارسی کے کئی طور ہیں۔ لہذا یا تو میر کا خیال ہے کہ ہم فارسی کا کوئی بھی طور اختیار کر لیں، سب ٹھیک ہے۔ یا پھر ہم ''طور فارسی'' سے فارسی کی وہ شاعری مراد لیں جو میر کے زمانے میں بے حد مقبول تھی اور جسے آج ہم ''سبک ہندی'' کہتے ہیں اور جس کی تعریف ''نکات الشعرا'' کے چند دہائی پہلے کشن چند اخلاص نے اپنے تذکرے ''ہمیشہ بہار'' (1724) میں یوں کی تھی کہ سخن ''میوۂ پیش رس بوستان تجلیات گوناگوں'' اور ''باعث نشو ونماے اشجار روضۂ انفسی و آفاقی'' ہے اور ''نقش بندان صور معانی'' کو اس سے زیبا تر

پری پیکر تصور میں بھی نہیں گزرا ہے۔ کلام موزوں کا رتبہ نثر سے بالا وفزوں ہے اور اس کا شاہد صادق ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے کہ زیب عنوان کلام اللہ ہے''۔ اس لیے اس کتاب میں عہد جہانگیری سے لے کر عہد محمد شاہی تک کے شعرائے ''معنی یاب'' کے حالات اور ان کے ''سخنان رنگیں خیال'' درج کیے جائیں گے [6]۔

واضح رہے کہ قرآن و حدیث سے استدلال لانے کا طریقہ امیر خسرو کا ایجاد کردہ ہے اور ''معنی یابی''، ''سخن رنگیں''، یہ فقرے سبک ہندی، بلکہ ہندستانی شعرائے سبک ہندی کی اصطلاحیں ہیں، اپنے تذکرے کے اختتام پر میر نے لکھا ہے کہ ایہام کی طرز اب زیادہ مقبول نہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کی جو خصوصیات گنائی ہیں۔ ان میں ''خیال'' کو خاص اہمیت دی گئی ہے، لیکن یہ بھی کہا گیا ہے کہ میری باتیں ان کے لیے ہیں جو اس ''طرز خاص'' کو سمجھتے ہیں، ورنہ ''میں گلستان سخن کی رنگینیوں سے واقف ہوں اور ہر گلے را رنگ و بوے دیگر است [7]''۔ یعنی کسی شاعر کا مخصوص طرز بھی ہوسکتا ہے (اور ممکن ہے کہ اس کے سمجھنے والے بہت نہ ہوں)، اور یہ بھی ممکن ہے کہ رنگ رنگ کے پھول ہوں اور ہر طرح کے پھول کا اپنا ہی رنگ و بو ہوتا ہے۔ یعنی اس سے انکار نہیں کہ طرزیں بہت ہوسکتی ہیں، لیکن یہ بھی ہے کہ ایک طرز کے بہت سے ہوسکتے ہیں اور کوئی کسی زمانے میں مقبول اور کسی زمانے میں نامقبول ہوسکتا ہے۔

ان باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ میر کو بالکل اصرار نہیں کہ ہر شاعر کسی مخصوص اسلوب/اسٹائل کا مالک ہو۔ یہ تو گلستان سخن ہے، یہاں ہر رنگ اور تقلید کی گنجائش ہے۔ اوپر میں نے امیر خسرو کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے بھی ''طرز'' کے باب میں بڑی دلچسپ باتیں لکھی ہیں۔ اپنے دیوان ''غرۃ الکمال'' کے شہرۂ آفاق (لیکن کم پڑھے گئے) دیباچے میں وہ کہتے ہیں کہ شعر کی چار شکلیں ہیں، یابس، معتدل، رطب اور محترق۔ ان شکلوں کو وہ ''طرز'' مانتے ہیں، کیوں کہ وہ لکھتے ہیں کہ:

پس صرفۂ سخن آں باشد کہ لفظ را در نثر صرف کنند۔ شکل دوم معتدل
است وآں طرزے است کہ آں را شاعرانہ گویند[8]۔

شعر کی مختلف شکلوں یا طرزوں کے مختصر ذکر کے فوراً بعد خسرو کہتے ہیں کہ شعر میں دانائی پانچ صورتوں یا شکلوں میں نظر آتی ہے:

دانش پنجم شاعرانہ است وآں چناں کہ در جملہ طرز ہائے دانش
بہ نہایت آن طرز برسد، فاضلانہ وحکیمانہ ونیکوطبعانہ وعاشقانہ[9]۔

''شاعرانہ'' دانش کی تعریف کے بعد لازم تھا کہ خسرو ہمیں بتاتے کہ اس دانش کا اظہار سب سے زیادہ کس کے یہاں ہوتا ہے اور کس طرح۔ چنانچہ یہاں خسرو ''استاذ'' اور ''نیم استاذ'' اور ''شاگرد'' کا نظریہ پیش کرتے ہیں:

چوگاں باز میدان گفت وگوے از سہ حال خالی نہ باشد۔ یا علیحدہ اورا طرزے پیدا گردد کہ پیش ازاں کسے رانہ بودہ باشد۔ چونکہ طرز مجددانہ سنائی وانوری وظہیر فاریابی ونظامی است۔ طرز خاص وملکی ملک وروش روشن، نہ چناں کہ خاقانی را گویند از مجیر (بیلقانی) وکمال اسمٰعیل را از مولانا رضی الدین نیشاپوری، ومعزی (فرزونی) از مسعود سعد۔ ویا متابعت طرزے کند متقدمان و معاصران و یا در بند کشادن بربستہ ہائے دیگراں شود...... واگر آن طراز ندۂ نظم را در طریقے خاص، روش اختصاص پیدا نہ گردد، پس از پیروی پیش رفتگاں و دنبالہ کشی پس ماندگاں کارے از پیش بردو نقش خود را در طرز دیگراں بدوزد...... اورا نیز استاد گیرند، اما نیم تمام...... پس استاد آں کس باشد کہ صاحب طرز است، ومتابع طرز، شاگرد آں بود۔ واگر آں مجددانہ طرزے دست دہد ونہ متابعت استادے را پاے دارد، برحال سوم ماند......

......اما اسم استادی، ایں حرف بر من شکستہ درست نیاید...... ہر چہ در مواضع مواعظ و حکم گفتہ ام، حکم آں متابع طبیعت سنائی و خاقانی است ...... وانچہ مثنوی و غزل رواں کردہ ام، از اتباع طباع نظامی و سعدی است......

......اما بیان آں کہ استاد نیستم، ازیں است کہ بندہ از آں چہار شرط استادی کہ گفتہ شد، اول شرط ملکیت طرز است، بر حکم ماجرائے کہ در مجرائے قلم جریان یافت کہ چندیں استاد را متابع کلمات و کمالات بودہ ام، پس استاد چگونہ باشم[10]۔

مندرجہ بالا بحث میں شعریات کے بہت سے نکات مضمر یا ظاہر ہیں اور ''غرۃ الکمال'' میں اس موقع پر اور بہت کچھ تقریر ہے۔ جو عبارتیں میں نے چھوڑ دی ہیں ان کا بھی یہی حال ہے۔ لیکن میرا مقصود خسرو کے نظریۂ شعر پر گفتگو نہیں، بلکہ ''طرز'' کی تعریف متعین کرنا ہے۔ حسب ذیل باتیں بالکل صاف ہیں:

1۔ استاد وہ ہے جو کسی ''طرز'' کا موجد ہو۔ ''طرز'' سے مراد مضامین شعر میں اضافہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگ بہت کم ہیں۔ خاقانی جیسے بڑے شاعر بھی کسی اور کے متبع ہیں۔

2۔ ایک طرز کے، یا کسی طرز کے شاعر کے، بہت سے متبع ہو سکتے ہیں۔

3۔ جو شخص کہ پیش رووں، یا معاصروں، یا دونوں کا اتباع کر کے پختگی کا درجہ حاصل کر لیتا ہے، وہ آدھا استاد ہے۔

4۔ شاگرد وہ ہے جس میں مندرجہ بالا دونوں میں سے کوئی حال نہ ہو۔

5۔ ہر شخص طرز نو کا موجد نہیں ہوتا۔ خسرو خود اپنے کو شعر میں طرز نو کا موجد نہیں مانتے (بعد میں انھوں نے کہا ہے کہ میں نے نثر میں نئی طرز ایجاد کی ہے، لیکن یہ بات فی

الوقت ہماری بحث سے خارج ہے)۔

6۔ خسرو خود کو استاد مانیں یا نہ مانیں، ہم انھیں صاحب اسلوب کا درجہ دیتے ہیں۔لہٰذا پرانے نظریۂ شعر میں اسلوب کی انفرادیت زیر بحث نہ تھی اور نہ وہاں ''صاحب طرز'' اور ''منفرد'' کو ایک ہی معنی میں قرار دے سکتے ہیں۔

7۔ ''طرز''، ''روش'' ایک ہی معنی رکھتے ہیں اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ غالب نے ان کے علاوہ ''شیوہ''، ''انداز''، ''وضع''، ''روش''، ''رنگ'' بھی اس معنی میں استعمال کیے ہیں اور یہ معنی وہ نہیں ہیں جو انگریزی لفظ Style کے ہیں۔میر نے ''طرز'' کے معنی میں ''طور'' استعمال کیا ہے۔

8۔ شبلی اور آزاد نے بھی ''طرز''، ''روش''، ''رنگ'' وغیرہ سے وہی معنی مراد لیے ہیں جو خسرو غالب نے مراد لیے تھے۔شبلی کی غلطی صرف اتنی ہے کہ انھوں نے ''طرز'' کا ترجمہ Style کر دیا۔

9۔ ہماری غلطی یہ ہے کہ ہم نے محمد حسین آزاد کے معنی کو غلط سمجھ کر یہ فیصلہ کرلیا کہ مصحفی میں کوئی انفرادیت نہیں ہے۔

لیکن محمد حسین آزاد نے ''امروہہ پن'' کا جو پٹاخا چھوڑا، اس کی گونج اب تک باقی ہے، کیونکہ فقرہ گرم ہے اور اس کا مطلب انھوں نے کبھی بتایا نہیں۔پچھلے اقتباس کے چند صفحے بعد فرماتے ہیں:

> غرض شعر کی ہر شاخ کو لیا ہے اور جو قواعد وضوابط اس کے استادوں نے باندھے ہیں، اس کا حق حرف بہ حرف بلکہ لفظ بہ لفظ پورا کیا ہے (یہ تقلیب خدا معلوم سہواً ہے یا بالا رادہ)۔ہاں اپنے ہم عصروں کی طرح طبیعت میں چلبلاہٹ اور بات میں شوخی نہیں پائی جاتی کہ یہ

> کچھ اپنے اختیار میں نہیں، خداداد بات ہے...... یہ بھی مطلب کو بہت خوبی اور خوش اسلوبی سے ادا کرتے ہیں۔ مگر کیا کریں، وہ امروہہ پن نہیں جاتا[11]۔

یہ بات تو بالکل غلط ہے کہ مصحفی کی ''طبیعت میں چلبلاہٹ اور بات میں شوخی'' نہیں۔ بہر حال، یہ تو ہم کلام پڑھ کر کبھی نہ کبھی دیکھ ہی لیں گے۔ لیکن خدا کے لیے کوئی یہ تو بتائے کہ یہ ''امروہہ پن'' کیا ہے جو بچارے مصحفی کی گردن پر بیتال کی طرح مسلط ہے؟ آخر قیام الدین قائم بھی تو چاند پور کے تھے جو امروہہ سے بہت کمتر ہے (امروہہ تو صدر مقام رہ چکا تھا اور اس کی شان کا معلوم کرنا ہو تو آنند رام مخلص کا سفر نامہ دیکھیں۔ چاند پور تو تب بہت گمنام تھا اور قائم نہ ہوتے تو آج بھی گمنام رہتا۔ امروہہ تب بھی مشہور جگہ تھی اور آج بھی ہے)۔ محمد حسین آزاد نے قائم چاند پوری کو صف نعال میں جگہ دی لیکن یہ بھی لکھا کہ ان کے اکثر شعر میر سے پہلو مارتے ہیں۔ امروہہ کو دو چار تو گھونپنے پر بھی ان کا جی نہ بھرا تھا کہ ایک لات مار کر امروہہ والے کی کمر ہی توڑ دی۔ فرمایا:

> لکھنؤ شہر تھا۔ عین مشاعرے کے دن لوگ آتے، آٹھ آنے سے ایک روپے تک اور جہاں تک کسی کا شوق مدد کرتا وہ دیتا۔ یہ اس میں سے نو، گیارہ اکیس شعر کی غزل نکال کر حوالے کر دیتے تھے۔ ان کے نام کا مقطع کر دیتے تھے۔ اور اصل سبب کمزوری کا یہ تھا کہ بڑھاپے میں شادی بھی کی تھی۔ چنانچہ سب سے پہلے ایک سالا تھا وہ شعر چن کر لے جاتا۔ پھر سب کو دے لے کر جو کچھ بچتا وہ خود لیتے اور اس میں لون مرچ لگا کر مشاعرے میں پڑھ دیتے...... بلکہ ایک مشاعرے میں جب شعر کی بالکل تعریف نہ ہوئی تو انھوں نے تنگ ہو کر غزل زمین پر دے ماری اور کہا کہ روے فلاکت سیاہ جس کی بدولت کلام کی یہ نوبت

پہنچی ہے[12]۔

میں تھوڑی دیر میں آپ کی خدمت میں مصحفی کے آٹھویں دیوان کے کچھ شعر پیش کروں گا۔ پھر دیکھیے گا کہ سترے بہترے اس شاعر کے منھ پر ہوشمندی کے سبب ستارۂ بلندی روشن ہے یا فلاکت کی روسیاہی اس کے سر پر آسیب کی طرح چھائی ہوئی ہے۔ فی الحال فراق صاحب کی چند باتیں سن لیں، کہ وہ مصحفی کے بہت بڑے مداح ہیں۔ بے شبہ فراق صاحب نے اپنے مضمون میں مصحفی کے بڑے عمدہ اشعار کثرت سے نقل کیے ہیں اور بار بار یہ بھی کہا ہے کہ مصحفی ''صاحب طرز'' بھی ہیں، ان میں ''انفرادی خلاقی'' بھی ہے اور ان کی ''ایک شاعرانہ شخصیت'' بھی ہے[13]۔ لیکن ان کی ساری کوشش اس لیے بیکار چلی گئی کہ انھوں نے اسی مضمون میں حسب ذیل طرح کے جملے بھی بکثرت لکھے ہیں:

> مصحفی کو تقلید اور انتخابیت کا حیرت انگیز ملکہ حاصل تھا[14]۔
>
> مصحفی نے میر کی پیروی کی ہے لیکن ہمیشہ ذرا کترا کے کی ہے[15]۔
>
> مندرجۂ بالا اشعار کا انداز بیان بالکل میر کا سا ہے۔ لیکن تخیل کے کان پر کھ لیتے ہیں کہ بجائے میر کے ان میں سودا کا رنگ زیادہ جھلکتا ہے[16]۔

لیکن جب وہ مصحفی کی انفرادیت ثابت کرنے پر آتے ہیں تو فراق صاحب کے معجز بیان قلم سے اس طرح کے بے معنی جملے تراوش کرتے ہیں:

> مصحفی کے مندرجۂ ذیل اشعار میں ایک مانوس و معصوم درد اور حسرت ہے۔ ان پھولوں کی رگ ہائے گل میں ایک دکھتی ہوئی سی رگ ہے اور ان کی نکہت میں کچھ درد بھی ملا ہوا ہے...... مصحفی کے یہاں ایک رکی رکی سی معصوم حیرت، ایک دبی ہوئی بے چارگی کی مسکراہٹ، اوپر کے

دانتوں سے نیچے کا ہونٹ دبا لینے کی ادا ملتی ہے [17]۔

ظاہر ہے کہ ایسے جملے کسی کے لیے وثوق انگیز نہیں ہو سکتے، خوبصورت وہ بھلے ہی ہوں۔ لیکن مجھے اس میں بھی کلام ہے اور اگر خوبصورت ہیں بھی، تو ہمیں ان سے میر، سودا اور مصحفی کے درمیان مبینہ یا مفروضہ فرق کا کچھ پتہ نہیں چل سکتا۔ ان کے مضمون کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس سے ہمیں مصحفی کو پڑھنے کی توفیق ہوتی ہے اور یہ بہر حال بہت بڑی بات ہے۔

فراق صاحب نے کمتر اور سید حامد نے زیادہ تر مصحفی کے اشعار کو اس طرح نقل یا بیان کیا ہے گویا وہ حقیقی دنیا کے واقعات ہوں۔ یہ طریق کار ایک حد تک قاری کا ساتھ دیتا ہے، لیکن اگر ''حقیقی دنیا'' سے شاعر کے ذاتی اور شخصی کوائف مراد لیے جانے لگیں تو غزل کی تنقید اور غزل کے شاعر کی تقدیر دونوں خطرے میں پڑ جاتی ہیں، کیونکہ پھر تو یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ شاعر سچ بول رہا ہے یا جھوٹ اور اگر سچ نہیں بول رہا ہے تو سچ کیا ہے؟ اور اگر سچ کچھ اور ہے اور شاعر کا بیان کچھ اور، تو کیا ہم اسے کاذب کہیں گے اور کیا وہ کاذب کہلانے کے بعد شاعرانہ منصب سے اتارے جانے کا مستحق ہو جائے گا؟ عندلیب شادانی تو یہی سمجھتے تھے کہ اگر شاعر نے آپ بیتی نہیں بیان کی ہے تو غزل کا شاعر نہیں ہے۔ بہت سے لوگ تو تعلیوں کو بھی آپ بیتی کی طرح پڑھنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح، وہ لوگ بھی ہیں جو شاعر کو مرتبۂ طریقت پر فائز دیکھنا چاہتے ہیں اور غزل کے ہر شعر کو سلوک و عرفان کی راہوں کا رہنما ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دینے کو تیار رہتے ہیں۔ ہمارے محترم رالف رسل صاحب بھی انھیں میں ہیں۔

لیکن میرا خیال ہے جس طرح کے فیصلے رالف رسل، یا فراق گورکھپوری اور ایک حد تک سید حامد نے کیے ہیں ان کے لیے پہلی ضرورت یہ ہے کہ شاعر کا پورا کلام ہمارے سامنے ہو۔ یا اگر پورا کلام نہ ہو تو اس کا بڑا حصہ ٹھیک سے ہمارے سامنے ہو۔ اس طرح ہم

اس کے بدلتے ہوئے خیالات، تصورات کی انواع و الوان، مزاج کی راستی اور ٹیڑھ، سلامت طبعی اور بے اعتدالی، بدلتے ہوئے حالات میں اس کا ردِ عمل (یا ردِ عمل کا فقدان)، وغیرہ معلوم کر سکتے ہیں۔ لائبریریوں کے مخطوطوں کو چھوڑ کر مصحفی کا جو کلام عموماً سامنے رہا ہے وہ نام نہاد ''دیوان مصحفی'' ہے جو 1878 میں رامپور سے شائع ہوا تھا[18]۔ اس کے تدوین کرنے والے اس وقت کے دو بڑے شاعر مظفر علی اسیر اور امیر مینائی تھے۔ مظفر علی اسیر کو مصحفی کے ارشد تلامذہ میں شمار کیا جاتا ہے اور امیر مینائی بھی اپنے استاد مظفر علی اسیر سے کچھ کم نہ تھے۔ لہٰذا توقع کی جا سکتی تھی کہ یہ ''دیوان مصحفی'' معتبر ہوگا۔ لیکن اول بات تو یہ کہ یہ دیوان نہیں، مصحفی کے اول چار دواوین کا انتخاب ہے اور دوسری بات یہ اس میں بیٹا اور پوتا، شاگرد نے پچاس باون برس پہلے کے مرے ہوئے استاد کی زبان، محاورہ اور تہذیبی مفروضات اور رویوں کو بخیال خود ''جدید اور تہذیب یافتہ'' بنا دیا ہے۔ لہٰذا اس میں مصحفی کی نہ پوری شکل نظر آتی ہے نہ سچی شکل نظر آتی ہے[19]۔

مصحفی کا آٹھواں دیوان خدابخش لائبریری پٹنہ نے ایک نسخہ منحصر بہ فرد کی بنیاد پر عابد رضا بیدار کے مقدمے کے ساتھ چھاپ دیا ہے۔ انھوں نے اصل مخطوطے کی نقل بھی الگ سے چھاپ دی ہے۔ مصحفی کا انتقال 1824 میں ہوا اور اس آخری دیوان کے بارے میں گمان ہے کہ 1820 تک تیار ہو گیا ہوگا۔ ہم لوگوں کے خیال سے آخری عمر میں انسان کہولت ذہنی اور جسمانی دونوں کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کی شاعری تو بہر حال جھک کر پژمردہ ہو چکی ہوتی ہے۔ لیکن مصحفی کا حال یہ نہ ہوا۔ حیات مصحفی کی آخری چوتھائی میں شاہ نصیر اور ناسخ و آتش کی لائی ہوئی خیال بندی کا بول بالا تھا۔ مصحفی نے بوڑھے استادوں کے وطیرے کے علی الرغم اس نئے طور کو بڑی فراخ دلی سے قبول کیا۔

ہر بڑے شاعر میں بعض صفات ایسی بھی ہو سکتی ہیں جن کا براہ راست تعلق اس کی شاعری سے نہ ہو بلکہ اس کے زمانے کے شاعرانہ ماحول، ادبی معاشرے کی ہوا اور لسانی صورت حال سے ہو۔ مصحفی کے ہم عمروں میں جرأت کے یہاں ان باتوں یعنی لسانی ماحول

وغیرہ کی طرف اشارے نہیں ملتے۔ انشا اور رنگین کے یہاں بھی کلام میں اشارے تو نہیں ہیں۔ لیکن ان لوگوں نے پوری پوری کتابیں ان موضوعات پر لکھی ہیں۔ مصحفی نے اپنی غزل، قصیدہ اور رباعی تینوں میں اپنے وقت کی لسانی صورت حال، اردو پر فارسی عربی کے اثر پر کلام کیا ہے۔ کیا دیسی لفظ فارسی عربی لفظ کے مقابلے میں ہمیشہ کمتر فصاحت کا حامل ہوتا ہے؟ روزمرہ سے کیا مراد ہے؟ یہ سوالات ان کے یہاں اٹھائے گئے ہیں اور اس طرح کہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ تذکرے محض سرسری نہیں ہیں بلکہ شاعر کو اس پوری صورت حال سے عملاً دلچسپی ہے۔

اسی طرح، مصحفی پہلے شخص ہیں جنھوں نے محسوس کرلیا تھا کہ اب شعر فارسی کا آخری زمانہ ہے، اب زمام حکومت یا زمام کار اردو کے ہاتھ آگئی ہے، یا آنے والی ہے۔ ان کے دیوان اول (تقریباً 1785) میں یہ شعر ان کی دور بینی اور جراءت مندی دونوں کی دلیل ہے:

مصحفی فارسی کو طاق پہ رکھ
اب ہے اشعار ہندوی کا رواج [20]

مصحفی کے زمانے تک اردو کے مقابلے میں فارسی کا رعب اہلِ دہلی پر اس درجہ طاری تھا کہ وہ اردو کی غزل کو غزل ہی نہیں مانتے تھے۔ اردو غزل کو وہ محض ''ریختہ'' کہتے تھے اور فارسی غزل کو محض غزل۔ چنانچہ قائم کا مشہور شعر ہے کہ جس کا مطلب سمجھنے میں ہم لوگوں کو تکلف ہونا چاہیے تھا، لیکن ہم لوگ شاید اسے دلّی والوں کی لن ترانیاں سمجھ کر پی گئے۔

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی [21]

قائم کی تمام تر تعلیاں ان کو یہیں تک لے جا سکیں کہ میں نے ریختہ (اردو) کو غزل (فارسی) کے طرز پر بنا دیا۔ میر ان سے بہت زیادہ مغرور تھے، لیکن ان کا بھی ریختہ فیض آباد، دکن اور ایران ہی تک گونجتا رہا۔ میر بہت جوش میں آئے تو انھوں نے اپنی زمین شعر کو آسمان کر دیا:

ریختہ کاہے کو تھا اس رتبۂ اعلیٰ میں میر
جو زمیں نکلی اسے تا آسماں میں لے گیا[22]

میر نے یہ سب کیا لیکن یہ نہ کہہ سکے کہ میں نے اپنی غزل کو فارسی غزل سے بڑھا دیا ہے (یقیناً بڑھا دیا تھا، لیکن کہنے کی جراءت نہ تھی)، مگر مصحفی کو سنیے:

مصحفی ریختہ کہتا ہوں میں بہتر ز غزل
معتقد کیونکہ کوئی سعدی و خسرو کا ہو[23]

صرف اسی ایک شعر کی جراءت مندی اور حق شناسی پر پورے پورے دیوان نثار ہو سکتے ہیں۔ اگر قائم کے شعر کی گواہی نہ ہوتی تو میں اسے مصحفی کی شیخی سمجھ لیتا، کہ تعلیاں بھی شعرا کے شیووں میں شامل ہیں۔ لیکن قائم کے شعر کو سامنے رکھیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ مصحفی شیخی نہیں مار رہے ہیں، وہ اپنے آزاد ادبی تشخص کا اعلان و اہتمام کر رہے ہیں اور یہ بھی دھیان میں رکھیے کہ انھوں نے ''سعدی و خسرو'' کہا یعنی ایک تو ہندستان میں فارسی کا سب سے بڑا شاعر ہے اور ایک ایران میں فارسی غزل کا عظیم ترین شخص مانا جاتا ہے۔ دونوں ہی ملکوں کی فارسی گوئی کے مقابلے میں مصحفی کو اپنا ریختہ زیادہ معتبر نظر آتا ہے۔ یہ بڑبولا پن نہیں، اردو کی قومی اور لسانی تشخص کی کتاب کا پہلا باب ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا، یہ شعر دیوان ہشتم میں ہے۔ چھوٹا سا دیوان ہے، میر کے چھٹے دیوان سے کچھ ہی بڑا ہوگا۔ لیکن شاعر نے دردمندی، سیاسی رائے زنی، عشق، ہوس، تعلیاں، دعوے داریاں، موعظت و حکم، کسی انداز مضمون کو ترک نہیں کیا ہے۔ عقل مندی کی تو وہ وہ باتیں

ہیں کہ پڑھیے اور حیرت کیجیے کہ غزل میں اس طرح کی بھی دنیاوی عقل، بلکہ کلبیت اور دنیاداری ممکن ہیں، پھر کبھی ابہام کے ساتھ، کبھی استعارے کے ساتھ۔ شروع ہی کی تین غزلوں کے شعر ہیں:

نقشہ نہ کبھی صورت نوعی کا مٹے گا
نجّار کے ہے ہاتھ میں جب کہ بسولا

کچھ تو دیکھی ہے زمانے سے اذیت اس نے
گوشہ عنقا کو جو خوش آیا ہے تنہائی کا

رات دن شہر کی گلیوں میں پڑے پھرتے تھے
عشق تھا جب کہ ہمیں اس بت ہرجائی کا

اس کی مجلس میں میں آئینہ بنا ہوں جاکر
دم سبھی بھرتے ہیں واں میری شناسائی کا

جو محبوب القلوب گلرخاں تھا زندگانی میں
زیارت کو اب اس کی اک پری پیکر نہیں آتا[24]

ان اشعار کی لفظی اور معنوی خوبیاں بیان کرنے کا موقع نہیں، لیکن یہ ضرور کہنا پڑتا ہے کہ یہاں اوپر کے دانتوں سے نیچے کا ہونٹ دبانے کی درد بھری ادا نہیں، بلکہ ایک ایسا ذہن کام کر رہا ہے جو سختی ایام اور آلام ایام میں تپ اور چل کر کچھ کلبی، کچھ برہم اور کچھ محزوں ہے۔ اس کی توقعات کا افق نیچا ہے لیکن اس کے مزاج کی ٹیڑھ کم نہیں ہوئی ہے۔ ایسا شاعر میر اور عرفی کی محفل میں بیٹھنے کے لائق ہے اور جس طرح سے مصحفی اپنے وقت کی ادبی اور لسانی صورت حال سے پوری طرح باخبری کا ثبوت دیتے ہیں، اسی طرح وہ سیاسی ہوشمندی کا بھی ثبوت دیتے ہیں۔ وہ رسمی قسم کے شہر آشوب نگار نہیں ہیں جن کے شہر آشوب

پڑھ کر ہمارے مورخین ادب کو بڑا اطمینان محسوس ہوتا ہے کہ اٹھارویں صدی بڑے زوال وانتشار کی صدی تھی اور ایسے میں تو انگریز کو حاوی ہی ہونا تھا۔ ان کے برخلاف انگریز کا استیلا مصحفی کو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ وہ انگریزوں کی فتح میں ہندستان کا زوال دیکھتے ہیں، ہندستان کے زوال کو انگریزی عملداری کے قیام کا جواز نہیں قرار دیتے:

توڑ جوڑ آوے ہے کیا خوب نصاریٰ کے تئیں
فوج دشمن کے وہیں لیتے ہیں سردار کو توڑ

چرخ صندوقچہ فرنگ کا ہے
آنکھیں کرتی ہیں سیر تصویرات

مصحفی میرے صنادید کی مت پوچھ کہ وہ
طعمۂ خاک ہوئے منصب و جاگیر سمیت

مالک الملک ناصری ہوئے کلکتے میں
یہ تو نکلی عجب اک وضع کے جنجال کی کھال [25]

اب کچھ شعر خوش طبعی اور ظرافت کے سن لیں، کہ مولانا محمد حسین آزاد کے خیال میں مصحفی کا امروہہ پن اس میدان میں انھیں کچھ کرنے نہیں دیتا:

کھلتا ہے قفل عیش مرا اس سے مصحفی
جس کے ازار بند میں چھوٹی کلید ہے

زلفوں کی راستی میں کجی کس طرح سے آئے
دونوں کے درمیاں میں کلام مجید ہے

دل میں مرے جو یار کی الفت گئی ہے بیٹھ
سر کو پکڑ کے اپنے محبت گئی ہے بیٹھ

داد و دہش سے اب کے امیروں کی بوجھ ہے
ہمت گئی ہے اٹھ تو مروت گئی ہے بیٹھ

اے مصحفی احوال عدم یوں نہیں کھلتا
گو ہاتھ میں میرے وہ کمر آئے تو کہیے

خال و خط دیکھ کے بگڑا جو مزاج عاشق
پتی اچھلی کبھی اس کی کبھی سودا اچھلا[26]

ان سب اشعار میں نری خوش طبعی نہیں، معنوی نکات بھی ہیں۔ لیکن یہاں تفصیل کا موقع نہیں۔ اب چند شعران کے بالکل برعکس سن لیجیے کہ ان میں عقل، تجربہ اور فکر اور فکر نے گھل مل کر ایک اور طرح کے سبک ہندی کی شاعری کا اعلیٰ معیار قائم کر دیا ہے اور دوسری بات یہ کہ اردو فارسی میں کم ہی ایسا ہوا ہے کہ معاشرے یا کائنات کے نظم ونسق پر ایسی تلخ یا گمبھیر رائے زنی کی گئی ہو:

صحرائے محبت سے اٹھا تھا جو بگولا
اس خاک کی ہے شان ظلوماً و جہولاً

بیم جاں سے اس کو جو کوئی اٹھاتا ہی نہیں
تیرے کشتے کا پڑا جلتا ہے لاشہ دھوپ میں

تا دیر و کعبہ سیر کیا آگے دیکھیے
کیا کیا فریب دیدۂ صورت پرست کھائے

گر رہوں شہر میں ہو دود کے باعث خفقاں
جاؤں صحرا کو تو دم گرد بیاباں رو کے

شریف کعبہ سے لے تا فقیہ دانشمند
رکھے ہے دل میں ہر اک چاہ خوبصورت کی

لوح و قلم و کرسی و عرش اور یہ افلاک
اونچے ہیں پہ ہیں قوت ادراک کے نیچے

تل برابر ہو جو اخگر تو جہاں دیوے پھونک
چاہ تھوڑی بھی اگر ہو تو نہیں تھوڑی سی

کیسا جواب نامہ کہ ظالم کے پاس سے
قاصد کا جیتے پھرنا ہی خط کی رسید ہے [27]

مصحفی کا دیوان ہشتم مجموعی حیثیت سے خیال بندی کی شاعری پر مبنی ہے۔ جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا، اپنے آخری زمانے میں انھوں نے بالارادہ یہ طرز اختیار کیا تھا۔ لیکن ان کے تخیل اور فکر کی بیباکی، روایتی مضامین سے اجتناب، نئے (خاص کر دیسی) الفاظ کی تلاش اور معاصر دنیا کا شعور اسے ان کی عام خیال بند شاعری سے ممتاز کر دیتے ہیں۔ ان باتوں کی موجودگی میں صاحب طرز ہونا یا نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

حواشی:

1۔ مصحفی کے کلیات کی اشاعتوں کی تفصیل حسب ذیل ہے:

کلیاتِ مصحفی، جلد اول و دوم، مرتبہ نور الحسن نقوی، مجلس اشاعت ادب، دہلی 1967

کلیاتِ مصحفی، دیوان سوم، چہارم، پنجم، مرتبہ حفیظ عباسی، مجلس اشاعت ادب، دہلی، 1969

کلیاتِ مصحفی، دیوان ششم، ہفتم، مرتبہ حفیظ عباسی، مجلس اشاعت ادب، دہلی، 1975

کلیاتِ مصحفی، دیوان اول، مرتبہ نور الحسن نقوی، مجلس ترقی ادب، لاہور، 1968

کلیاتِ مصحفی، دیوان دوم، مرتبہ نور الحسن نقوی، مجلس ترقی ادب، لاہور، 1969

کلیاتِ مصحفی، دیوان سوم، مرتبہ نور الحسن نقوی، مجلس ترقی ادب، لاہور، 1971

کلیاتِ مصحفی، دیوان چہارم، مرتبہ نور الحسن نقوی، مجلس ترقی ادب، لاہور، 1974

کلیاتِ مصحفی، دیوان پنجم، مرتبہ نور الحسن نقوی، مجلس ترقی ادب، لاہور، 1969

کلیاتِ مصحفی، دیوان ششم، مرتبہ نور الحسن نقوی، مجلس ترقی ادب، لاہور، 1994

کلیاتِ مصحفی، دیوان ہفتم، مرتبہ نور الحسن نقوی، مجلس ترقی ادب، لاہور، 1995

کلیاتِ مصحفی، دیوان ہشتم، مرتبہ نور الحسن نقوی، مجلس ترقی ادب، لاہور، 1994

کلیاتِ مصحفی، دیوان نہم، دیوان قصائد، مرتبہ نور الحسن نقوی، مجلس ترقی ادب، لاہور، 1999

کلیاتِ مصحفی، دیوان ہشتم، مرتب عابد رضا بیدار، خدا بخش لائبریری، پٹنہ 1999

2۔ محمد حسین آزاد، ''آب حیات'' عثمانیہ بک ڈپو کلکتہ، 1967، ص: 373

3۔ علامہ شبلی نعمانی، ''شعر العجم'' جلد سوم، معارف پریس، اعظم گڑھ، 1956، ص: 24-17

4۔ خلیق انجم، ''غالب کے خطوط'' جلد دوم، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 1985، مکتوب مورخہ جولائی، 1863، ص: 614-613

5۔ میر تقی میر، ''نکات الشعرا''، مرتبہ محمود الٰہی، ادارۂ تصنیف، دہلی، 1972، ص: 1

6۔ کشن چند اخلاص، ''ہمیشہ بہار'' تدوین وحید قریشی، انجمن ترقی اردو، کراچی، 1973، ص:3-1 (متن کتاب)

7۔ ''نکات الشعرا''، ص:164-163

8۔ امیر یمین الدین خسرو، ''دیباچۂ غرۃ الکمال''، تدوین از وزیر الحسن عابدی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، لاہور، 1975، ص:35

9۔ امیر یمین الدین خسرو، ''دیباچۂ غرۃ الکمال''، ص:36

10۔ امیر یمین الدین خسرو، ''دیباچۂ غرۃ الکمال''، ص:41-38

11۔ مولانا محمد حسین آزاد، ''آب حیات''، ص:374

12۔ مولانا محمد حسین آزاد، ''آب حیات''، ص:376-375

13۔ فراق گورکھپوری، ''مقدمہ''، مشمولہ ''کلیات مصحفی''، جلد اول، تدوین نثار احمد فاروقی، قومی کونسل برائے فروغ اردو، 2003، ص:23۔ فراق صاحب کا یہ مشہور مضمون سب سے پہلے ''نگار'' کے مصحفی نمبر (1939) میں چھپا تھا۔ یہاں اس کے سارے حوالے ''کلیات مصحفی'' محولہ بالا پر مبنی ہے۔

14۔ فراق گورکھپوری، ص:16

15۔ فراق گورکھپوری، ص:16

16۔ فراق گورکھپوری، ص:22

17۔ فراق گورکھپوری، ص:25-24

18۔ دیوان مصحفی، رامپور، 1878

19۔ ''دیوان مصحفی''، مع دیباچہ مولانا عبدالسلام خاں، پٹنہ، خدا بخش لائبریری، 1990

20۔ مصحفی ''کلیات''، جلد اول، مرتبہ نور الحسن نقوی، ص:91

21۔ قائم چاندپوری، ''کلیات''، جلد اول، مرتبہ اقتدا حسن، لاہور، مجلس ترقی ادب، 1965، ص:215

22۔ ''کلیات میر''، جلد اول، دیوان سوم، غزل نمبر 1056، ص:575 (قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان) دوسرا ایڈیشن 2003

23۔ مصحفی، دیوان ہشتم، مرتب عابد رضا بیدار، خدا بخش لائبریری، پٹنہ 1995، ص:52

24۔ مصحفی، دیوان ہشتم، ص:5-6

25۔ مصحفی، دیوان ہشتم، ص ص:38 ,26 ,24 ,23

26۔ مصحفی، دیوان ہشتم، ص ص:78 ,77 ,70 ,55 ,19

27۔ مصحفی، دیوان ہشتم، ص ص:77 ,76 ,70 ,60 ,56 ,40 ,5

(غزلیات)

الف

1

مرا خاموش رہنا وقتِ پیری گرچہ بہتر تھا — ولیکن لاکھ معنی کا گلا مذبوحِ خنجر تھا
میں ان ظلمت نشینوں میں رہا ہوں زندہ اک باقی — کہ جن کے گھر کا ادنیٰ تابداں خورشیدِ محشر تھا
پس از مردن جلایا آگ میں یا خاک کو سونپا — غرض ہر طرح اپنا محو ہو جانا مقدر تھا
لحد میں جا کے خاک آرام سے سوتا ترا کشتہ — کہ واں جز خاکِ نم دیدہ نہ بالیں تھا نہ بستر تھا
شبِ ہجراں کی تاریکی میں کیوں کر مجھ کو نیند آتی — کہ جو جگنو چمکتا تھا وہ اک سوزندہ اخگر تھا
جو جھانکا اس کو باہر سے مزاریں ہی نظر آئیں — مگر چرخِ مکوکب[1] قطب صاحب کا حجر تھا
بزورِ بادہ میں ہی ور[2] رہا ورنہ مرے حق میں — عمامہ شیخ کا شملے سے اک دُمدار[3] اختر تھا
میں اس صیدی کے بیٹھا سایۂ دیوار میں جب تک — خدنگ افگن رہا مجھ پر ہی جو بالِ کبوتر تھا
جدائی میں جو صد چنداں ہوئی تھی دل کی بیتابی — تو یکسر سطح سینے کا مرے دامِ کبوتر تھا
گدازِ دل سے ہو جاتا ہے حاصل رتبۂ عالی — حقیقت کانچ کی پوچھو تو پہلے یہ بھی پتھر تھا
مجھے ریگِ رواں نے چاندنی میں سیر دکھلائی — کہ نظروں کے تلے پارے کا اک دریائے مضطر تھا
مزاروں میں ہیں یار افتادہ اپنے اس لیے ہر سو — کہ دورِ آسماں ان بے خودوں کو دورِ ساغر تھا

1۔ چرخِ مکوکب: تاروں بھرا آسمان — 2۔ ور رہنا: غالب رہنا (سنسکرت: ور = بالا، بہتر)

3۔ دمدار اختر: دم دار ستارہ، نحوست کی علامت

ہنوز اے مصحفی اس میں ہے اک حسنِ نمک باقی
عروسِ فکر کا عہدِ جوانی گرچہ زیور تھا

2

اے نالہ! بس دماغ پریشاں نہ کر مرا | وے دستِ شوق! چاک گریباں نہ کر مرا
ناموسِ عشق دے کفنِ گردِ دشت ہی | یوں روزیِ لحد تنِ عریاں نہ کر مرا
دکھلا نہ روے صبحِ وطن خواب میں ابھی | قصّہ تمام شامِ غریباں نہ کر مرا
جانے کا نام لے نہ شبِ وصل میں میاں | تو جائے گا تو دل تو پریشاں نہ کر مرا
اے شورشِ جنوں ابھی ایامِ دے[1] ہیں دور | سنسان فصلِ گل میں تو زنداں نہ کر مرا
کرنی ہے اس سے مجھ کو رہِ کوے یار طے | تلوا فگار خارِ مغیلاں نہ کر مرا
چپ ہی بھلی ہے اس میں بھی رسوا تو ہوئے گا | شکوہ کسی سے، اے دلِ ناداں نہ کر مرا
جالی کی ڈال اپنے نہ منھ پر نقابِ سرخ | ناحق کو خون، اے مہِ تاباں نہ کر مرا
مل جائے وہ تو اپنے مسیحا سے یوں کہوں | ظالم! دیا ہے درد تو درماں نہ کر مرا
اے بوریاے فقر جو ہے تجھ میں منزلت | ہرگز مقام مسندِ شاہاں نہ کر مرا

کرنے دے اپنے طور پر یک چند زندگی
اے مصحفی خیال تو چنداں نہ کر مرا

3

ہوا نہیں میں کچھ آج شیدا کسی کے رخسارِ نازنیں کا
کہ عہدِ طفلی سے آئے ہے خوش نظارہ مجھ کو رخِ حسیں کا
مری طرف سے وہ اپنے دل میں خیال لائیں نہ بغض وکیں کا
جو یار میرے یہ بات سمجھیں میں رہنے والا ہوں کس زمیں کا

1۔ دے: ایرانی مہینے کا نام جس میں خزاں رہتی ہے۔

بصد جلاوت[1] لکھا ہے جب سے انھوں نے نقشا ترے لبوں کا
جگر عذوبت[2] میں غوطہ زن ہے ورق طرازانِ نقشِ چیں کا

صبا میانجی[3] اگر نہ ہووے تو گوش میں گل کے بے تکلف
کہے پھر احوال کون جا کر شکستہ بالِ قفس نشیں کا

شبِ سیہ میں بتاؤ یارو! بھلا مجھے نیند کیوں کہ آوے
کہ سانپ چھاتی پہ پھر رہا ہے کسی کے گیسوے عنبریں کا

بہ یادِ صبحِ گلوے ساقی کبھی جو رونے پر آ گئے ہم
تو ہر قدم پر ستارہ افشاں کھلاویں گے پھول یاسمیں کا

میں بزم ہستی میں، اے عزیزو! چراغ تصویر کی ہوں صورت
نہ مجھ کو صرصر کی کچھ ہے پروا، نہ غم ہے ہرگز کچھ آستیں کا

ہزار کاسے سروں کے دیکھے کھلا کسی کا نہ بھید ہم پر
کہ پڑھنے والا ہوا نہ پیدا کسی کے کوئی خطِ جبیں کا

میں جب سے آیا ہوں لکھنؤ میں گیا ہوں دلّی کا بھول نقشا
مگر تصور میں اپنے عالم ہے پیش دیدہ[4] کہیں کہیں کا

میں مصحفی سوے بزمِ امکاں عدم سے آ کر ہوا پشیماں
جو ساتھ اچھا سا مل گیا تو ارادہ میرا ہے پھر وہیں کا

4

کب درد کی میں اپنے تدبیر نہیں کرتا — نسخہ ہی کوئی اس کو تاثیر نہیں کرتا
دیوانۂ وحشت ہوں، سوداے الفت ہوں — مجنوں کو کوئی مجھ سے زنجیر نہیں کرتا
گر آہ کو دعویٰ ہے افلاک پہ جانے کا — نالہ بھی تعرّج[5] میں تقصیر نہیں کرتا

1۔ جلاوت: کمال ہوشیاری 2۔ عذوبت: لذت، خوش مزگی 3۔ میانجی: درمیان میں، مراد وسیلہ
4۔ پیش دیدہ: ۔ پہلے دیکھا ہوا 5۔ تعرّج: عروج؟ (لغات کشوری میں اس کے معنی ''لنگڑا'' دیے ہیں)

ڈرتا ہے نہ گھر جاوے فوجِ صفِ مژگاں میں
نقاش رقم ان کی تصویر نہیں کرتا

صیدِ دلِ عاشق پر کب اس نے نظر پھینکی
جو طائرِ سدرہ کو نخچیر نہیں کرتا

کچھ بھید بھی اس میں ہے، بے پیچ[1] مرا صانع
اس خاک کے پُتلے کی تعمیر نہیں کرتا

کرتی ہے جو ہیبت سے قاصد کی زباں لکنت
کچھ حال وہاں میرا تقریر نہیں کرتا

جاتا ہوں عدم کو میں کیوں بے طلب یاراں
نامہ تو کوئی واں سے تحریر نہیں کرتا

اے مصحفی اتنی بھی یہ بحر نہیں بے رچ[2]
کیوں تو غزلِ ثانی تحریر نہیں کرتا

5

کیوں شورِ جنوں تُو کچھ تدبیر نہیں کرتا
پانو سے جدا میری زنجیر نہیں کرتا

مشاطگی اپنی میں مصروف ہے آئینہ
ہم خانہ خرابوں کی تعمیر نہیں کرتا

صحرائے محبت میں وہ صیدِ زبوں ہوں میں
جس کو کوئی بھولے سے نخچیر نہیں کرتا

مجنوں کو کیا لیلیٰ رسوائے جہاں تو نے
عاشق کو کوئی اپنے تشہیر نہیں کرتا

کیا مجلسِ رنداں میں پھر جا کے کرے زاہد
اس کی کوئی واں مطلق توقیر نہیں کرتا

ہر چند کہ سو بسمل تڑپیں ہیں پڑے خوں میں
تو بھی وہ نیام اپنی شمشیر نہیں کرتا

عاشق کے جنازے کے دو گام چلے ہمراہ
اتنی بھی مروت وہ بے پیر نہیں کرتا

دیکھے سے جسے مردہ جی اٹھے تو اے مانی
کیوں میرے مقابل وہ تصویر نہیں کرتا

کیا لکھنؤ میں ناداں تھا نال گڑا تیرا
کیوں مصحفی تو یاں سے شب گیر[3] نہیں کرتا

6

صاف چولی سے عیاں ہے بدنِ سرخ ترا
نہیں چھپتا تہِ شبنم چمنِ سرخ ترا

1۔ بے پیچ: بے مقصد، فضول 2۔ بے رچ: بے کیف (رچ = رغبت، مزہ)

3۔ شب گیر کرنا: آدھی رات گزر جانے کے بعد کوچ کرنا

یہ ہی عالم ہے اگر اس کا تو دکھلاوے گا بارشِ خوں کا سماں پیرہنِ سرخ ترا
وائے ناکامی کہ عاشق کو ترے موت آئی قابلِ بوسہ ہوا جب دہنِ سرخ ترا
تا کمر خون شہیدوں کے بہے گلیوں میں جب سے پاجامہ بنا گل بدنِ[1] سرخ ترا
خوں سے آلودہ ہو آتا ہے تو اے اشک سپید نام ہم کیوں نہ رکھیں یاسمنِ سرخ ترا
آتشِ تیز میں ٹھہرا ہے کہیں یوں بھی سپند کہہ رہا ہے یہی خالِ ذقنِ سرخ ترا
مصحفی خوش ہو کہ مانگے گا ترے قاتل سے
خوں بہا روزِ قیامت کفنِ سرخ ترا

7

کیسہ مالی[2] سے ہوا گل بدنِ سرخ ترا طالب آب نہ ہو کیوں چمنِ سرخ ترا
یہ ہی پوشاک کا ہے رنگ تو اے گل ہوگا تشنہ خوں چمن پیرہنِ سرخ ترا
کیوں نہ ہو مردہ ہوس زندہ، بنے جب اے شوخ پان سے بیربہٹی دہنِ سرخ ترا
مجھ سے انکارِ ستم فائدہ، اے گرگِ فلک دال[3] ہے بچہ خوری پر دہنِ سرخ ترا
کاش اے کشتے تو محشر میں اٹھے ہو کے فقیر گیروا مٹی میں ہووے کفنِ سرخ ترا
لبِ پاں خوردہ کی اس گل کے جو سرخی دیکھے رنگ اڑ جائے گا اے نارونِ[4] سرخ ترا
سر پہ تابش میں تو رکھے تو دلِ عاشق میں آگ بھڑکائے نہ کیوں بادزنِ[5] سرخ ترا
مصحفی چاہیے کیا اس کو دلیلِ قاطع
سبز ہے خود بہ تخلص سخنِ سرخ ترا

8

اک تو تھا آتشِ سوزاں بدنِ سرخ ترا شعلہ بر شعلہ ہوا پیرہنِ سرخ ترا
پان کھانے کی ادا یہ ہے تو اک عالم کو خوں رلاوے گا، مری جاں، دہنِ سرخ ترا

1۔ گل بدن: ریشمی کپڑے کی ایک قسم 2۔ کیسہ مالی: حمام میں جسم کی مالش 3۔ دال: دلیل
4۔ نارون: گل انار (انار کا وہ پودا جس میں پھل نہیں، صرف پھول آتے ہیں) 5۔ بادزن: پنکھا

کوئی خورشیدِ شفق رنگ کو دیتا ہے فشار　　پنجۂ رشک سے سیبِ ذقنِ سرخ ترا
شمعِ گلگوں، غمِ پروانہ میں خوں اتنا نہ رو　　طشت آتش تو بنا ہے لگنِ سرخ ترا
سرخ عیار[1] سے تو کم نہیں، اے دزدِ حنا[2]　　کف رنگین بتاں ہے وطنِ سرخ ترا
یوں ہی اے کشتہ جو آیا تو صفِ محشر میں　　آگ دیوے گا لگا واں کفن سرخ ترا
تو اگر نافۂ آہو ہے تو اے عقدۂ زلف　　ہے وہ رخسارۂ رنگیں ختنِ سرخ ترا
اس کے موباف سے شانہ یہی شب پوچھتا تھا　　دام شب رنگ ہے کیوں اے رسنِ سرخ ترا
ہر پری چہرہ ہے پوشیدہ لباسِ گلگوں　　میں تو دیوانہ ہوں اے انجمنِ سرخ ترا

مصحفی زخم ہے پتھر کا ترے ہر مُو پر
نام ہم کیوں نہ رکھیں کوہ کنِ سرخ ترا

9

رنگِ پاں سے جو ہوا گل دہنِ سرخ ترا　　مر گئی دیکھ کے بلبل دہنِ سرخ ترا
پان کھا کر جو مسی زیب کیے تو نے وہ لب　　بن گیا مزرعِ سنبل دہنِ سرخ ترا
سرخ تو تھا ہی ولے اور ہوا گلناری　　پی کے، اے گل، قدِ مُل دہنِ سرخ ترا
تب ہو عاشق کی شبِ وصل تسلی، اے گل　　مصرفِ بوسہ ہو جب کُل دہنِ سرخ ترا
غنچہ ساں وا نہ ہوا عالمِ مے نوشی میں　　سُن کے شیشے کی بھی قلقل دہنِ سرخ ترا
شانہ کرتے جو سرِ جعد[3] تو دانتوں میں رکھے　　ہو نہ خونخوارۂ کاکل دہنِ سرخ ترا
رخِ مرّیخ پہ چھُٹتی ہے ہوائی اب تک　　کہیں دیکھا تھا سرِ پل دہنِ سرخ ترا

مصحفی تو نے زبس گل کے لیے ہیں بوسے
رشک سے دیکھے ہے بلبل دہنِ سرخ ترا

1۔ سرخ عیار: بے حد فریبی (لغت میں 'سرخ' کے معنی سخت اور بہت دیے ہیں۔ یہاں مہندی کی رعایت سے سرخ بھی مراد ہے۔ 2۔ دزدِ حنا: مہندی کا چور یعنی وہ جگہ جو مہندی لگنے سے رہ جائے۔ اسے مہندی میں چور لگنا کہتے ہیں۔
3۔ جعد: چوٹی

10

گلوں[1] سے دونوں پہنچے میرے دو طاؤس ہیں گویا — شرارِ آہِ سوزاں شمع، یہ فانوس ہیں گویا
مسی آلودہ وہ لب گردنِ طاؤس ہیں گویا — نہیں پیتے جو مے خوں سے مرے مانوس ہیں گویا
بنی آدم کی زیرِ آسماں ثابت ہے مجبوری — قفس میں پر شکستہ کتنے یہ محبوس ہیں گویا
دماغِ سلطنت رکھتے ہیں خاکسترنشینی پر — بمعنی ہم جلیسِ تختِ کیکاؤس ہیں گویا
عیاں ہوتا ہے یہ خالِ جبیں وروے رنگیں سے — وہ زنگی بادشاہ ملکِ روم و روس ہیں گویا
بیاں ہو کیوں کہ مجھ سے مدح فخرالدین احمد خاں — لغت داں ایسے خود انشا گرِ قاموس ہیں گویا
مجسطی[2] رس نہیں اے مصحفی ان سا کوئی ہرگز
یہ اپنے عہد میں ہمتاے بطلیموس ہیں گویا

11

جو گستاخانہ کچھ اس سے میں بولا — تو بس ابرو نے تیغا ووں ہی تولا
چنے عاشق نہ کیوں اس کے ممولے — کہ چشمِ شوخ ہے اس کی ممولا
جزاک اللہ بنایا تو نے صیّاد — قفس میں از پئے بلبل ہنڈولا
نہ مارے دست و پا تا اس کا بسمل — الٰہی مار جاوے اس کو جھولا[3]
لب اس گل کے ہیں جامِ بادۂ گل — مسوں نے ان میں آکر زہر گھولا
یہ وہ گلشن ہے جس میں غم کے مارے — تبسم سے کلی نے منھ نہ کھولا
مری پتلی نے اشکِ خیرہ سر کو — بنایا ہے ہتھیلی کا پھپھولا
کہیں ملتے ہیں ایسے مصحفی یار
نہ آوے دل کے جانے کا ملولا[4]

1۔ گل بمعنی داغ 2۔ مجسطی (ریاضی کی ایک کتاب)، مجسطی رس = اس کتاب کو سمجھنے والا۔
3۔ جھولا: فالج 4۔ ملولا: غم

12

پان و مسی سے لب پہ ترے عرصہ تنگ تھا
خوں رو رہا تھا وہ تو کبود اس کا رنگ تھا

اس دشت میں نہ خضر قدم اپنا رکھ سکا
پائے جنوں کے سامنے جو اک شلنگ[1] تھا

پہلو سے مثلِ بادِ بہاری نکل گیا
یارب یہ شستِ صاف کا کس کے خدنگ تھا

ڈرتا ہوا میں دشتِ طلب میں گیا کہ واں
ہر ہر قدم پہ بیشۂ شیر و پلنگ تھا

ہم تب گئے چمن میں کہ جب ہو چکی بہار
قسمت میں اپنی موسمِ پرواز رنگ تھا

کل دیکھتے ہی اس کے مرا دم نکل گیا
رفتارِ کبک میں ترے چلنے کا ڈھنگ تھا

سرگشتگی کو دیکھ مری مشتِ خاک کی
ہر گرد باد وادیِ مجنوں میں دنگ تھا

خشکی میں یاں جنھوں نے تری کا سفر کیا
ان کو دہانِ گور ہی کامِ نہنگ تھا

رحمت کہے[2] تھی دیکھ مجھے خلق مصحفی
کوچے میں اس کے مجھ پہ جو بارانِ سنگ تھا

13

ذبح کے دم اس کو جو نخچیر منھ تکتا رہا
رکھ گلے پر شوخ بھی شمشیر منھ تکتا رہا

جوشِ وحشت میں جو لی زنداں سے میں صحرا کی راہ
دیدۂ ہر حلقۂ زنجیر منھ تکتا رہا

مدرسے میں آکے اس ہیئت سے اس نے بحث کی
منطقی جس کا دمِ تقریر منھ تکتا رہا

جب مرا نقشا بنایا، خطِ پیشانی کو دیکھ
ہو کے ششدر کاتبِ تقدیر منھ تکتا رہا

نامہ بر کا دیر تک چشمِ تحیر سے وہ شوخ
پڑھ کے نامے کی مرے تحریر منھ تکتا رہا

ایک کی جانب نہ دیکھا اس بتِ مغرور نے
اور اس کا ہر جوان و پیر منھ تکتا رہا

اس شبیہِ حسن کے بوسے میں نظروں میں لیے
آئنہ جوں صورتِ تصویر منھ تکتا رہا

تو گئی واں جس جگہ ہرگز نہ پڑتا تھا گماں
میں ترا، اے آہِ بے تاثیر، منھ تکتا رہا

1۔ شلنگ: زقند، چھلانگ 2۔ رحمت کہنا: آفریں کہنا؟

مصحفی کے شوخ نے بڑھ بڑھ کے تلواریں جڑیں
ہو کے حیراں اور وہ بے تقصیر منھ تکتا رہا

14

یاس و حسرت کا تو لاشے پہ مرے غل ہوتا کاش میں کشتۂ شمشیر تغافل ہوتا
آرزو تھی کہ جو مرتا تو مری تربت پر دودِ آہِ جگرِ سوختہ سنبل ہوتا
مجھ سا غمناک جو مے پینے کو آتا، ساقی! حلق مینا میں گرہ نالۂ قلقل ہوتا
گر دکھاتا یہ ترا رنگِ حنا اپنی بہار سطحۂ خاک پہ ہر نقشِ قدم گل ہوتا
دیکھتا گر وہ مری نالہ کشی کا عالم باغ میں زمزمہ پرداز نہ بلبل ہوتا
ہاتھ اٹھاتا نہ اسیری سے مرا دل اے کاش زلف سے چھوٹتے ہی بستۂ کاکل ہوتا
پا سلاسل میں نہ رکھتا دلِ دیوانہ ترا تیری زلفوں سے اگر اس کو توسل ہوتا
وادیِ عشق میں رکھتا جو قدم میں تو مرا نالہ زادِ سفرِ راہِ توکل ہوتا
تیری تصویر ہی مانی نے نہ کھینچی ورنہ اس کو ہر مُو میں تامل سا تامل ہوتا

اس کے رخسار سے پردہ جو کبھی اٹھ جاتا
مصحفی مجھ سے نہ پھر صبر و تحمل ہوتا

15

دستِ بسمل میں اگر دامنِ قاتل ہوتا کتنا خوش ذبح کے دم جی میں وہ بسمل ہوتا
جذبۂ عشق نے کی سخت کمی ورنہ مدام جانبِ وادیِ مجنوں رخِ محمل ہوتا
اس کے مشتاق جھجک کر کے نہ یوں رہ جاتے وہ رخِ سادہ اگر بوسے کے قابل ہوتا
وا دریغا مری آنکھوں سے گرے اشکِ سفید لطف تب تھا کہ ذرا خون بھی شامل ہوتا
تو نے رُو دے کے کیا مرتبہ افزوں اس کا آئنہ ورنہ ترے رخ کے مقابل ہوتا
وہ نہانے کو نہ آیا یہ بڑی خیر ہوئی ورنہ اک شور قیامت سرِ ساحل ہوتا

اس خرابے میں تو میں آ کے نہ ہوتا پابند خطِ تقدیر مرا گر خطِ باطل ہوتا
جی جلایا مرا ہمسائگیِ یار نے اور آہ گر پردۂ دیوار نہ حائل ہوتا
اپنے چہرے سے وہ محشر میں اٹھاتا جو نقاب دعویِ خونِ شہیداں وونہی[1] باطل ہوتا
قوتِ بازوے قاتل جو نہ کرتی تو مدد جان دینا تہِ خنجر مجھے مشکل ہوتا
تیرا زخمی جو کبھی باغ کی جانب جاتا سر پر اس کے وونہی انبوہِ عنادل ہوتا
خاطر اس زلفِ پریشاں کی مجھے تھی ورنہ
مصحفی میں تو نہ پابندِ سلاسل ہوتا

16

کیوں نہ اس چشم کو سمجھے دلِ بیمار دوا سنتے آتے ہیں کہ بے چشم خریدار دوا
نسخہ سقراط سے کیا اس کے لیے لکھواؤں مرض الموت کی رکھتا نہیں عطار دوا
میں نے صحراے محبت میں نہ دیکھی ہرگز المِ آبلۂ پا کی بجز خار دوا
سرمۂ خاک درِ یار سوا تو ہی بتا کیا کروں تیری میں اے دیدۂ خونبار دوا
کچھ تو انجام انھیں اس کا نظر آتا ہے تیرے بیمار کی کرتے نہیں جو یار دوا
قہر ہے مرہمِ کافور لگانا اس پر جس کہن داغ کی ہو مرہم زنگار دوا
خنکی دل کو تو تری لگتے ہی چھاتی کے ہوئی مل گئی سینۂ سوزاں کی شبِ تار دوا
حیف ہے ان کی قفس میں تو رکھے ہے صیاد جن اسیروں کی ہو سیرِ گل و گلزار دوا
یہ مرض وہ ہے کہ چنگا[2] نہ فلاطوں سے ہوا
کیا غمِ دل کی کرے مصحفیِ زار دوا

17

غم خوار مرا دل بھی تو اصلا نہیں ہوتا بے بال و پری میں کوئی اپنا نہیں ہوتا
مارا ہے جسے جنبشِ لب نے تری کافر وہ زندہ بہ اعجازِ مسیحا نہیں ہوتا

1۔ اصل: وہیں (ہر جگہ حسبِ ضرورت ووں ہی یا وونہی کر دیا گیا) 2۔ چنگا: اچھا

کس واسطے جیتا ہے تو فرقت میں بتوں کی — کیا تجھ کو دلا، زہر بھی پیدا نہیں ہوتا
کیا ہجر کی شب ہی کو مری موت لکھی تھی — جو آج کی شب صبح کا تڑکا نہیں ہوتا
برقع کوئی تم اور پُر آشوب بناؤ — چادر میں نہاں حسن تمھارا نہیں ہوتا
حیراں ہوں دوا کرتے ہیں کیوں اس کی اطباء — بیمارِ تپِ عشق تو چنگا نہیں ہوتا
اعجاز کیا ہے خطِ رخسار نے تیرے — قرآں کا کبھی حوض محشّا[1] نہیں ہوتا
بیتابی و فریاد و فغاں، نالہ و زاری — عاشق سے شبِ ہجر میں کیا کیا نہیں ہوتا
ہستی سے اُدھر کو ہیں عبث قافلے جاتے — آباد عدم کا بھی تو صحرا نہیں ہوتا

اے مصحفی امید بر آوے مری کیوں کر
مقتل کی طرف اس کا گزارا نہیں ہوتا

18

بہ سوے قبلہ، دلا! گر کبھو میں سجدہ کیا — قبول ہو کہ نہ ہو بے وضو میں سجدہ کیا
کہیں ہیں اس کو عبادت کہ پاے قاتل پر — بہ زیرِ تیغ جب آیا گلو میں سجدہ کیا
حبش میں بھی نہ رہا مجھ سے تو نہاں اے حسن — وہاں بھی کر کے تری جستجو میں سجدہ کیا
ہوا دوچار جو قاتل کی تیغِ ابرو سے — مُصلّیانہ بہ صد آرزو میں سجدہ کیا
جب اختلافِ مذاہب کا اُٹھ گیا کھٹکا — گیا جو کعبے میں واں چارسُو میں سجدہ کیا
گرا جو لغزشِ مستی میں یہ مزہ پایا — کہ پاے خُم پہ بہ رنگ سبو میں سجدہ کیا
خدا کے واسطے، اے کعبۂ مراد نہ روٹھ — ہزار بار ترے روبرو میں سجدہ کیا

نہیں میں پنبہ دہن مصحفی بگاہِ نماز
کہ مسجدوں میں بصد ہاے وہو میں سجدہ کیا

19

صدمے سو دل پہ ہوئے ہم نے نہ جانا کیا تھا — واہ رے ضبط وہ چاہت کا زمانا کیا تھا

1۔ محشّا: جس پر حواشی لکھے ہوں

سامنے آکے مرے منہ کو چھپانا کیا تھا　میں تو جلتا تھا مجھے اور جلانا کیا تھا
میں نے مانا کہ مصمم تھا تجھے عزمِ سفر　کہہ کے یہ بات مرے جی کو کڑھانا کیا تھا
یہ تو جانے تھا کہ پھر چاک کرے گا یہ اسے　پھر گریباں مرا ناصح کو سلانا کیا تھا
قیس واماندہ رہا تجھ سے تو کوسوں پیچھے　آگے اے ناقہ، قدم جلد اٹھانا کیا تھا
وحشت و عشق و جنوں کی ہوئی اور سرسائی[1]　تجھ کو بن ٹھن کے مرے سامنے آنا کیا تھا
کر گئی یار کی دزدیدہ نظر کام اپنا　اس ادا سے کہ کسی نے بھی نہ جانا کیا تھا
عمر گھٹتی جو مری اس کا نہ تھا اندیشہ　اے فلک وصل کی شب تجھ کو گھٹانا کیا تھا
مصحفی گر ترے کہنے میں نہ تھا یار ترا
ایسے ہرجائی سے پھر دل کا لگانا کیا تھا

20

گھٹا چھائی ہوا طوفاں اندھیرا　گھر اور باہر ہو یکساں اندھیرا
لبِ جاناں پہ مسّی کی دھڑی ہے　کہ گردِ چشمۂ حیواں اندھیرا
چھپانے سے ترے رخ کے ہوا ہے　مرا گھر، اے مہِ تاباں، اندھیرا
نہ گل ہووے کسی کی شمعِ اقبال　پڑا ہے خانۂ سلطاں اندھیرا
گلے سے میرے لگ جاوے مرا یار　کرے مجھ پر یہی احساں اندھیرا
چراغِ حسنِ یوسف جب ہو روشن　رہے پھر کس طرح زنداں اندھیرا
ہوئی گریے سے دُونی تیرہ بختی　فزوں ہو جوں شبِ باراں اندھیرا
نظر آتا نہیں ہے ہاتھ کو ہاتھ　قیامت ہے شبِ ہجراں اندھیرا
شبِ ہجراں کا شکوہ کیا کرے ہے　لحد میں ہوگا صد چنداں اندھیرا
پڑا ہے مصحفی اس شمع رُو بن
ہمارا کلبۂ احزاں اندھیرا

1۔ سرسائی: فروغ، کثرت

21

پیغام اجل نے جو دیا جاں شکنی کا　　کسریٰ کو رہا دھیان نہ ایواں شکنی کا
جلد آ کہ ہوا وقت مری جاں کنی کا　　یہ وقت تو ظالم نہیں پیماں شکنی کا
لوہے کے چنے تھے جو جوانی میں چباتے　　پیری کو ہے عزم ان کی بھی دنداں شکنی کا
یوں چشمِ خماریں کو نہ مل ہاتھ سے ظالم　　اندیشہ ہے مجھ کو تری مژگاں شکنی کا
کیوں تیر لگاتا ہے مرے سنگِ لحد پر　　اس شوخ کو کیا شوق ہے پیکاں شکنی کا
زخمِ دلِ عاشق پہ ارادہ تو کیا ہے　　اس لب کے تبسم نے نمکداں شکنی کا
صد ساغرِ دل ٹوٹے یہاں دستِ صبا سے　　غنچے کو ہے غم اپنی ہی فنجاں شکنی کا
مثلِ مہِ نو مائدہ[1] چرخ پہ اب تک　　خوگر ہی نہیں ہاتھ مرا ناں شکنی کا

اے مصحفی ہے ضبط کی دولت سے شبِ ہجر
دعویٰ لب خاموش کو افغاں[2] شکنی کا

22

عمرِ آخر بہ[3] ہوا داغ اس دلِ رنجور کا　　صبحِ پیری میں اثر تھا مرہم کافور کا
دل میں اس کے جا نہیں پاتا مرا اشکِ سفید　　شبہ ہے دُرِّ نجف پر یار کو بِلّور کا
گلشنِ امکاں ہے جائے انفعال اس واسطے　　سر نگوں رہتا ہے دیدہ نرگسِ مخمور کا
گردنِ انساں پہ بارِ عشق لا کر رکھ دیا　　آفریں اس کو کہ جو حامل ہے اس مزدور کا
سرخیِ رنگِ شفق سے اصفری[4] جاتی نہیں　　آسماں گویا ہے قارورہ کسی محرور[5] کا
چرخ جوں کھاتا رہا موسیٰ تجلی کے لیے　　میں بھی ہوں ویسا ہی پروانہ چراغِ طور کا
اہلِ دولت سے نہ پوچھو مفلسوں کا درد و رنج　　وصل والا حال کیا جانے کسی مہجور کا

1۔ مائدہ : دسترخوان　2۔ افغاں: فغاں　3۔ بہ: بہتر　4۔ اصفری :زردی
5۔ محرور : جسے حرارت (بخار) ہو

آں سوے ملکِ عدم تک ان کو پہنچانا مجھے پاے خفتہ اب تو کر بیٹھے ارادہ دور کا
دیکھ اس کے سادہ پن کو میں مواجاتا ہوں ہاے اس سے کیا کچھ بیشتر ہووے گا عالم حور کا
مصحفی اتنا بھی مت چرخِ مکوکب سے الجھ
چھیڑنا اچھا نہیں کچھ خانۂ زنبور کا

23

ہو نہیں جاتا ہوں عاشق ہر شرر کے نور کا ہوں میں موسیٰ کی طرح پروانہ شمعِ طور کا
جس سے پھر ہرگز نہ ہووے صبح کی مجھ کو امید منھ نہ دکھلانا الٰہی اس شبِ دیجور کا
چاندنی میں کر ٹک اس روے عرق افشاں کی سیر گر نہ دیکھا ہو برستا تو نے باراں نور کا
کر توسّل زر سے، گر ہو وادیِ ہجراں دراز ہنڈوی بن خط پہنچتا ہے بہت کم دور کا
اس ادا سے لیوے ہے تیغِ صفاہانی کا کام زیں پہ کج ہونا تو دیکھو اس بتِ مغرور کا
عشق کی تپ سے سراپا میں ہیں میرے آبلے آدمی دیکھا نہ ہوگا خوشۂ انگور کا
کم سنی میں حسن اس کا جس نے دیکھا یہ کہا دیکھنے میں آج آیا اپنے بچہ حور کا
جب سے دیکھا ہے ترے موے کمر کی لاگ کو گر گیا ہے آنکھ سے مُو چینیِ فغفور کا
پاس رہنا اس دلِ نالاں کا کچھ اچھا نہیں لطف دے ہے کان کو اکثر ترانہ دور کا
مصحفی اوروں سا کب ہے شاعرِ صورت پرست
اس کی آنکھوں میں ہے جلوہ معنیِ مستور کا

24

بیٹھے بیٹھے جو خیالِ رخِ دلدار بندھا چشمِ خونبار سے گریے کا وونہی تار بندھا
سامنے اس کے کہے بادِ صبا قصۂ گل گر ذرا منھ کو رکھے مرغِ گرفتار بندھا
واں کفِ پا کے لیے دزدِ حنا نے بوسے لال خاں لکڑی[1] سے ایدھر یہ گنہگار بندھا

1۔ لال خاں لکڑی یا لال خاں لکڑ: شکنجہ جس میں مجرم کو کسا جاتا ہے

کرے سرہنگ[1] کو غمزے کی اشارہ جو وہ چشم
تو ابھی آئے چلا مصر کا بازار بندھا

اے برہمن یہ ستم عاشق مسکیں پہ نہ کر
کمرِ نازکِ جاناں کو نہ زنّار بندھا

کہہ دو قاتل سے کہ کٹّی[2] سی کوئی لاوے تیغ
جیسے چورنگ[3] پڑا ہے یہ گنہگار بندھا

جلوۂ حسن یہ چاہے ہے کہ پنہاں میں نہ ہوں
پردہ چلمن کا رہے پیشِ درِ یار بندھا

برچھیاں لگتی ہیں اس پر جو الم کی ہر دم
سر کو رکھتا ہے ترے عشق کا بیمار بندھا

مجھ میں باقی نہیں کچھ جانے دے اے چشم اب تو
نہ مرے قتل پہ ہر دم کمرِ یار بندھا

ہو گیا عرصہ بہت تنگ گرفتاروں پر
جب سے چہرے میں ترا طرۂ طرار بندھا

یہ بھی عاشق کے کڑھانے کی نکالی ہے ادا
سرِ دست اپنا جو رکھتا ہے وہ عیار بندھا

خلل انداز رہی حسرتِ عاشق ورنہ
غیر سے عہدِ محبت تو کئی بار بندھا

مصحفی گو یہ غزل تو نے کہی خوب، اس میں
تجھ سے مضموں کوئی اچھا تو نہ زنہار بندھا

25

زیبندہ ہے شبنم کا گلِ تر کو پسینا
کرتا ہے مرصّع رخِ دلبر کو پسینا

نامے کی مجھے گرمیِ مضموں سے یہ ڈر ہے
آ جائے نہ اڑتے میں کبوتر کو پسینا

تو آتشِ دوزخ نہ سمجھ عشق کی آتش
اس آگ میں آتا ہے سمندر[4] کو پسینا

یاں کوہ پگھل جاتے ہیں کیا اس کا عجب ہے
آوے جو تپِ عشق سے پتھر کو پسینا

دوپہر ہے، گہنا نہ پہن ورنہ مری جاں
بے روپ کرے گا ترے زیور کا پسینا

ترصیعِ رخِ سادہ ہے اس سے بھی زیادہ
گو لگ نہ سکے کان کے گوہر کو پسینا

آتے ہی تری بزم میں سب ڈر گئے از بس
شیشے کو غشی آئی تو ساغر کو پسینا

کچھ بُندکیاں صندل کی نہیں جسم پر اس کے
آیا ہے نزاکت سے یہ عبہر کو پسینا

1۔ سرہنگ: فوجی سردار 2۔ کٹّی: مضبوط 3۔ چورنگ کرنا: ہاتھ پیر کاٹنے کے لیے باندھ کر ڈالنا
4۔ سمندر: آگ کا کیڑا

کیسی یہ تپِ عشق ہے کم بخت کہ جس میں ٹک نم نہیں دیتا کبھی نشتر کو پسینا

اے مصحفی میں کیوں کہ گلاب اس پہ نہ چھڑکوں
جب غش میں بھی آوے دلِ مضطر کو پسینا

26

اگر نہ دورِ فلک مجھ سے کج روی کرتا علم وہ قتل کو میرے ولایتی[1] کرتا؟

جنونِ عشق نہ گر مجھ سے دشمنی کرتا کبھی تو ہاتھ گریباں سے آشتی کرتا

جو دیکھتا مری حالت کو ہجرِ جاناں میں دعاے بد نہ مرے حق میں مدعی کرتا

نہ بعدِ مرگ تو جاتا یہ روگ میرے ساتھ میں ترکِ مہر و وفا کاش جیتے جی کرتا

برا ہو ضعف کا جس نے خلل کیا ورنہ شبِ فراق میں نالہ نہ کوتہی کرتا

جو پہلے خاک میں ملتا وہی تو مجنوں کا غبار ناقۂ لیلیٰ کی ہمسری کرتا

مری ہی مشق رسا ہوتی بت پرستی میں جو پیرِ دیر توجہ کبھی کبھی کرتا

جہاں میں قتل دو عالم تھا خوں بہا میرا ذرا بھی قاضی و مفتی جو منصفی کرتا

اسی غزل کو قصیدہ ابھی بنا دیتا
زیادہ اس سے جو میں فکر مصحفی کرتا

27

اتنا ہوتا ہے کوئی غیر سے مالوف[2] بھلا منھ دکھانا بھی کیا آپ نے موقوف بھلا

یہ ستم تم نے نکالا ہے نیا، بھیجتے ہو خط مجھے کر کے خطِ غیر میں ملفوف بھلا

یاد رکھیو یہ تغافل کی ادائیں اپنی تم کو پاتا ہوں بہت غیر سے مصروف بھلا

عربی خواں ہے تو لکھ اس کو کنائے میں تو خط نام سرنامے میں معشوق کا محذوف بھلا

1۔ ولایتی: نہایت مضبوط اور بدیسی۔ مراد مضبوط تلوار۔ ل اور ب: تیغ ولایتی

2۔ مالوف: آشنا، دوست

مصحفی ظرفِ زمانی سے نہیں ہم ماہر
اور اگر ہیں تو ہیں کس واسطے مظروف بھلا

28

کھا لیتے ہیں غصے میں تلوار کٹاری کیا
ہم لوگ ہیں سودائی اوقات ہماری کیا

بجلی سے لپٹ کر ہم بھسمنت[1] ہوئے آخر
اس کو ترے دامن کی سمجھے تھے کناری کیا

جوں شمع سرِ شب سے میں رونے کو بیٹھا ہوں
تا آخرِ شب دیکھوں دکھلائے یہ زاری کیا

گھبرائی جو پھرتی ہے اس طور صبا ہر سُو
آتی ہے گلستاں کو اس گل کی سواری کیا

رونا مری آنکھوں سے جب تک کہ نہ سیکھے گا
جا بیٹھ، تو رووے گا اے ابرِ بہاری کیا

سوتے سے تو اٹھنے دو ٹک اس کو سحر ہوتے
دیکھو گے کہ مچلے گی وہ چشمِ خماری کیا

نرگس کی خجل آنکھیں اتنی تو نہ تھیں گا ہے
اس چشمِ مفتن[2] سے بازی کوئی ہاری کیا

اوقات مجرد کی کس طرح بسر ہووے
جنگل ہے یہ بکتی ہے یاں نان نہاری کیا؟

اے مصحفی میں اس کو جی جان سے گو چاہا
آخر کو ہوا حاصل جز ذلت و خواری کیا

29

گر رہے گا کوئی ذرّہ تری بینائی کا
عالم آوے گا نظر گور میں تنہائی کا

عملِ نیک سے ہوتا ہے تقرّب بخدا
باپ کا نام کوئی پوچھے نہ واں بھائی کا

آخرِ شب ہی مری نیند اچٹ جاتی ہے
لطف دیتا ہے جو بجنا مجھے شہنائی کا

کوہ میں لالہ تو صحرا میں بنا ہے ٹیسو
پانو پھیلانا کہوں کیا ترے سودائی کا

طرح گیرا[3] کی زمیں پر سے اٹھا لیتی ہے دل
میں تو بندہ ہوں مژہ کی تری گیرائی کا

ہے اشارہ کہ گئے ہیں یہیں سب اہلِ غرور
سر جو جھکتا ہے طرف خاک کی مجرائی کا

1۔ بھسمنت: جل کر خاک 2۔ مفتن: فتنہ انگیز، برباد کرنے والی

3۔ گیرا: پکڑ لینے والا چقماق؟ لغت میں اس کے معنی قیدی اور قید کرنے والا دیے ہیں۔

ہوں سرِ خار کی شبنم چمنِ دہر میں مَیں باغباں کو نہیں کچھ غم مری کم پائی کا
مَیں تو اس عاشقِ شوریدہ کا ہوں دیوانہ نہیں اندیشہ جسے یار کی رسوائی کا
ہو گیا شوخ چھلاوا سا نظر آ کے نہاں کس سے پوچھوں میں نشاں آہوے صحرائی کا
عشق میں صبر کی تم مجھ سے توقع نہ رکھو کام دیوانے کوئی کرتے ہیں دانائی کا
مصحفی جب تئیں جیتا ہے تو خاموش نہ رہ
آخر اک دن تو زیاں ہووے گا گویائی کا

30

جب چمن میں جلوہ گر وہ قامتِ رعنا ہوا ہر قدم صحنِ روش پر فتنہ اک برپا ہوا
فصلِ گل مجنوں تھا میں فصلِ خزاں میں عندلیب مجھ کو تب سودا ہوا تھا اس کو اب سودا ہوا
کان ہیں بہروں کے کب جوشِ وخروشِ بحر پر یاں لبِ جُو تک زبانِ حال سے گویا ہوا
اب نہیں پرواہ ہے دل کی مجھے اس زلف میں گم ہوا سو بار تو سو بار ہی پیدا ہوا
کیا لے آیا جا کے مالک ثانیِ یوسف مرا مصر کے بازار میں کہتے ہیں پھر غوغا ہوا
قرص بن کھاتا تھا چکر چین تب آیا اسے مہر جب بندِ ازارِ یار کا لچھّا ہوا
پونچھتا دستِ حنائی سے وہ کل آنکھیں مری تم سے اتنا بھی نہ اے مژگانِ خوں بالا ہوا
آ گیا روندن[1] میں عالم کی وہ مثلِ نقشِ پا جس سے مستغنی مزاجِ یار بے پروا ہوا
مصحفی عالی مزاجوں پر نہیں آتی شکست
سنگسارِ فتنہ کس دن گنبدِ مینا ہوا

31

نیرنگ حسن سے جو ترے متصل ہوا آئینۂ ہزار نما اپنا دل ہوا
آدم کو سجدہ گاہ ملائک بنا دیا یہ رفتہ رفتہ مرتبۂ مشتِ گل ہوا

1۔ روندن: روندنے، پامال کرنے کا عمل

وہ ہاتھ، ہاتھ آئے تو یہ بوسے لوں کہ بس	جس ہاتھ سے خمیر ترا آب و گل ہوا
دامن بہت جھپکتے ہو جل جائے گی نسیم	گر برگِ گل سے شعلہ کوئی مشتعل ہوا
بیٹھا جو جم کے یار کے پہلو میں شب رقیب	دم رک گیا مرا کہ وہ چھاتی کی سل ہوا
میں آپ جب دیا سرِ تسلیم کو جھکا	تلوار کھینچ کر وہ نہایت خجل ہوا
حیراں ہوں میں کہ اتنا وہ کیوں آب آب ہے	آئینہ دیکھ، کس کی صفا، منفعل ہوا

شب کر کے وعدہ یار نہ آیا جو مصحفی
آنے کا اس کے آہ کوئی تو مخل ہوا

32

اس مرگ کو کب نہیں میں سمجھا	ہر دم دمِ واپسیں میں سمجھا
انداز ترا، بس اب نہ کر شور	اے نالہ آتشیں، میں سمجھا
تب مجھ کو اجل ہوئی گوارا	جب زہر کو انگبیں میں سمجھا
اک خلق کی سرنوشت بانچی[1]	اپنا نہ خطِ جبیں میں سمجھا
جوں شانہ کبھو تہِ پیچ تیرے	اے کاکلِ عنبریں میں سمجھا
کیا فائدہ آہِ دم بہ دم سے	ہے دردِ دل حزیں میں سمجھا
پھر اس میں نہ شک نے راہ پائی	جس بات کو بالیقیں میں سمجھا
جب اٹھ گئی ضد تو ہر سخن میں	سمجھا تو کہیں، کہیں میں سمجھا
موئے کمر اس کا کیا ہے اے عقل	سمجھا تو مجھے، نہیں میں سمجھا

لکھی غزل اس میں مصحفی جلد
جس کو کہ نئی زمیں میں سمجھا

33

مجھ کو چولھے میں نظر آتا ہے شعلہ طور کا	ہوں میں شاعر باندھتا ہوں تب تو مضموں دور کا

1۔ بانچنا: پڑھنا، پڑھ کر سمجھ لینا

معنیِ "الحق یعلو" کیوں کہ سب پر کھل نہ جائیں
دار نے البتہ سر اونچا کیا منصور کا

اہل دنیا ثقل سے دنیا کے ہوں سرگرمِ سعی
پانو جلدی بوجھ کے باعث پڑے مزدور کا

چودھویں شب تک مجھے یہ ماہِ کامل ہے عزیز
بعد ازاں خواہاں نہیں میں چہرۂ بے نور کا

منھ سے بولے یا نہ بولے مے خوری چھپتی نہیں
حال آنکھوں سے عیاں ہوجاوے ہے مخمور کا

ایسی جنت سے تو یارب مجھ کو دوزخ ہے قبول
ہاتھ میں زاہد کے دکھلانا نہ ساعد حور کا

دل پہ جس کے جبر ہو اس سے ڈرا ہی چاہیے
عرش تک جاتا ہے نالہ عاشقِ مجبور کا

بد سے ہو کیا نیک طینت کو ضرر، ہے یہ محال
رنگ تیرہ صحبتِ فلفل میں ہو کافور کا

اس کرنجی آنکھ کی پتلی سپیدی میں ہے یوں
عاج[1] کی کشتی میں جوں دانہ دھرا انگور کا

مان کہنے کو مرے ترکِ رعونت کر کہ یاں
گوے بازی ہووے ہے سر گردنِ مغرور کا

پھونک دے اے آہ اس چرخ مکوکب کو کہیں
سر پہ رہنا کب بھلا ہے خانۂ زنبور کا

دل کو کاہش کیوں نہ دیوے کاہشِ حسنِ شباب
جی کڑھاتا ہے چھلکنا ساغرِ معمور کا

رمزِ حق جتنی رہے پنہاں مزہ اس میں ہی ہے
لطف کیا منھ کھول دینا شاہدِ مستور کا

سب ہیں سلطان السلاطیں یہ جو سوتے ہیں پڑے
ہر حظیرہ[2] مقبرہ ہے قیصر و فغفور کا

سرگزشتہ مصحفی ہوتے ہیں کوئی جی کے چور
سر کٹے پر بھی قدم بڑھتا ہے آگے سور[3] کا

34

رات دن اپنا ہی میں خونِ جگر ہوں پیتا
نہیں معلوم کہ رکھا ہے مجھے کیوں جیتا

دست گیری نہیں کرتا کوئی ہنگامِ بلا
ساتھ دیتا ہے فقیروں کا مگر اک بیتا[4]

ماہ و خورشید ہیں عرصے میں فلک کے وہ دو رخ[5]
کر کے منصوبہ کوئی جن سے نہ بازی جیتا

مجھ پہ ناصح نے کیا طرفہ ستم، لازم تھا
موسمِ گل میں تو میرا نہ گریباں سیتا

1۔ عاج : ہاتھی دانت　2۔ اصل اور دیگر نسخوں میں: حظیرا۔ حظیرہ: قبرستان کی چار دیواری
3۔ سور: بہادر　4۔ بیتا : پیالہ　5۔ رخ : شطرنج کے مہرے

اُس فرنگن کی ادا مر ہی گیا دیکھ کے میں
مصحفی جب کہ سجا اس نے کمر پر فیتا

35

معاملہ ہی عزیزوں سے میں نے صاف کیا — جو نیچہ تھا زباں کا اسے غلاف کیا
کچھ اختلاف نہ تھا دینِ احمدی میں ذرا — منافقوں نے جو چاہا سو اختلاف کیا
فلک نے عہدِ جوانی نہ کوئی سونپا کام — ہوئے جو پیر تو ہم کو سفید باف کیا
میں اس کی جعدِ پسِ پشت کا کروں کیا ذکر — جو سر کا قاف اسے مار کوہِ قاف کیا
مصوری پہ صفا اس شکم کی جب آئی — تو عکسِ چاہِ ذقن کو شبیہِ ناف کیا
پسندِ یار جو آتا تو نذر تھا اس کی — کرم کیا کہ مرا دل مجھے معاف کیا
دھنک جو اشک کی اپنے پسند آئی اسے — تو اس نے چوٹی میں ڈالا اسے مباف کیا
یہ وہ ہے بند ہو جس سے زبانِ خاقانی
نہ مصحفی سے سخن میں کسی نے لاف کیا

36

ذبح کے وقت وہ اندیشۂ شمشیر میں تھا — کس قدر شوقِ طپیدن دل نخچیر میں تھا
دل پہ کیا جانیے چوٹ آئی تھی کیا رات اس کے — صبح تک مرغِ چمن نالۂ شب گیر میں تھا
بعد مرنے کے ہوئی تن کی حقیقت معلوم — عبث اس خانۂ ویراں کی میں تعمیر میں تھا
جب تلک عشق رہا لاگ رہی یہ برسوں — اس کی تدبیر میں مَیں، وہ مری تدبیر میں تھا
پردۂ گوشِ اسیراں نہ ہوئی اک شب گرم — پانو کس مردے کا یا رب مری زنجیر میں تھا
وصل کا خواب دکھاتا ہے کسے دور فلک — آہ حیراں میں اسی خواب کی تعبیر میں تھا
یادِ ایامِ جوانی کہ جو اس کی دولت — کشورِ درد کسی دن مری جاگیر میں تھا
فتویِ عشقِ جفاکار نے مہلت ہی نہ دی — گرچہ قاضی کو تامل مری تعذیر میں تھا

کس نے بھیجا تھا خدا جانے یہ خط قاتل کو　　خوں بھی چھڑکا ہوا کچھ نامے کی تحریر میں تھا
نکلی تلوار تو اس دم ترے بسمل نے کہا　　پیش آیا وہی جو کچھ مری تقدیر میں تھا
کچھ گلے کی نہ رہی اپنے خبر کیا کہیے　　دھیان اپنا جو تری برّشِ شمشیر میں تھا
کیا ہوا شعر میں کہتا تھا بہ وقتِ پیری
مصحفی دل تو لگا مصحفِ تفسیر میں تھا

37

جذبِ الفت کا جو قاتل تری شمشیر میں تھا　　ذبح کے وقت بھی دامن کفِ نخچیر میں تھا
کیا کہوں میں جو مزہ یار کی شمشیر میں تھا　　لیک بن زخم ہی مرنا مری تقدیر میں تھا
ایک ساعت نہ گرا ہاتھ سے مانی کے قلم　　کام باریک کمر کا تری تصویر میں تھا
تحفے کیا کیا نہ پری چہرہ ہمیں بھیجتے تھے　　کشورِ حسن کبھی اپنی بھی تسخیر میں تھا
جو اسے جن و بشر دیکھ کے حیران رہے　　رنگ کیسا یہ ستم گر تری تصویر میں تھا
دھویا سو پانی سے تو بھی نہ گیا داغ اس کا　　خوں جما کس کا یہ قاتل تری شمشیر میں تھا
قوتِ بازوے قاتل نے کمی کی ورنہ　　کام اپنا تو تمام ایک ہی شمشیر میں تھا
مصحفی شعر تو کہتے تھے سبھی یار اچھے
پر سماں اور مرے خامے کی تحریر میں تھا

38

کب میں فکرِ غزلِ زلفِ پریشاں میں نہ تھا　　کون سی شب سرِ اندیشہ گریباں میں نہ تھا
ناقہ کس نخل پہ لیلیٰ کا ہوا وارفتہ　　اتنا الجھاؤ تو کچھ دشتِ مغیلاں میں نہ تھا
گردشِ چرخ نے دلّی سے نکالا جو مجھے　　کیا مکاں امن کا اس کشورِ ویراں میں نہ تھا
اے جرس، ضبطِ فغاں تو دو قدم تو کرتا　　اس قدر حوصلہ تیرے دلِ نالاں میں نہ تھا
واں سے نومید پھرے کشتنی اس کے یعنی　　آبِ خنجر کا مزہ چشمۂ حیواں میں نہ تھا

جس ستمگر نے ترے خوب مزے لوٹے تھے — وہ نمک ایک بھی قاتل کے نمکداں میں نہ تھا
منھ میں اس تشنہ کے پانی جو چوا تا دمِ نزع — آب اتنا بھی ترے چاہِ زنخداں میں نہ تھا
نوبہار آتے ہی ہم نے قفس آباد کیا — نالہ کرنا ہمیں منظور گلستاں میں نہ تھا
ایک نے آ کے شفاعت نہ مری کی دمِ قتل — کیا مرا دوست کوئی گبر و مسلماں میں نہ تھا

مصحفی ہند میں ہوتا ترا ثانی کیوں کر
تجھ سا افصح تو کوئی ملکِ صفاہاں میں نہ تھا

39

سمجھ لے اس سے بدن کی خوبی نہ رنگ کچھ پوچھ اس بدن کا
تبسمِ گل پہ خنداں زن ہے ہر ایک چاک اس کے پیرہن کا

اگر عزیزوں کی ہووے خواہش ترانہ سن لیویں مجھ سے بن کا
مقام میرا ہے دشتِ وحشت میں رہنے والا نہیں چمن کا

حلاوتِ تیغِ قاتل اس کو جو بیقراری میں یاد آوے
دہانِ زخمِ بلا نصیباں لے بوسہ اپنے نہ کیوں دہن کا

بہی کی صورت ذقن بنائی، لبوں کو عناب کر دکھایا
میں کھینچ لایا عجم میں جا کر کسی کے نقشا لب و ذقن کا

ہنسے کسی پر جو ہم تو بجلی ہمارے ہنسنے سے ہم پر آئی
خدا ہی جانے کہ حال کیا ہو عدم میں یارانِ خندہ زن کا

سفر تو مجھ کو ہے گھر میں بیٹھے سفر کا کس طرح نام لوں پھر
جہاں میں ٹھہرا وطن وہ ٹھہرا ارادہ کس دن کیا وطن کا

بلا سے گو جھوٹ ہو یہ مژدہ ولے برائے تسلیِ دل
کوئی تو اتنا سنا دے مجھ کو کہ قاصد آیا ترے وطن کا

عزیز و یاران و دوستاں کے کچھ ایسا چت[1] سے اتر گیا میں
نہ خواب میں بھی مرے تو آیا کبھی مسافر کوئی وطن کا
میں مشک والوں کو واں کے بھیجوں ان اترے بالوں کا میرے تحفہ
جو جانے والا دو چار ہووے مسافروں میں کوئی ختن کا
جو اب بھی صیاد چھوڑ دیوے تو تا بہ گلزار اُڑ سکوں میں
اگرچہ کنجِ قفس میں مجھ کو نہیں ہے مقدور پر زدن کا
اگرچہ نئے کی طرح ہے سینہ تمام سوراخ میرا اے گل
کروں جو نالہ تو رنگ اڑ جائے ایک نالہ میں انجمن کا
ہر اک سخن میں جگر پہ تیشہ لگے ہے میرے زباں ہلاتے
دماغ اتنا کہاں ہے مجھ کو کہوں فسانہ میں کوہ کن کا
میں بختِ کج سے جو رات بگڑا کچھ ان سے ہرگز نہ کام نکلا
مجھے بھروسا بڑا تھا پیارے تمھاری زلفوں کے بانک پن کا
تبسمِ گل پہ کھول کر دل تو جتنے نالے کہ چاہے کر لے
کبھی تو عقدہ کھلے گا بلبل چمن میں میرے لب و دہن کا
لحد میں میرا جو کھول کر منہ کسی نے بعد از فنا نہ دیکھا
بھلا ہوا میں کفن میں کب تھا اسی میں پردہ رہا کفن کا
زحل کو اس نے تو مار اتارا جگر میں اس کے کیا بغارا[2]
میں مصحفی رات توڑ دیکھا خدنگ آہِ فلک شکن کا

40

سلمے میں نہ تھا نامِ خدا اتنا جھمکڑا　　سلو[3] کی جگہ ہے یہ ترے کفش کا سلما
جو پوتھ[4] ہے وہ مردمکِ چشمِ پری ہے　　اور گوکھرو[5] جتنے ہیں ٹکے ہیں یدِ بیضا

1۔ چت : دل　2۔ بغارا : غار، گھار　3۔سلو: سنہری فیتا　4۔ پوتھ: چھوٹے موتی
5۔ گوکھرو: بلدار سنہری فیتا

41

گور سے نکلے ہے اک شکلِ دہانِ اژدہا
خلق جا کر کیوں کہ سوتی ہے میانِ اژدہا

دل کے ڈس لینے میں اک اک بال ان کا قہر ہے
سر کو میں سمجھا ہوں محبوبوں کے کانِ اژدہا

شانہ اس کی زلف کا جب سے ہوا جزوِ بدن
دیکھنے میں اپنے آئے استخوانِ اژدہا

نیند اچٹ جاتی ہے اپنی شب کو زیرِ آسماں
کہکشاں پر جب کہ پڑتا ہے گمانِ اژدہا

عقربِ زلفِ سیہ نے کس کے مارا اس کو نیش
رات بھر سونے نہیں دیتی فغانِ اژدہا

جعد میں اس حورش کے دیکھ کر موباف سرخ
لال[1] ہو جاتی ہے حیرت سے زبانِ اژدہا

سانپ کے بچے ہیں گویا اس کی چوٹی کی لٹیں
جن سے ہے آباد یکسر دودمانِ اژدہا

جز رخِ رخشندۂ معشوق و گیسوے سیاہ
ماہ سے ہم نے نہ دیکھا تھا قرانِ اژدہا

چھٹ رہی ہیں یہ لٹیں اس زلف کی سوے کمر
یا چلا ملک عدم کو کاروانِ اژدہا

کیا بلا ہے کاکل اس کی میں بھی حیراں اس میں ہوں
دیکھ کر جس کو نکل جاتی ہے جانِ اژدہا

مصحفی نے زہر یہ اُگلا شکایت کا کہ رات
بن گئی اس کی زباں مثلِ دہانِ اژدہا

42

چتون سے جس کی نکلے انداز دلبری کا
کیوں کر وہ لے نہ جاوے دل حور اور پری کا

صد مارِ رشک دل کو ڈسنے لگے اسی دم
پاجامہ جب کہ پہنا اس نے اساوری کا

اس لعلِ لب کی قیمت ہوتی نہیں مشخص
دل خون ہو گیا ہے اس غم میں جوہری کا

ابتر ہوا دل اپنا یاں تک کہ رہ گیا بس
مضمون سوچنے سے زلفوں کی ابتری کا

تلوار باندھ نکلا دو چار مار ڈالے
سدھ لیتے ہی ہوا وہ مائل ستم گری کا

ہر اک کو اس کا رتبہ کب مصحفی ملے ہے
کذاب نے کیا گو دعویٰ پیمبری کا

1۔ زبان لال ہونا: زبان بند ہونا

43

گرمیِ صید نے صحرائے ختن پھونک دیا — تو نے کیا کیا ہرن اے صید فگن پھونک دیا
شعلۂ شمع نے دونوں کا کیا کام تمام — ساتھ فانوس کے آخر کو لگن پھونک دیا
اس میں خرگوش جلے جیسے روئی کے گالے — دوں کے لگنے نے جو یکبار یہ بن پھونک دیا
کفکِ پائے نگاریں نے ترے، اے گلِ تر — روندتے سبزے کو لالے کا چمن پھونک دیا
غسل دے کر مجھے تابوت میں جب رکھنے لگے — آتشِ سینۂ سوزاں نے کفن پھونک دیا
مے یہ کیسی تھی خدا جانیے شیشے میں بھری — جس کے اک جرعے نے اپنا تو بدن پھونک دیا

مصحفی دود سے مستی کے جلا کشورِ شام
شعلۂ لعلِ لب اس کے نے یمن پھونک دیا

44

تیرے دیکھے سے نہ ایمان رہا مردم کا — زہد و تقویٰ نہ وہ قرآن رہا مردم کا
کوچ کی شب جرسِ ناقۂ لیلیٰ کے بغیر — قافلہ بے سر و سامان رہا مردم کا
سینہ یہ ہے تو تم، اے سیم برو دیکھو گے — ایک ثابت نہ گریبان رہا مردم کا
کس نے دیکھا تجھے سمکھ[1] کہ ترے عہد کے بیچ — چشم پر گوشۂ دامان رہا مردم کا
مختلف رنگِ صور جب نظر آئے اس کو — کس قدر آئینہ حیران رہا مردم کا
خوش ہوئی دیکھ اسے زلف پریشاں تیری — کس قدر حال پریشان رہا مردم کا
حسن وہ جنس ہے جس سے ترے دروازے پر — اک نہ اک قصہ ہی ہر آن رہا مردم کا
ایک کو عید کے دن منھ نہ دکھایا تو نے — عاقبت جی میں یہ ارمان رہا مردم کا

مصحفی بس کہ سخن ہم نے کہا نغز و لطیف
سیرگاہ اپنا ہی دیوان رہا مردم کا

45

پیار میں آکے جو شب تم نے "طمانچہ" مارا — طائرِ دل کو صنم اور یہ لاسا[2] مارا

1۔ سمکھ: مقابل 2۔ لاسا: [illegible]

آبِ خنجر سے تری جب نہ ہوا اور سلوک	تشنہ لب اس نے مجھے بر لبِ دریا مارا
کوئی لیلیٰ نے مگر اس کو دکھائی ہے ادا	قیس پھرتا ہے جو اس کوچے میں مارا مارا
چھوڑ کر دل کا نشاں چھید دیا پہلو کو	تیر اس شوخ نے مارا تو یہ بے جا مارا

مصحفی را چو دل از شہر بتنگ آمدہ است
بہ نمائید عزیزاں رہ صحرا مارا

46

رہتا ہے ترے وصل کے ارمان میں کتنا	ارمان بھرا ہے دلِ نادان میں کتنا
کس طرح یہ صدمے شبِ ہجراں کے اٹھاوے	مقدور ہے عاشق کے دل و جان میں کتنا
گو بھول گیا ہوں میں تجھے تو بھی ترا رنگ	جھلکے ہے مرے دیدۂ حیران میں کتنا
مقدور فرشتے کا نہیں ضبطِ غمِ عشق	یہ کیوں کہ کرے، حوصلہ انسان میں کتنا
تو کر کے نشانہ مجھے کیوں بھول نہ جاتا	خوں میرا لگا تھا ترے پیکان میں کتنا
میں کیا کہوں اس حسن پہ، اے کانِ ملاحت	لگتا ہے بھلا سبزہ ترے کان میں کتنا
وصل اس کو زہِ دامنِ محشر میں کیا ہے	پھیلاؤ ہے عاشق کے گریبان میں کتنا

اے مصحفی کیا تازی[1] زباں تجھ کو خوش آئے
مصروف ہے تو آیہ و قرآن میں کتنا

47

غم کا پیوند اپنے مغزِ استخواں سے ہو گیا	حرفِ راحت گم زمین و آسماں سے ہو گیا
منزلِ مقصود کو اس کا پہنچنا ہے محال	پہلی منزل میں جدا جو کارواں سے ہو گیا
رہ گیا سینے ہی میں دل کچھ تڑپ کر عاقبت	یعنی کام اس کا تری نوکِ سناں سے ہو گیا
بے کسی پر اپنی بس بلبل کا دل کڑھنے لگا	ایک تنکا بھی الگ گر آشیاں سے ہو گیا

1۔ تازی: عربی

ذبح کے دم اپنے قاتل سے کہے تھا یوں ذبیح رحم کیا تیرے دلِ نا مہرباں سے ہو گیا
دیکھیو ضد، تب رہا ہم کو کیا صیاد نے باغ سب تاراج جب بادِ خزاں سے ہو گیا

ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی صدرہ[1] تک تحصیل ہے
مصحفی ایسا بڑا فاضل کہاں سے ہو گیا

48

نہ بت خانوں میں ہے شور آج حسنِ انتخابی کا برہمن بید[2] خواں ہے کب سے اس روے کتابی کا
بھلا وہ گرمیِ خورشید کی پھر تاب کیا لاوے گراں ہو جس رخِ نازک پہ سایہ آفتابی کا
چمن میں سرنگوں ہے دیدۂ نرگس خجالت سے کن آنکھوں نے دکھایا اس کو عالم نیم خوابی کا
بہار بزم سیر حسن ہوتی ہے غضب تب تو[3] ہر اک گل کشتہ ہے اس گل کی دستار گلابی کا
نشے میں سرمۂ دنبالہ دارِ چشمِ ساقی نے دکھایا اینڈ نا میخانے کے در پر شرابی کا
کباب نیم خام اس نے دیے شب بادہ نوشوں کو الٰہی آتشِ سوزاں میں جلیو گھر کبابی کا
ہم ایسی مرثیہ خوانی ہی سے گزرے، سوالی کو محرم میں ہمیشہ فکر رہتا ہے جوابی کا
نہیں اپنا جو دل خوش ان حجاب آلودہ خوباں سے نشے میں مَیں مزہ لوٹا ہے کس کی بے حجابی کا

وہ گل اے مصحفی کیا جانے کس کس کو رلاوے گا
کہ اس نے پیرہن پہنا ہے بر میں رنگ آبی کا

49

بے سبب آزردہ صنم ہو گیا ہاے یہ کیا مجھ پہ ستم ہو گیا
اس لبِ شیریں کی مَسیں بھیگیں آہ شہد بھی حق میں مرے سَم ہو گیا
ضعف سے کوچہ مجھے دلدار کا تھا دو قدم لاکھ قدم ہو گیا
اٹھ کے میں قاصد کے حوالے کیا نامہ جو جلدی میں رقم ہو گیا

1۔ صدرہ : معقولات کی ایک اہم کتاب 2۔ بید: وید (ہندوؤں کی مقدس کتاب)
3۔ ''تب تو'' یعنی اس لیے تو

مصحفی کیا کیجیے یادِ شباب
وہ بھی سماں بس کوئی دم ہو گیا

50

شبنم کا قطرہ ہی نہ فقط آب دیدہ تھا — تربت پہ میری گل بھی گریباں دریدہ تھا
شب اشتیاقِ بوسۂ رخ میں ترے صنم — ہر ایک برگِ گل لبِ حسرت گزیدہ تھا
دیکھے تھے اس نے کس کے دو ابروے راست خم — سروِ سہی جو صورتِ شاخِ خمیدہ تھا
شاید گیا چمن سے وہ گل صبح دم جو آہ — نرگس کا پھول دیدۂ حسرت کشیدہ تھا
بن بن کے ابرِ زرد چمن پر جو چھا گیا — یہ بھی کسی کے رخ کا تو رنگِ پریدہ تھا
آخر کو ہو کے لالہ و گل وہ اگا وہاں — پتھر پہ کوہ کن کا جو خونِ چکیدہ تھا
دیکھی تھی اس نے فندقِ خنصر[1] کی کس کے پور — پر مضطرب جو اشک بہ مژگاں دویدہ تھا
پھینکی تھی کس نے پیک روش پر جو باغ میں — خجلت سے سرخ رنگِ گلِ نو دمیدہ تھا
ہاتھوں سے روزِ وصل گیا یوں جو مصحفی
برقِ جہندہ[2] بادہ غزالِ رمیدہ تھا

51

قاصد کے ہاتھ اگر میں خط و پیام بھیجا — خالی پھرا وہ اس نے خالی سلام بھیجا
زلفوں کے بال خط میں رکھ ارمغاں بنائی — صیاد نے ہمارے یا ہم کو دام بھیجا
بیمار بھی ہوا میں، شکوہ مرا بجا ہے — صاحب نے بہرِ پرسش کس دن غلام بھیجا
ساقی کی مہربانی تھی حال پر جو میرے — لب سے لگا کر اپنے شب مجھ کو جام بھیجا
سفاک آنکھ اس کی چتون میں کہہ رہی ہے — سوے عدم تمھیں اب اے خاص و عام بھیجا
آہستگی تھی ایسی رفتار میں شب اس کی — مہ نے درود جس پر وقتِ خرام بھیجا

1۔ خنصر: چھنگلیاں 2۔ جہندہ: "جستن" کا اسم فاعل (جستن = کودنا)

قاصد کی دیر سے تو اے مصحفی نہ گھبرا
خط کا جواب اس نے اب صبح شام بھیجا

52

لب ہلاتے ہی مرے مجھ سے تو بیزار ہوا
بات کہتے ترے آگے میں گنہگار ہوا

طرفہ اقلیمِ محبت کی میں یہ دیکھی رسم
دل دیا جس کو وہی درپئے آزار ہوا

نشۂ مے میں ہوئے رات جو دونوں غٹ پٹ
نہ میں بیدار ہوا اور نہ وہ ہشیار ہوا

منھ چھپانا کہیں چھوڑ اب تو کہ اے رشکِ بہار
گلِ عارض پہ ترا سبزہ نمودار ہوا

ہاتھ مجنوں نے بھی کھینچا جو ہوا داری سے
سایۂ بید مجھے سایۂ دیوار ہوا

ہیں سبھی منتظرِ روزِ قیامت، اس کا
اہلِ محشر سے مگر وعدۂ دیدار ہوا

رنگِ پنہانِ محبت کو کیا فاش اے وائے
تم سے کیا کام یہ اے دیدہ خونبار ہوا

گھر میں لگتا نہیں اب ایک گھڑی دل میرا
آہ کس شوخ سے سودا سر بازار ہوا

دست بوسی پہ مجھے رشک رہا اس کی ہی
استخواں وہ جو ترے تیر کا سوفار ہوا

مصحفی ایک بھی شب وہ تو نہ آیا مرے گھر
گو نگاہوں میں سدا وصل کا اقرار ہوا

53

ایک کر کے جب کرے ہے وہ اشارا دوسرا
میں یہ سمجھوں ہوں کہ گویا تیر مارا دوسرا

ایک کے حصے میں لیلیٰ کی طرح آیا ہے یار؟
چشمِ مجنوں سے کرے کیوں کر نظارا دوسرا

آرسی میں جب سے وہ دیکھا کرے ہے آپ کو
کر نہیں سکتا کوئی اس کا نظارا دوسرا

کوہ کن حسرت میں یوں کیوں جان دیتا عشق باز
گر مزاجِ حسن کو ہوتا گوارا دوسرا

گوش و گوہر کا ترے عالم بیاں کس سے کروں
اک اگر ماہِ منوّر ہے تو تارا دوسرا

تا نہ ہووے صاف مطلب مت طلب سے باز آ
شک کی جا دیکھیں ہیں مردم استخارا دوسرا

قتل پر میرے مصر ہے بس کہ قاتل کا مزاج گر نہ آوے ایک دیکھے استخارا دوسرا
کیا مہ و خورشید کا اس رخ کے آگے ہے فروغ ایک کو صدقے کیا اس پر تو وارا دوسرا
پار بحرِ عشق سے کیوں کر کوئی اترے کہ ہاے یہ تو رکھتا ہی نہیں ہرگز کنارا دوسرا
چڑھ ہی جاتا رات اس کوٹھے پہ میں اے مصحفی
اپنے کاندھے کا جو ٹک دیتا سہارا دوسرا

54

پیچ و تابِ رگِ بسمل نہ ہو کیوں دام اپنا خنجرِ ناز نے پورا نہ کیا کام اپنا
اس گلی میں کوئی تا شب کو نہ پہنچائے اسے چہرہ کرتا ہے سیہ مہر دمِ شام اپنا
دمِ شمشیر پہ قاتل کے رکھا سر ہم نے تھا مقدر میں یہی بالشِ آرام اپنا
خوب رویوں کی محبت سے کریں کیوں توبہ دین اپنا ہے یہی اور یہی اسلام اپنا
کوتہی گر نہ کرے شومیِ طالع دمِ نزع آن پہنچا تو ہے خورشید لبِ بام اپنا
تا خط اس کا بھی یہ نفرت سے پڑھے وہ ظالم لکھ دیا غیر کے سرنامے پہ میں نام اپنا
مصحفی کچھ یہ گلستاں نہیں عشرت کی جگہ
گل پٹکتا ہے لبِ جو پہ یہاں جام اپنا

55

صیّاد تو بہار میں دل شاد کر چکا کنجِ قفس سے تو مجھے آزاد کر چکا
تب اس نے کچھ سمجھ کے عنانِ سمند لی جب خوب میری خاک کو برباد کر چکا
بولا وہ تب گلے پہ چھری پھیر کر مرے چپ رہ، بہت تو نالہ و فریاد کر چکا
میری یہ آرزو ہے کہ صیاد یہ کہے جا، رے اسیر میں تجھے آزاد کر چکا
اب شکوہ اس سے قتلِ غریباں کا کیا حصول کرنا نہ تھا سو وہ ستم ایجاد کر چکا
لب پر فغاں گر آئی تو تالو کو پھیر دی میں یاں تلک تو خاطرِ صیّاد کر چکا

حسرت تو دیکھیو کہ مرا دم ہوا ہوا جب تیغ تیز سنگ پہ جلّاد کر چکا
اب اس کی بے دمی میں کسی کو سخن نہیں خوں اپنا کارِ خنجرِ فولاد کر چکا
جب بے ستون چرخ گراتب کہیں گے ہم لو نالہ کار تیشۂ فرہاد کر چکا
عاشق کا خوں نہ بند ہوا بل بے جوش خوں تدبیر عنکبوت بھی فصد کر چکا
نقشے کو تیرے دیکھ فلاطوں نے یوں کہا آرایش اس شبیہہ کی بہزاد کر چکا
رکھ اب تو ہاتھ سے کہیں اے مصحفی قلم
کرنا تھا کام تجھ کو سو استاد کر چکا

56

گیا فلک سے پرے نالۂ بلند اپنا بتاوے کوئی کہاں رہ گیا سمند اپنا
بلا نہ بزم میں اپنی تو ہم کو اے جمشید کرے نہ عیش ترا تلخ زہر خند اپنا
اسیرِ طوقِ وفاے بتاں جو ہیں ہم لوگ گلے میں اپنے بھی ہے حلقۂ کمند اپنا
غضب تو یہ ہے کہ وہ شوخ سن کے کچھ نہ کہے کہے جو حال کہے کوئی دردمند اپنا
جلے ہے آگ میں وہ بھی پہ بے قراری میں کبھی مقابلہ کرتا نہیں سپند اپنا
دماغ اس کا فلک پر گیا شب اس مہ نے کیا حوالۂ پروین خود سپند اپنا
گِلے کی جا نہیں یارو عزیز سے ہرگز
ہمیشہ مصحفی ہے دل ہی دُکھا دھند اپنا

57

اپنا شب فراق جو تاریک خانہ تھا داغِ چراغ سرِ آشیانہ تھا
کچھ تو گناہ مجھ سے ہوا تھا، پیے کی طرح جو واژگوں چمن میں مرا آشیانہ تھا
بیگانہ وار ذکر پہ میرے جو جل گیا بادام تیری چشم کا شاید یگانہ تھا
عاشق کا سر چھری سے لیا کاٹ شوخ نے نزدیک اس کے یہ بھی مگر ہندوانہ تھا

لٹھے[1] جو تھے انھوں کو بھی چالاک کر دیا　کیا جانے کس کی جعد کا یہ تازیانہ تھا
واں تیر چھٹ رہے تھے ہوائی بہ سوے چرخ　یاں کشتگانِ ناز کا دل ہی نشانہ تھا
ہرگز نہ چشمِ بد کا گزر اس طرف ہوا　چوٹی میں تیری جب تئیں تعویذِ شانہ تھا
سمجھا میں جس کو خالِ رخِ یار مصحفی
نافے کا اس کی زلف کے وہ مشک دانہ تھا

58

میں پانو پانو سطحِ زمیں پر روانہ تھا　مجھ پاس تو کبھی نہ پنس تھی نہ میانہ تھا
بھاگے تھا دور دور وہ بت مجھ سے جن دنوں　ویرانیوں سے خانۂ دل دیو خانہ تھا
ظالم کی سلطنت کو شتاب آوے ہے زوال　کسریٰ کے گھر میں عدل کے باعث خزانہ تھا
دل اس کی دوستی پہ مرا اور پس گیا　شب میرے ساتھ مرغِ قفس ہم ترانہ تھا
پھرتی تمام رات رہی اس کے گرد برق　جس شاخ پر چمن میں مرا آشیانہ تھا
عریاں تنی میں فقر کی منزل جو طے ہوئی　کیا نقش بوریا ہی مجھے تازیانہ تھا
تقدیر میں لکھی تھی مری مرگ مصحفی
شادی کا روزِ وصل کی ناحق بہانہ تھا

59

بیمار چشم و گیسو ہو جی سے تنگ لٹکا　کتنا ہی ہے وہ آخر جس دم پتنگ لٹکا
بابا فرید کو تھا عشقِ نمازِ معکوس　تب تو کنویں میں الٹا بے نام و ننگ لٹکا
بیٹھے ہیں خوں گرفتہ در پر ابھی ہزاروں　کھونٹی سے اپنا تیغا مت خانہ جنگ لٹکا
یہ جان تو وہی ہے زلفوں کا اس کی مجرم　گل دے کے جس کو دیویں اہلِ فرنگ لٹکا
گولے[2] کے نخل پر وہ گولے کا سا سماں تھا　مژگاں سے رات آنسو جو لالہ رنگ لٹکا

1۔ لٹھ، لٹھا: جاہل، گنوار۔ بے ترتیب کے معنی میں آج بھی مستعمل ہے۔ لغت میں یہ معنی نہیں ملے۔

2۔ گولے یا گولی؟ (گولی کا درخت؟)

جر ثقیل والے مٹ جائیں گے سراسر موے کمر سے تیغا مت جوں نہنگ لٹکا
جب وقتِ شام ڈوبا خورشید میں یہ سمجھا یہ کشتیِ فلک کے لنگر کا سنگ لٹکا
لیلیٰ کا کیوں نہ محمل ہو خوشۂ ثریا ہے جس میں ہر ستارہ مانند زنگ[1] لٹکا
اک تیر رشک اس نے مارا مرے جگر میں جو مرغ شاخِ گل سے بلبل کے ڈھنگ لٹکا
تیرے شہید کو ہم کیا خاک میں رکھیں گے تابوت وش لحد میں دیں گے پلنگ لٹکا
آماج آسماں تک پہنچا نہ ناوکِ آہ رستے میں سست ہو کر شب یہ خدنگ لٹکا
مسلخ[2] سے آسماں کے بچ کر گیا نہ کوئی جوں ترقازی[3] پر یاں شیر و پلنگ لٹکا

اے مصحفی وہ تجھ سے گر سرکشی کرے ہے
تو پھینک اس پہ تُو بھی کچھ بے درنگ لٹکا[4]

60

بعدِ کشتن زندہ میں نامِ وفا رہنے دیا کوچۂ قاتل میں اپنا سر پڑا رہنے دیا
لکھ کے میں پاس اپنے خطِ دل ربا رہنے دیا آرزو میں اس کی قاصد کو لگا رہنے دیا
عشق نے کب چین سے مجھ کو بھلا رہنے دیا دل کو بدنامی کا اک دھڑکا لگا رہنے دیا
اس کے حسنِ دشمنی افگن نے اپنے عہد میں دوستداروں کو نہ باہم آشنا رہنے دیا
اور تو قیدیٔ قفس کے چھوڑے سب صیاد نے ایک مجھ کو ہی سمجھ کر خوش نوا رہنے دیا
جی کڑھانا تھا مرا منظور بعد از دردِ سر اس نے پیشانی کو جو صندل لپا رہنے دیا
گوشت کشتے کا ترے زاغ و زغن آ، کھا گئے استخواں کا ڈھیر از بہرِ ہما رہنے دیا
وصل کی شب دل تو خالی کر لیا پر بہر یار دوسری شب کو بھی باقی کچھ گلا رہنے دیا
اس ہواداری پہ برق رنگ گل نے باغ میں آشیاں میرا نہ اے بادِ صبا رہنے دیا
بدگمانی تا نہ ہو افزوں لفافے والوں کی خط جو میں معشوق کو بھیجا کھلا رہنے دیا

1۔ زنگ: گھنٹی 2۔ مسلخ: مذبح 3۔ ترقازی = ترکتازی: لوٹ مار
4۔ لٹکا: معمولی مگر کارگر علاج، مراد تدبیر

چرخ نے بھی ہجر کی شب سن کے نالے کو مرے ایک ساعت اپنا سنگِ آسیا رہنے دیا
چھوٹ جاتے رنج ہستی سے جو مر جاتے شتاب زیست نے ہم کو اسیرِ صد بلا رہنے دیا
مجھ سے تاراج فلک نے سب لیا یکبار چھین گھر میں میرے ایک ٹوٹا بوریا رہنے دیا
زندگانی کا برا ہووے کہ جس نے اپنے ساتھ اور کا قصہ قضایا[1]، مخمصا رہنے دیا
در جواب اس نے نہ لکھا خط کبھی اور سالہا نامہ میرا طاقِ نسیاں پر پڑا رہنے دیا
تیرہ روزی پر مری کب کی نگاہِ التفات سرمہ ہی آنکھوں میں کافر نے گھلا رہنے دیا
مصحفی کن آنکھوں دیکھوں واں رقیبوں کا ہجوم
جس زمیں پر میں نہ اپنا نقشِ پا رہنے دیا

61

صبحِ محشر میں بھی یہ معجزہ پایا نہ گیا بختِ خوابیدۂ عاشق کو جگایا نہ گیا
سامنے آکے لگا جب وہ چھپانے منھ کو منھ چھپایا تو ولے اس سے چھپایا نہ گیا
آتشِ عشق سے شاید وہ ہوا تھا پیدا شعلۂ برق جو باراں سے بجھایا نہ گیا
ضعف یہ تھا ترے بیمار کو عیسیٰ کے حضور سرِ تعظیم بھی بالیں سے اٹھایا نہ گیا
وادیِ عشق میں ہم جا کے گرفتار ہوئے واں کفِ خار سے دامن بھی چھڑایا نہ گیا
تنِ نازک کو ترے بُو سے نہ پہنچے تا رنج پیرہن پھولوں کی پتی میں بسایا نہ گیا
ایسے ویرانے میں ہم جا کے ہوئے گوشہ نشیں جس میں تا خضر و مسیحا کوئی آیا نہ گیا
قدس کے پلہ میزان بھی اے غیرتِ حور بس کہ مقدار ترے حسن کا پایا نہ گیا
جی کی جی ہی میں رہی صانعِ عالم کی ہوس جیسا چاہے تھا بناوے سو بنایا نہ گیا
مصحفی کا تپِ محرق[2] میں بدن جلتا تھا
نبض کو ہاتھ مسیحا سے لگایا نہ گیا

1۔ قضایا = قضیہ کی جمع 2۔ محرق = تپتا ہوا

62

سر سے عاشق کے تری تیغ کا سایا نہ گیا
کنجِ آرام پس از قتل بھی پایا نہ گیا

آہ ہم لے گئے ساتھ اپنے عدم میں بھی یہ روگ
نقشۂ ہستیِ باطل کو مٹایا نہ گیا

منھ پہ ہم تان کفن سو رہے آخر کب تک
حالِ بد اپنا عزیزوں کو دکھایا نہ گیا

اپنے ماتھے پہ چنا حور نے افشاں تو ولے
منھ پری کا سا تری طرح بنایا نہ گیا

شرمِ کاتب نے ہمیں دور رکھا مطلب سے
تھا جو مضمون ولے وہ تو لکھایا نہ گیا

گہرِ اشکِ رواں چشم ہمیں دیتی تھی
سہل قیمت پہ تو دل ہم سے بہایا نہ گیا

پھر ہرا وصل کی شب جی تو ہوا تھا اپنا
پاسِ عصمت سے اسے ہاتھ لگایا نہ گیا

جس گھلاوٹ سے دیا آنکھ میں تو نے کاجل
سرمہ ایسا تو پری سے بھی گھلایا نہ گیا

عشق کی طبع میں انصاف زبس تھا سرِ بزم
زہر کا جام تو مجنوں کو پلایا نہ گیا

مصحفی کیوں کہ میں ہوں متہمِ صحبتِ یار
یاں تصور میں بھی اب تک کوئی آیا نہ گیا

63

بجاتا تالیاں ہر اک دلِ شیدا کے پیچھے تھا
قیامت غل غپاڑا شب ترے رسوا کے پیچھے تھا

میں مجنوں سے نہیں واقف میں شکل اس کی نہیں دیکھی
مگر وحشی سا تو اک ناقۂ لیلیٰ کے پیچھے تھا

نہ دیکھے تھا مری جانب وہ پھر کر بل بے بے رحمی
میں دیوانہ عبث اس شوخ بے پروا کے پیچھے تھا

نہیں موقوف کچھ مجھ پر ہی ایامِ جوانی میں
خراب و خوار ہر اک لولیِ دنیا کے پیچھے تھا

نہ دیتا تھا کوئی دم عشق اس کا چین جو اس کو
ہمیشہ شیخ صنعا سایہ ساں ترسا کے پیچھے تھا

مگر کوتہ قدم سے اپنے اس کو کچھ خجالت تھی
چھپا سروِ سہی جو اس قدِ بالا کے پیچھے تھا

اسی صحرا میں کھائی قیس نے اے مصحفی بازی
جہاں لیلیٰ کا ناقہ آہوے صحرا کے پیچھے تھا

64

دادخواہ آیا ہے یاں زخمی کسی کے تیر کا شور ہے صحرائے محشر میں ترے نخچیر کا
اس کے کشتوں سے عیاں ہے اس کا میواتی پنا سانگ کا مارا کوئی ہے اور کوئی شمشیر کا
تیرہ روزی دل جلوں کے سر پہ لاتی ہے بلا شمع بے کل پر نہیں ہوتا گزر گلگیر کا
سامنے چتون کے رکھ دے گر کوئی اس کی شبیہ دھیان لگ جاوے مری تصویر کو تصویر کا
ناتواں بینی پہ مجنوں کی کمر باندھے جو چرخ حلقہ چشمِ مور سے ہو تنگ تر زنجیر کا
سونے اور روپے سے سرکش رام ہوتے دیکھے ہیں نقشِ سکّہ اس پہ گویا نقش ہے تسخیر کا
دَور اس کا ہو چکا، ہے مصحفی اب میرا دَور
فرق ہے مجنوں میں اور مجھ میں جوان و پیر کا

65

کھینچتا پہلے نہ گر فرہاد رخ تصویر کا بیستوں پر کھودنا مشکل تھا جوئے شیر کا
گو پیمبر ہووے ہر انسان میں ہوتا نہیں تھا جو یوسف کا سلیقہ خواب کی تعبیر کا
قتل عاشق پر کمر باندھے گا کیا وہ نازنیں خط بھی جس کے ہاتھ سے پڑتا نہیں شمشیر کا
اہلِ بینش کو ملاوے گا یہ اک دن خاک میں دیکھ کر خاکہ کہا تھا میں تری تصویر کا
کوئے قاتل میں ہے کیا ہنگامۂ ذبحِ عظیم ہر سحر نعرے پہ نعرہ سنتے ہیں تکبیر کا
ہوں لبِ شیریں ترے گرمِ سخن جس بزم میں بند ہو جاوے دہن ہر صاحب تقریر کا
روبہ بازی سے نہیں تدبیر کی آتے بدر گرچہ ہم سمجھے ہوئے ہیں مرتبہ تقدیر کا
میں سمجھتا ہوں کرے گا یہ مجھے اپنا اسیر سر پہ یک پیچہ سجے نکلے ہے جو زنجیر کا
سلطنت پر عالمِ غفلت کے مت مغرور ہو چونکنا ڈھینا ہے قصرِ خواب کی تعمیر کا
کعبۂ مقصد سے کب لبیک کی آوے صدا حلقہ زن جب تک نہ ہو اس در پہ سر تدبیر کا
مصحفی پر کیوں پلے آتے ہو تیغا کھینچ کھینچ
قتل کرنا کب روا ہے ایسے بے تقصیر کا

66

ہاتھ سے یار کا جب گوشۂ داماں چھوٹا
ایک ساعت نہ کشاکش سے گریباں چھوٹا

چشمِ گریاں نے مری رات سماں دکھلایا
یہ انارِ گہر آگین بھی طوفاں چھوٹا

پنجۂ یار کو منہ کیوں کہ دکھاوے گا تو
صیدِ دل تجھ سے گرا ے پنجۂ مژگاں چھوٹا

تیغِ ابرو سے ترے صاف ہوا اک عالم
نہ کوئی گبر بچا اور نہ مسلماں چھوٹا

بعد مرنے کے میں احوال کہوں گا اپنا
یہ اسیرِ قفس آخر کسی عنواں چھوٹا

جیتے جی چھوڑو تو احساں ہے نہیں تو کیا لطف
مر کے زنداں سے اگر قیدیِ زنداں چھوٹا

پونچھتے پونچھتے آنکھوں کے ہوئی مجھ کو سحر
رات بھر ہاتھ سے کب گوشۂ داماں چھوٹا

کر لیا صید وونہی دل کا کبوتر اس نے
باز کی طرح جو وہ غمزۂ پنہاں چھوٹا

دل میں کچھ جوش سا ہوتا ہے یقیں ہے تم سے
خوں کا فوارہ اب اے دیدۂ گریاں چھوٹا

غم نہیں قید قفس کا ہمیں اتنا صیاد
پر یہ حسرت ہے کہ یوں ہم سے گلستاں چھوٹا

مر گیا عاشق غم دیدہ ترا خوب ہوا
رنجِ ہجراں سے تو یہ بے سر و ساماں چھوٹا

جان ہی چھوٹ گئی اپنے بدن سے یاں تو
جس گھڑی تیر کماں سے تری جاناں چھوٹا

مصحفی سرکشیِ نفس سے غافل مت رہ
قہر لایا یہ فزوں، گر سرِ میداں چھوٹا

67

رنجِ غربت میں بھی آرام بہت سا پایا
دربدر گو کہ پھرے، نام بہت سا پایا

دردِ دل سے مجھے اک دم کبھی تسکیں نہ ملی
کم ہوا صبح تو پھر شام بہت سا پایا

خوش رہیں وہ ہی زمانے میں جنھوں نے تجھ سے
مال و زر گردشِ ایام بہت سا پایا

زخمِ تن پر مرے قاتل نے نمکداں چھڑکے
مژدۂ نامہ و پیغام بہت سا پایا

رہے گردش ہی میں جب تک رہے پرواز میں ہم
چین، آتے ہی تہِ دام، بہت سا پایا

یار کے منھ سے نہ گالی ہی ملی قاصد کو اس سوا اور بھی انعام بہت سا پایا
ٹوٹ جانے میں ذرا اس کے نہیں لگتی دیر رشتۂ الفتِ دل خام بہت سا پایا
اب مری بات جو مانے تو نہ لے عشق کا نام تو نے دکھ اے دلِ ناکام بہت سا پایا
سامنے اس کے ہے کیا چارہ خموشی کے سوا میں تو ہر بات میں الزام بہت پایا
وادیِ نجد کو طے کر تو گیا مجنوں لیک فاصلہ ناقے سے ہر گام بہت سا پایا
مصحفی گرچہ نہ رکھتا تھا کچھ اسبابِ سفر
وقت چلنے کے سر انجام بہت سا پایا

68

کبھی جو ہاتھ مرا میرے اختیار میں تھا کمیتِ خامہ رواں سطحِ روزگار میں تھا
کہاں گیا تھا تو اے دل اِدھر تو آ بھائی تمام رات میں تیرے ہی انتظار میں تھا
بہارِ لالہ سب اس نے بخاک یکساں کی یہ کس کا داغ مرے سینۂ فگار میں تھا
وہاں بھی تھا ترے گھوڑے کی ٹاپ کا کھٹکا نہ جان یوں کہ میں آرام سے مزار میں تھا
خزاں کی سنتے ہی مرجھا گیا کلی سا وونہی شگفتہ غنچۂ دل موسمِ بہار میں تھا
کیا تھا گل کو گہر پوش کیا ہوا نے رات جو دانہ اوس کا سفتہ سو نوکِ خار میں تھا
مکدر اتنا نہ ہووے کوئی کہ عاشق کو لکھا تھا نامہ جو اس نے خطِ غبار[1] میں تھا
سمجھ لے عاشق و معشوق کی ہم آغوشی عذاب اور تو کیا قبر کے فشار میں تھا
نظر میں رنگ جھلکتا تھا اس کا کوسوں سے رواں جو لختِ جگر اشک کی قطار میں تھا
کہا ذبیح نے قاتل سے اپنے بعد از ذبح ''عجب مزہ تری شمشیرِ آب دار میں تھا''
گیا جو مصحفیِ زار اٹھ زمانے سے
سبھی کہیں گے کہ اک شخص یہ ہزار میں تھا

1۔ خطِ غبار : نستعلیق تحریر کا ایک انداز جس میں جلی حروف کے درمیان باریک نقطے لگائے جاتے ہیں۔

69

ہے قصد زخمِ دل کو اگر اندمال کا
مرہم لگا تو اس پہ پری کے اگال کا

ہووے نتیجہ نیک نہ ردِّ سوال کا
ہے انفعال اس کا مرے انفعال کا

آتے ہی صبح دل کو مرے آگے رکھ لیا
خالِ جبیں پیادہ بنا کوتوال کا

لالے کی سیر سے مجھے وحشت فزوں ہوئی
سمجھا میں سطحِ کشت کو میداں قتال کا

اس زلفِ پیچ دار سے دل کیوں کہ چھٹ سکے
یہ ناتواں اسیر ہے ریشم کے جال کا

نفیِ دہن سے یار کی ثابت ہوا دہن
ہو جس طرح وجود مقدر محال کا

بے وارثوں کی قدر فلک کیوں نہ کم کرے
سودا ہو نرخ سہل پہ مردے کے مال کا

زنداں میں ایسے ہم کو فلک نے کیا اسیر
روزن ہے اس میں گوئی تو چشمِ غزال کا

لکھنا ہے پیچ و تاب تری زلف کا مجھے
اب کے قلم بناؤں گا شاخِ غزال کا

اس میکدے میں خاک کوئی لب کو تر کرے
کج دار اور مریز[1] ہے ساغر ہلال کا

ہے نامِ پاک جس کا ہیولی وہی وجود
حامل ہے اتصال کا اور انفصال کا

خوش نغمگی پر اپنی نہ کر اتنی سرکشی
اندیشہ ساز کو بھی ہے یاں گوشمال کا

ہر انجمن کا ہدیہ یہ کرتی ہے بوے گل
اچھا نہیں ہے باغ میں آنا شمال کا

بے صیدِ ذبح کردہ وہ کھاتا نہیں جو گوشت
لپکا ہے اس کے سگ کو بھی رزقِ حلال کا

خوبانِ خوش خرام سے شکوہ ہے یہ کہ ہاے
کچھ دھیان بھی رکھا نہ کسی پائمال کا

چادر سپید چاہیے تابوت پر مرے
بعد از فنا بھی تا نہ ہوں ممنوں میں شال کا

تقدیرِ ایزدی پہ مرے کام ہیں تمام
میں معتقد نہیں ہوں رمل اور فال کا

جوشِ سرشک گرم میں گھبرا گیا یہ دل
عالم تھا اس میں شِیر کے از بس ابال کا

اے زلفِ یار دیکھ میں لیتا ہوں ایک دن
شانے سے انتقام ترے بال بال کا

یوسف کو تیرا حسن دکھا بول اٹھا فلک
عالم تو دیکھ اس ورق بے مثال کا

1۔ کج دار و مریز : فارسی محاورہ۔ یعنی برتن کو ٹیڑھا رکھا جائے۔ لیکن جو کچھ برتن میں ہے وہ گرے بھی نہیں۔

وصفِ کمر میں اس کی ہے مو بر زباں مدام کلکِ خیال شاعرِ نازک خیال کا
نازک دلوں کو صبح کے ہونے کی کیا خوشی شبنم کو ہے جو روز وہ دن ہے زوال کا
آتش میں شاد رہتے ہیں آتش نشیں ترے ہے ذوق تو سپند کو اک وجد و حال کا
عقبیٰ کی نعمتوں سے مجھے اشتہا ہے صاف بھوکا نہیں میں نعمتِ دنیا کے مال کا
روتا رہا ہے رات تو شاید جو مصحفی
چھپتا نہیں ہے صبح کو چہرہ ملال کا

70

امتحاں کر نہ صنم اپنے تمنائی کا کس قدر حوصلہ ہے اس کی شکیبائی کا
چاہیے نام مرا معتبروں میں لکھ دیں کہ میں خوگر ہوں بہت گوشۂ تنہائی کا
دو قدم بھی نہ دیا ساتھ مرا مجنوں نے جھوٹ کرتا تھا وہ دعویٰ مری ہم پائی کا
باغباں، نذر مری کر قلمِ نرگس تو وصف لکھنا ہے کسی چشم کی زیبائی کا
تیرہ روزی سے جلا پاوے سویدا دل کا سرمہ دینے سے فزوں حسن ہو بینائی کا
فصلِ گل سے مجھے کیا کام میں ہوں دیوانہ میں نے لوٹا ہے مزہ نکہتِ صحرائی کا
حالِ بد سے نہیں عاشق کے خبر کچھ اس کو آرسی میں ہے وہ محو اپنی خود آرائی کا
صبح دم جوں ہی کلیسا میں وہ بت آنکلا گر پڑا ہاتھ سے ناقوس کلیسائی کا
کشتۂ چشمِ سیہ کی ترے تربت ہے جہاں پانو پڑتا نہیں واں آہوے صحرائی کا
جب تجلی کی تری تاب نہ لاوے موسیٰ میں سراہوں نہ جگر چشمِ تماشائی کا
ہمرہِ بادِ صبا باغ سے جاوے نہ نکل گلِ رعنا کو ہے سودا تری رعنائی کا
ہوسِ پنجۂ خورشید پہ کیوں کر نہ ہنسوں اس کے کوچے میں نہیں دخل بھی مجرائی کا
گرد دو عالم میں پھرے لیک بہت مشکل ہے پاوے انداز صبا میری سبک پائی کا
مصحفی ہوش میں اپنے نہیں آتا اک دم
دل جو رہتا ہے خط و خال میں سودائی کا

71

وہ نہیں میں کہ صفِ جنگ سے ٹل جاؤں گا
جب ہوا سامنے مژگاں کے سنبھل جاؤں گا

زندگانی کے جو قضیے سے نکل جاؤں گا
اس گھڑی میں ترے قربان، اجل، جاؤں گا

مزرعِ دہر میں رکھتا ہوں جوانسے[1] کا میں حکم
مجھ پہ پانی بھی جو برسے گا تو جل جاؤں گا

طفلِ بدخو تو ہوں پر کوئی حسیں قیس کی طرح
گود میں لیوے گی مجھ کو تو بہل جاؤں گا

سنگ اس آتشِ سوزاں سے ہوئے موم گداز
اس کا کیا ڈر ہے اگر میں بھی پگھل جاؤں گا

کس بھروسے پہ کروں دیدِ صفائے رخِ دوست
پائے نظارہ کہے ہے "میں پھسل جاؤں گا"

دمِ بیمار ہوں کیا میرا بھروسا ہے مسیح
جب کڑی مجھ پہ پڑے گی میں نکل جاؤں گا

گل سے کہتا ہے سدا پائے نگاریں تیرا
اپنے تلووں کے تلے تجھ کو مسل جاؤں گا

سفرِ مرگ پہ بیٹھا ہوں کمر باندھے ہوئے
مصحفی دیر نہیں آج ہی کل جاؤں گا

72

نہ میں صحرا میں نہ گلشن کو نکل جاؤں گا
خوگرِ شہر ہوں یاں خاک میں رل جاؤں گا

وہ تو پہچانے گا آواز میری، اس کُو میں
گو فقیرانہ میں سب بھیس بدل جاؤں گا

دستگیری مری لازم ہے تجھے، اے شعلے!
شمع کا اشک ہوں میں آپ ہی سنبھل جاؤں گا

بہلے[2] ریشم کے پنھاوے کوئی ہاتھوں میں مرے
چمنِ وصل میں چننے کو میں پھل جاؤں گا

چشمِ بیمار کا اس کی ہوں میں بیمار، مسیح!
حق تعالیٰ جو سنبھالے گا، سنبھل جاؤں گا

کہہ دو یاروں سے مرا فکرِ کفن کر رکھیں
میں وہ بیمار نہیں ہوں کہ سنبھل جاؤں گا

کود پھاند آتی ہے مجھ کو بھی صنم لکڑی میں
تو اگر آئے گا پالٹ[3] میں اچھل جاؤں گا

1۔ جواسا = جوانسا: ایک خودرَو گھاس جس کے لیے پانی مضر ہے   2۔ بہلہ: دستانہ

3۔ پالٹ: (پٹے بازوں کی اصطلاح) وہ ضرب جو حریف کے پانو پر ماری جائے۔

کام میں اپنے مجھے دعویِ فرہادی ہے — ایک دن دیکھنے شیریں کا محل جاؤں گا
اے فلک کیا مری قسمت میں لکھا ہے تو نے — خوابِ آرام میں مَیں بھی کوئی پل جاؤں گا
رنگ بدلے گا اگر مجھ سے زمانہ، کیا غم — میں بھی توتے کی طرح دیدے بدل جاؤں گا
ہجر میں موت بھی آوے گی تو راحت ہے مری — قلق دل سے تو بارے میں نکل جاؤں گا
زندگی مثلِ سمندر ہے مری آتش میں — اس سے نکلا تو اسی وقت میں جل جاؤں گا
مجھ کو احباب پنھاویں گے تمامی[1] کا کفن — شادیِ مرگ میں پوشاک بدل جاؤں گا
روئے خوش حشر میں بھی گر نظر آیا تو میں شوخ — سامنے داورِ محشر کے مچل جاؤں گا
اس کا کچھ ڈر نہیں بھاگے گی یہ جتنی مجھ سے — میں بھی دوڑا ہوا دنبالِ اجل جاؤں گا
رخ برافروختہ اے شمع نہ رکھ مجلس میں — پر پروانہ نہیں ہوں میں کہ جل جاؤں گا
برق ترسیدہ میں کودک ہوں نہ چمکا تلوار — مان کہنا مرا قاتل کہ دہل جاؤں گا
بعدِ مردن بھی کوئی تا نہ کرے میرا سراغ — باہر اک دن میں لحد سے بھی نکل جاؤں گا

کچھ میں جرأت نہیں، ہوں مصحفیِ سحر بیاں
میر و مرزا سے لڑانے یہ غزل جاؤں گا

73

دور سے آیا ہوں میں اور ہے ارادہ دور کا — داعیہ ملکِ سلیماں پر ہے پائے مور کا
میں وہ مجرم ہوں کہ جو آنسو ٹپکتا ہے مرا — وہ بھی ہے گویا کہ اک دانہ سبہ انگور کا
نور وہ موسیٰ کی نظروں میں سما سکتا ہے کب — پھٹ گیا جس نور سے فوراً کلیجا طور کا
دافعِ رنجِ سلاطیں کب ہے طبعِ روزگار — آج تک نکلا نہیں مُوچینیِ فغفور[2] کا
انفعالِ بادہ نوشی کیوں وبالِ جاں نہ ہو — سرنگوں رہتا ہے کاسہ نرگسِ مخمور کا
ہاتھ میں جاتے ہیں اس کے سب کے افرادِ سوال — حال کچھ کھلتا نہیں منظور و نا منظور کا
بنتی ہے مینے کی پتی لعلِ لب کی لال پھول — اور سراپا جسم ہے تیرا شجر بلّور کا

1۔ تمامی : ایک سنہری کپڑا 2۔ فغفور : چین کے بادشاہ کا لقب

مصحفی پھر رہ گیا کیا خاک لطفِ زندگی
سیم و زر پر جب نہ پہنچا ہاتھ بے مقدور کا

74

ہے شوق اس کو جو آنکھوں میں مری چکّر کا — یہ طفلِ اشک بھی لونڈا ہے کیا رفوگر کا
خدا کے واسطے ظالم تو ذبح کر مجھ کو — گلا ہے کب سے مرا تشنہ آبِ خنجر کا
یہ چاہیے کہ کبوتر بھی ماہ رُو بھیجوں — کہ ماہ رُو کو مرے شوق ہے کبوتر کا
ہے ایک تاجِ فقیری و افسرِ شاہی — زیادہ مرتبہ سر سے نہیں ہے افسر کا
یہ گردباد نہ سمجھو کہ وجد میں آ کر — ہماری خاک نے باندھا ہے ڈول چکّر کا
ہزار داغ ہیں اب اس پہ نعلِ سوزاں کے — جو سینہ تھا کبھی حامل نہ ایک اخگر کا
نہ خضر اس کے نہ آبِ بقا ہی آیا کام — اجل سے چل نہ سکا زور کچھ سکندر کا
وہ نالہ نوک زباں پر ہے تیرے عاشق کی — کہ جس کے ہاتھ میں دامن ہے شورِ محشر کا
نہ شخص پنبہ دہن سے ڈرے زباں آور — ملاحظہ نہیں آتش کو آبِ گوہر کا
کوئی یہ ساقیِ مجلس سے کہہ دو آوے گا — کبھی ہمارے بھی حصے میں دور ساغر کا
جہاں میں زندہ رہے گا نہ کوئی اہلِ کمال — اگر ہے طور یہی چرخِ سفلہ پرور کا

فراق میں تو دل مصحفی کا حال نہ پوچھ
جلا ہوا نہیں ایسا سپند مجمر کا

75

پاتا ہوں اس کے حسن کو مائل حجاب کا — ہے ان دنوں ستارہ چمک پر نقاب کا
اب پھر ہوا ہے شوق اسے گلگوں نقاب کا — نزدیک ہے شفق میں غروب آفتاب کا
اس گل کی وہ صفا نہ وہ عالم شباب کا — رخ پر غبار خط کا ہے تختہ گلاب کا
کیا غم ہے دل جلوں پہ جو وہ رو ترش کرے — کھٹے سے ذائقہ ہو فزوں تر کباب کا

ہم خو گرفتہ نشۂ نامرد کے نہیں
کرتا ہے دل سخی ہمیں پینا شراب کا

ہے بیم تیغِ موج یہاں تک کہ آب سے
گردن نکالتا ہی نہیں سر حباب کا

غمگین کیوں ہوں اپنی نگوں طالعی سے ہم
بوے نشاط دیوے ہے رنگ انقلاب کا

یکپاش شب گزشتہ تلک کوے یار میں
پیچھا کیا ہے دل نے مرے آفتاب کا

کھلتے ہی گل جو شاخ پہ پژمردہ ہوگئے
دکھلایا کس کے حسن نے عالم شباب کا

شبنم سے میرے سبزۂ تربت کی ہے نمو
یہ انتظار کش نہیں رشحِ سحاب کا

گر میں نے شب کو رو بہ فلک نالہ سر کیا
رجعت کا، تیر تیر بنے گا شہاب کا

مژگاں جھکی پڑیں ہیں نگاہیں ہیں اونگھتی
آنکھوں کو تیری آج ہے کچھ میل خواب کا

چوٹی کا دھیان ساتھ ہے ڈر ہے کہ جسم زار
طعمہ لحد میں ہووے نہ مارِ عذاب کا

ابرو پر اس نے اور بنائی ہیں ابروئیں
پایا ہے کلکِ صنع نے موقع جواب کا

مرغانِ رودمیر[1] کا ہے حال جاے رحم
موسم ہے اب کے سال پچھیتا[2] گلاب کا

از بس کتابِ عشق کی ہے ایک داستاں
خالی مقام اس میں نہیں فصل و باب کا

اوراقِ گل صبا سے نہ ہوں کیونکہ منتشر
شیرازہ کھل گیا ہے چمن کی کتاب کا

سورج سے بھی نہ آنکھ جلے جس کی مصحفی
ذرہ ہوں میں وہ خاکِ درِ بوتراب کا

76

رہتا ہے عیش مردمِ آبی کو آب کا
منھ دیکھنا مضر ہے جہانِ خراب کا

چہرہ تمام شرم ترا اے تمام شرم
اول ورق ہے حسنِ ادب کی کتاب کا

اللہ رے خوش نصیبیِ عاشق کہ وہ غریب
پاتا ہے موجِ بحر میں عالم سراب کا

ہر شب نفس شماری میں کٹتی ہے اپنی رات
آتا ہے دن تو روز ہے وہ بھی حساب کا

ہرگز نہ نزع کا ہو سبک روح پر عذاب
دم توڑنا کسی نے نہ دیکھا حباب کا

1۔ رودمیر: بڑا دریا؟ 2۔ پچھیتا: دیر سے بوئی جانے والی فصل

سیماب وار اس میں ہے دیکھے جو زندگی تسکینِ دل میں نام رکھا اضطراب کا
روے سیہ سے رنگوں ہوں موے سپید کو نسخہ یہ میرے ہاتھ لگا ہے خضاب کا
اہل صفا کا چاہیے بستر ہو نرم تر تب تو مکاں روئی میں ہے دُرِ خوش آب کا
عارض کبود ہووے نہانے میں موجِ آب گر منھ پر اس کے قمقمہ توڑے حباب کا
ایذاے جاں ہے سوزشِ تبخالِ لب مجھے بوسہ لیا تھا آتشِ لعل مذاب[1] کا
کس رشکِ گل کے باغ میں آنے کی ہے خبر خیمہ کھنچا ہوا ہے چمن پر سحاب کا
محروم ہی رہا سرِ فتراک بستہ آہ بوسہ نہ پانو کا ہی لیا، نے رکاب کا
خالِ دہانِ یار سے پیدا ہے مصحفی
نقطہ جو شک کا تھا وہ ہوا انتخاب کا

77

رکھا جو پھول کان میں اس نے گلاب کا مریخ سے قِران ہوا آفتاب کا
مضمونِ ناز تھے جو گراں، مرغِ نامہ بر حامل نہ ہوسکا مرے خط کے جواب کا
یاروں سے اپنے ہو کے جدا میں ہوا تباہ آوارہ جس طرح کہ ورق ہو کتاب کا
بحرِ جہاں میں رہنے کی تا دیر کیا خوشی صد سالہ زندگی بھی ہے وقفہ حباب کا
حمال آفتابی ہے اس گل کا آفتاب لینا ہلالِ عید نے سیکھا رکاب کا
نرگس کی آنکھ مجھ کو خوش آئی وہ باغ میں انداز جس میں تھا تری چشمِ عتاب کا
کل شیخ کوے یار میں پہنچا گیا مجھے ہاں یہ عمل تو اس سے ہوا ہے ثواب کا
دکھلا کے مصحفی کو منھ اپنا چھپا لیا
کُشتہ ہوں میں تو یار کے اپنے حجاب کا

78

اے صورِ قیامت تُو جگاتی ہے ہمیں کیا سونے دے ذرا خوب، ستاتی ہے ہمیں کیا

1۔ لعل مذاب: پگھلا ہوا عقیق، مجازاً محبوب کے لب

دنیا ہے جگہ رونے کی، نے جائے تبسم
طفلی میں اے بھائی تو ہنساتی ہے ہمیں کیا

اے روح، تھے ہم واں تو پرے عیب سے بالکل
یاں آئے پہ تُو عیب لگاتی ہے ہمیں کیا

یوں آئنۂ دل کو جو ہم گھور رہے ہیں
اس میں تری صورت نظر آتی ہے ہمیں کیا

''اک آن میں ہو جاؤں گی میں صبح'' یہ کہہ کر
ہر دم تو شبِ وصل کڑھاتی ہے ہمیں کیا

جانِ بہ گلو آمدہ جاتی ہے تو جا بھی
گھر گھر کی یہ آواز سناتی ہے ہمیں کیا

شب بزم میں یہ شمع سے کہتے تھے پتنگے
جلتی ہے تو آتش میں جلاتی ہے ہمیں کیا

غنچہ کوئی تازہ سا لے آ، بادِ بہاری
بوئے گلِ پژمردہ سنگھاتی ہے ہمیں کیا

ہر چند کہ ہم پانو پڑیں ہاتھ بھی جوڑیں
خاطر میں رعونت تری لاتی ہے ہمیں کیا

اے مصحفی ہیں تکیہ کیے اب تو خدا پر
دیکھیں تو یہ تقدیر دکھاتی ہے ہمیں کیا

79

ایسا بھی اتفاق زمانے میں کم ہوا
قاصد کو موت آئی جو نامہ رقم ہوا

پہنچا جو صدمہ دل کو تو وہ داغِ غم ہوا
سینے میں درد رک جو گیا سو الم ہوا

دو چار دن کی ہستیِ وہمی کا کیا وجود
آیا جو یاں عدم سے وہ آخر عدم ہوا

گر قتل ہو گیا کوئی تو اس کا غم نہ کھا
خوں پی کے نیمچہ تو ترا تازہ دم ہوا

بالیدگیِ پہلوئے چپ کی ہے یہ دلیل
شاید کہ ان دنوں مرے دل کو ورم ہوا

اے خضر کیا ہوا ہی زمانے کی پھر گئی
آبِ حیات بھی جو مرے حق میں سَم ہوا

کس کی گلی ہے یہ کہ جہاں رکھتے ہی قدم
ہر ہر قدم پر آگ کا شعلہ عَلم ہوا

گوشِ قبول سے جو سنے کوئی مصحفی
اک ریختہ تو اور بھی مجھ سے رقم ہوا

80

رک رک گئی سیاہی جو کاغذ بہم ہوا
نامہ ہزار خونِ جگر سے رقم ہوا

دل ٹوٹتا جو ہاتھ سے ساقی کے غم نہ تھا ۔۔۔ شیشے کے ٹوٹنے کا مجھے سخت غم ہوا
تیغ جفا سے مجھ کو وہ جب قتل کر چکا ۔۔۔ پیچھے سے پھر روانہ غزالِ حرم ہوا
ہوتا نہیں وہ گریہ قبولِ جنابِ عشق ۔۔۔ جس گریے سے کہ گوشۂ دامن نہ نم ہوا
کیا کیا نہ لعبتیں ہوئیں مشغولِ التفات ۔۔۔ طفلی میں اس صنم کو جو شوقِ صنم ہوا
مجنوں عبث لکھے ہے تو لیلیٰ کو خطِ شوق ۔۔۔ ان انگلیوں سے نامہ بھلا کب رقم ہوا
کم بخت کتنی نجد کی منزل دراز تھی ۔۔۔ ناقے کا پانو سُوج کے رستے میں تھم ہوا

میرا اور اس کا ایک ہے دل کب سے مصحفی
اس کو بھی غم ہوا جو مجھے کچھ الم ہوا

81

وا کس کے رخ پہ طُرّۂ پُر پیچ و خم ہوا ۔۔۔ جو زایچے میں رات بڑھی روز کم ہوا
عاشق تو وقتِ وصل بھی حرماں نصیب ہے ۔۔۔ دستِ سبو نہ گردنِ مینا میں خم ہوا
کیوں اہلِ شرع حشر کا رکھتے ہیں دغدغہ ۔۔۔ پھر بازگشت اس کو وہیں جو عدم ہوا
آخر مرا حساب سے اس ضربِ تیغ کی ۔۔۔ دل خوں ہوا پہ حاصلِ جذر اصم[1] ہوا
قاصد تو جا کہ شدتِ سرما ہے ان دنوں ۔۔۔ کب دستِ رعشہ دار سے نامہ رقم ہوا
پھولی پھرے ہے بلبلِ شیدا چمن کے بیچ ۔۔۔ شاید کوئی گلاب کا تختہ قلم ہوا
بس تُو ہی رہا صنما ہم کہاں رہے ۔۔۔ آئینہ تیرے ہاتھ میں آیا ستم ہوا
قابل علاج کے نہ رہا اپنا جب مرض ۔۔۔ تب حضرتِ مسیح کا ہم پر کرم ہوا
سیری تو یوں بھی اُس سے نہ تھی وقتِ فربہی ۔۔۔ جب پٹ پڑی تو اور غضب وہ شکم ہوا
جس میں ثنا لکھی ترے رخسار و چشم کی ۔۔۔ نسخہ وہی حدیقہ، وہی جامِ جم ہوا
ہے کون بت پرستیِ عاشق سے مطلع ۔۔۔ جب سامنے خیالِ رخ آیا صنم ہوا
نومید راہِ پُر خطرِ کعبہ سے پھرے ۔۔۔ ہم کو نصیب ہی نہ طوافِ حرم ہوا

1۔ جذر اصم: ریاضی کی ایک اصطلاح (irrational root)۔

گر قتل اب کرے نہ کرے اس کا غم نہیں چہرہ تو اس کا سرخ بوقتِ قسم ہوا
آئی شبِ وصال تو رنجش ہی میں کٹی بیٹھے تو ایک جا پہ نہ خلطہ بہم ہوا
مجنوں سے پانو کم نہ پڑا راہِ عشق میں میں بھی رواں جو ساتھ قدم بر قدم ہوا
قاضی نے سر کو ڈال لیا اپنے جیب میں کُشتے کا اس کے محضرِ خوں جب رقم ہوا
یوسف جمال ڈوب مرے اس میں سیکڑوں چاہِ ذقن میں اس کے جو پانی اگم[1] ہوا

ہے مرد تو خدا سے بھی ہرگز تو کچھ نہ مانگ
کب کفچہ مصحفی کفِ اہلِ ہمم ہوا

82

اے ستم کشتہ، گرفتارِ خط و خال ہے کیا مصحفی یہ تو بتا تُو ترا احوال ہے کیا
لگ چلوں ہوں کبھی رستے میں جو اس شوخ سے تو منھ پھرا کر یہی کہتا ہے کہ تو مال ہے کیا
الجھے بالوں کے تصور میں جو رہتا ہوں مدام میں ہی جانوں ہوں مری جان کو جنجال ہے کیا
تیرِ مژگاں ترا سورج سے یہی کہتا ہے ڈھال گینڈے کی میں توڑی ہے تری ڈھال ہے کیا
بن نچوڑے ہوئے گرتے ہیں جو اس سے قطرے لکۂ ابر مری چشم کا رومال ہے کیا
خوں رگوں سے جو مرے تن کی کھنچا جاتا ہے نشتر اس نوکِ مژہ کا سرِ قیفال[2] ہے کیا
خوش خرامی پہ نہ مغرور ہو اے کبک دری اس کی رفتار کے آگے یہ تری چال ہے کیا
فصلِ گل میں مجھے جس سال ہوا تھا سودا پھر جنوں جوش پر آیا یہ وہی سال ہے کیا
نہ دبا دانتوں سے یوں دل کی کلی کو میرے عاقبت دل ہے مری جان یہ منہنال[3] ہے کیا
ہاتھ فرصت نہیں پاتا ہے مرا اک ساعت سینہ کوبی تو شبِ ہجر کی گھڑیال ہے کیا
اس کے چہرے ہی کے رہتا ہے مقابل شب و روز دیکھیو آئنہ بھی صاحبِ اقبال ہے کیا
ابرِ رحمت نے تو سو دفترِ عصیاں دھوئے سامنے اس کے مرا نامۂ اعمال ہے کیا

1۔ پانی اگم ہونا: پانی گہرا، اتھاہ ہونا۔ انیس نے پانی آب و تاب کے معنی میں اکثر استعمال کیا ہے۔
2۔ قیفال : فصد 3۔ منہنال : ایک چھوٹی نلکی جو حُقے کی نے پر لگاتے ہیں۔

مصحفی در سے امیروں کے گدائی مت کر
ملک درویشی کا سلطاں ہے تو کنگال ہے کیا

83

دل مرے سوگ میں مت کر تو برادر مَیلا
یاں سمجھ جاتے ہیں ہوتا ہے جو تیور مَیلا

شمع و فانوس سے یہ رمز کھلی ہم پر رات
جس کا دل صاف ہو رہتا ہے وہ اکثر مَیلا

اجلی پوشاک ہو جن کی وہ نہ بیٹھیں ہم پاس
فرش ہم خاک نشینوں کا ہے یکسر مَیلا

سامنے چہرۂ روشن کے ترے چاندنی میں
نظر آتا ہے رخِ ماہِ منوّر مَیلا

مہ خجل ہو کے ہوا ابر غباری میں نہاں
رات دیکھا تھا دوپٹّا ترے سر پر مَیلا

دل میں ہو آگ بھری جس کے نہ رنگ اس کا جلے؟
سنگِ چقماق کا ہوتا ہی ہے پتھر مَیلا

آج دھبّا تری پوشاک میں آتا ہے نظر
یہ تجھے ہاتھ لگا کس کا سمن بر، مَیلا

مشقِ خوں ریزیِ مردم رہی آنکھوں کو تری
نگہِ ناز کا کس دن ہوا خنجر مَیلا

تھا جو نامے میں مرے سوختگی کا مضموں
ہو گیا باندھتے ہی بالِ کبوتر مَیلا

وصل کی شب بھی جو آئی تو بہانہ یہ کیا
مجھ کو مت ہاتھ لگانا، ہے مرا سر[1] مَیلا

بے ثباتی کا ہوا رنگِ شہاں کی میں مُقر
دیکھ کر چہرۂ تصویر سکندر مَیلا

نامہ بر، دیجو سمجھ کر اسے نامے کو مرے
خط ہوا ہووے گا ہاتھوں میں مقرر مَیلا

مہِ کامل کے مجھے حق نے دیے ہیں طالع
شب کو اجلا ہے تو رہتا ہے وہ دن بھر مَیلا

لب کو رکھتا ہوں میں باز اس کی ہوس سے شبِ وصل
تا نہ بوسے سے ہو رخسارۂ دلبر مَیلا

جو گرفتار بلا ہیں، نہیں رہتے وہ سپید
رخت زندانی کا زنداں میں ہو اکثر مَیلا

بزمِ شادی میں تو جاتا ہے تو کر تازہ سنگار[2]
اُجلے کپڑوں پہ پہنتے نہیں زیور مَیلا

1۔ سر مَیلا ہونا : حیض کے باعث ناپاک ہونا۔ فرہنگ آصفیہ میں نازنین کا یہ شعر نقل ہوا ہے:

نہ پاؤں مَرد دوے اس بات پر بہت پھیلا
مرا خدا کی قسم اِن دنوں ہے سر مَیلا

2۔ اصل : شگار

اس میں آمیز ہوئی دل کی کدورت شاید چشم سے نکلے ہے ہر اشک کا گوہر مَیلا
جوہرِ حسن نہ تاکے کوئی تا راکھ کے بیچ رنگِ رخ رکھتی ہے اس واسطے اخگر مَیلا
میل جو شیشہ لباسی کا نہیں عاشق کو پیرہن پہنے ہے یہ غمزدہ اکثر مَیلا
کس کو دکھلاؤں زلالِ لبِ شیریں کی صفا سامنے جس کے لگے چشمۂ کوثر مَیلا
تو سبب میری کدورت کا مرے یار نہ پوچھ
مصحفی ہو نہ دلِ مفلسِ بے زر مَیلا

84

تیغِ ابرو کا ہے تیغا تری کیا ہی اچھا سمجھے قدر اس کی وہی ہو جو سپاہی اچھا
باعثِ خوبیِ غبغب ہے ملالِ غبغب حسن دیتی ہے مراتب سے یہ ماہی[1] اچھا
آہو چورنگ[2] کو آتے ہیں مدام اس کے لیے کاٹ رکھتی ہے تری تیغ تراہی[3] اچھا
چوب تعلیم ہو تا طفل مزاجوں کے لیے پیچ جوڑے کا تری پیٹھ پہ وا، ہی اچھا
تیرہ بختی کی ابھی ساخت ہے پہلی مت کڑھ رنگ چمکائے گی آخر یہ سیاہی اچھا
ہر کوئی اس کے لیے یہ ہی دعا مانگے ہے تیرا بیمار ہو جلدی سے الٰہی اچھا
کون منّت کشِ احباب ہو اتنی خاطر محضرِ خوں مرا بے مُہر و گواہی اچھا
تیرے بیمار کے جینے سے تو ہے ناک میں دم اب تو ہو جائے عدم کو جو یہ راہی اچھا
مصحفی ہوتے سلیماں کے جو سچ پوچھے تو یار
مور کے منھ پہ نہیں دعویِ شاہی اچھا

85

ہرگز مریضِ حضرتِ عیسیٰ نہیں مُوا عیسیٰ نے جس کی کی ہے مداوا نہیں مُوا

1۔ ''ماہی مراتب'' کی رعایت بھی مقصود ہے۔ (ماہی مراتب= وہ نشان جو بادشاہوں کے آگے آگے ہاتھیوں پر چلتا تھا)۔ 2۔ چورنگ: تلوار کا ایک وار۔ ایک ضرب میں چوپائے کے چاروں پیر کاٹنا۔
3۔ تراہی: شہر تراہ کی بنی ہوئی تلوار

کیوں کراماں ملے تجھے نفس حریص سے ناداں ابھی تو تیرا یہ کتّا نہیں مُوا
صورت کو اپنی دیکھ کے تم آئنے میں آپ جیتے رہو تو جانوں میں بے جا نہیں مُوا
ڈالی ہے چیں جبیں پہ جو اس پُر غرور نے کیا اس ادا کو دیکھ کے بندا نہیں مُوا
آئی ہے آفت اس کے دلِ داغدار پر طوفاں میں ڈوب نوح کا بیٹا نہیں مُوا
ہر ایک بات سن کے مری تلخ کیوں نہ ہو تُو ہے جواں ابھی ترا پِتّا نہیں مُوا
بعضوں نے اس کو دار پہ کھینچا ہے بے گناہ بعضوں کا ہے گماں کہ مسیحا نہیں مُوا
ہر گوشہ فرش ہے بہ گلِ آدم بہ زیرِ پا گھر کون سا ہے جس میں کہ مردا نہیں مُوا
پیری نے گرچہ پھیر دی ہے منھ پہ مردنی شکرِ خدا کہ دل مرا اصلا نہیں مُوا
دنیا میں جس کی قبر پہ کرتے ہیں لوگ عرس وہ شخص زندہ پیر ہے، گویا نہیں مُوا
رکھتا نہیں ہے پنجہ کوئی اس کی خاک پر جو دیکھ کر وہ دستِ محنّا[1] نہیں مُوا

مسند نشینِ ریختہ جب تک ہے مصحفی
جیتا ہے میؔر دردؔ بھی سوؔدا نہیں مُوا

86

وارد اک شب جو گُہر پوش ہو جانانہ ہوا گھر مرا ایک ہی صورت سے صنم خانہ ہوا
کر نشاں مجھ کو بہت شاد وہ جانانہ ہوا تیر جو دل پہ لگا میرے سو پر خانہ ہوا
لوگ بہلول کو کہتے ہیں کہ دیوانہ ہوا جتنا دیوانہ ہوا اتنا ہی فرزانہ ہوا
کچھ کہا آج تو کچھ کل کی بھی خاطر رکھا ایک شب میں نہ تمام اپنا جب افسانہ ہوا
مائلِ بادہ جو تھا قالبِ خاکی میرا گر ہوا خشت تو خشتِ خمِ میخانہ ہوا
چھوڑ گلشن کو میں ناچار رہِ صحرا لی چوبِ گل سے نہ علاجِ دلِ دیوانہ ہوا
اور سرگرم کیا اس طرح کشش نے مجھ کو اتنا میں یار ہوا جتنا وہ بیگانہ ہوا
دل میں سو خار الم چبھنے لگے یاں میرے واں کسی رات جو چوٹی میں تری شانہ ہوا

1۔ محنّا: حنا یعنی مہندی لگا

دانۂ اشک کو میں خاک میں بویا سو بار — نہ ہرا فصلِ بہاری میں بھی یہ دانہ ہوا
مفلسِ رند وہ ہوں میں جسے مے پینے کو — نہ میسر کبھی جز ہاتھ کے پیمانہ ہوا
دست گستاخ کو اپنے میں چبا ڈالوں گا — ٹوٹی سمرن کا تری کم جو کوئی دانہ ہوا
چمنِ حسن کھلا اور بھی شامِ شبِ وصل — متوجہ جو بناؤ اپنے کا جانانہ ہوا
گل کی پتی تو ہوئی بالی میں ان کانوں کی خرچ — صرف رسکوک[1] میں شبنم کا ہر اک دانہ ہوا
شہر میں مجھ سے بھڑکتا تھا تصور تیرا — اس کی تسخیر کو میں ساکنِ ویرانہ ہوا
واقعی ترکِ تعلق کو الم لازم ہے — بے تعدی تو جدا کاہ سے کب دانہ ہوا
بعد جل جانے کے پیدا مری خاکستر سے — یا تو ققنس[2] ہی ہوا یا کوئی پروانہ ہوا

مصحفی کیوں کہ اسے یوسفِ ثانی کہیے
جس کا ثانی ہی جہاں میں کوئی پیدا نہ ہوا

87

کیوں پھڑکتا ہے اس میں، اسے آزار ہے کیا — یہ تو پوچھو ہوسِ مرغِ گرفتار ہے کیا
نالۂ گرم جو اس ڈر سے نہیں کر سکتا — برگِ گل مرغِ چمن کے تہِ منقار ہے کیا
نہیں خورشیدِ قیامت کا جو مطلق خطرہ — سر پہ عاشق کے ترا سایۂ دیوار ہے کیا
ہم بھی بیٹھے ہیں سفر کرنے پر، اے ہم نفسا! — کوئی لاؤ تو خبر قافلہ تیار ہے کیا؟
مصر کو چھوڑ کے آئی ہے جو ہندستاں میں — میرے یوسف کی، زلیخا! تو خریدار ہے کیا
یار ہوتا ہے جو اک دم بھی نظر سے پنہاں — چین پڑتا ہی نہیں مجھ کو یہ اسرار ہے کیا
دل کی خواہش ہے صنم، یا طلبِ جاں، سچ کہہ — لا کے حاضر کروں وہ بھی تجھے درکار ہے کیا
کبک و طاؤس و کبوتر ہیں سبھی محوِ خرام — کوئی کیا جانے ترا شیوۂ رفتار ہے کیا
ہم کو اک عمر اسیریِ قفس میں گزری — ہم نے جانا ہی نہیں یہ گل و گلزار ہے کیا

1۔ رسکوک (جوہریوں کی اصطلاح) مرجان، جھوٹا موتی 2۔ ققنس: ایک خوش رنگ، خوش آواز پرندہ۔ کہتے ہیں اس کی چونچ میں 360 سوراخ ہوتے ہیں ہر ایک سوراخ سے ایک راگ نکلتا ہے۔

غیرِ تشخیص ہی عیسیٰ نے دوا اس کی لکھی یہ نہ سمجھا کہ علاجِ دلِ بیمار ہے کیا
اس قدر صحبتِ مستاں سے نہ رک، اے زاہد توبہ جب توڑی تو مے پینے سے انکار ہے کیا
پاے پُر آبلہ میرے یہ سمجھتے ہی نہیں نوک سبزے کی کسے کہتے ہیں اور خار ہے کیا
مصحفی در کو کھلا تو نے جو رکھا اس شب
تجھ سے آنے کا کسی شوخ کے اقرار ہے کیا

88

کیا کہوں میں جو شبِ وصل کا انداز ہوا ہو چکی جنگ تو پھر صلح کا در باز ہوا
وقت گانے کے وہ شب شعلۂ آواز ہوا ناز کرنے پہ جو آیا ہمہ تن ناز ہوا
چھاتی آئینے کی کیوں کر نہ سراہے کوئی گہ دوچارِ نگہِ حوصلہ پرداز ہوا
لب پہ مسّی جو ملی اس نے دکھائی شبِ وصل منھ جو کھولا تو وونہی صبح کا آغاز ہوا
کہیو اے بادِ صبا، گل سے نہ دیکھے مری راہ آشیاں اب تو مرا چنگلِ شہباز ہوا
آرسی ہاتھ میں ہر لحظہ رہی واں حائل کب میں ممنونِ نگاہِ غلط انداز ہوا
ہم صفیروں سے رہا اپنے میں پیچھے اے واے گم مرے ہاتھ میں سررشتۂ پرواز ہوا
سب ہیں مداح ترے خورد و بزرگِ عالم شکر کر شکر کہ لاکھوں سے تو ممتاز ہوا
مصحفی ریختہ و فارسی میں تُو تو میاں
''طوطیِ ہند'' ہوا، بلبلِ شیراز ہوا

89

ملتفت مجھ پہ جو وہ دلبرِ طنّاز ہوا تو وونہی صبحِ شبِ وصل کا آغاز ہوا
روبرو یار کے کر بات مری بچلا[1] دی تم سے یہ کیا غضب اے طالعِ ناساز ہوا
شرمِ الفت سے خموشی ہے مری ورنہ صنم سرمہ کس روز ترا دشمنِ آواز ہوا

1۔ بچلانا: ضد کرنا، بھلا دینا

بسترے سب کے برابر ہی لگے واں دیکھے مجلسِ خاک میں اک مردہ نہ ممتاز ہوا
سب کو نامے میں لکھا اُس بتِ کافر نے سلام آئی نوبت جو مری، میں قلم انداز ہوا
آنکھ آئینے میں لڑتی ہے تری عکس کے ساتھ کون ہے وہ جو ترا محرم و ہمراز ہوا
ہوش اڑ جاویں گے اے مرغِ گلستاں تیرے
گر اسیرِ قفسی زمزمہ پرداز ہوا

90

پردۂ شرمِ رخ یار سے جب باز ہوا عکس سے آنکھ لڑی، آئنہ ہمراز ہوا
درِ قفس کا نہ مرے منھ پہ کبھی باز ہوا اور ہوا بھی تو وہیں چنگلِ شہباز ہوا
رہے خاموش مرے سامنے مرغانِ چمن ایک کا وا نہ لبِ زمزمہ پرداز ہوا
کامِ دنیا سے میں محروم رہا یا قسمت کام میرا نہ کبھو طالعِ ناساز ہوا
یار اگر خواب میں آیا تو ہوا وصل نصیب لیک پھر آنکھ کا کھلنا خللِ انداز ہوا
دو گھڑی بیٹھ کے باہم نہ کبھی باتیں کی مانعِ لطف و کرم عشوہ ہوا، ناز ہوا
لختِ دل نے وونہی مژگاں کو کیا گلدستہ راغبِ سیرِ چمن جب کہ وہ گلباز ہوا
نفی و اثبات کا ہنگامہ رہا اُس کُو میں کوئی مارا گیا اور کوئی سرافراز ہوا
دم کشی خوب نہیں اتنی بھی اے مرغِ چمن آشیاں سوختۂ شعلۂ آواز ہوا
مصحفی تو، تجھے میخوار نہ سمجھا تھا ولے
رنگ سرخی کا تری چشم کی غمّاز ہوا

91

گلی سے یار کی قاصد مرا شتاب آیا جواب صاف ملا خط کا یہ جواب آیا
نگاہِ عکس سے جس کو کہ اجتناب آیا وہ کیوں کہ سامنے مردم کے بے نقاب آیا
جو کھولی زلف، قمر پیچ سنبلے کے گیا جو بیٹھا تل دہ ترازو میں آفتاب آیا

اگر تم آنکھ لڑانے کو عیب جانتے تھے نہ آرسی سے بھلا کیوں تمھیں حجاب آیا
تو ہمدموں سے جدا رہ کہ ٹوٹ جاتا ہے حباب کے جو قریں دوسرا حباب آیا
گلی میں یار کی جا کر جو غش کیا میں نے گلاب پاش لیے وہ بالاضطراب آیا
تو چھوڑ اب تو اسیرِ قفس کو اے صیاد کلی چٹکنے لگی، موسمِ گلاب آیا
خدا کے واسطے تھام اب تو ہاتھ، اے قاتل کہ کشتگاں کے ترے خون تا رکاب آیا
میں اور بوسے لیے اس کے خوب دم دے[1] کر وہ اپنے بوسوں کا کرنے جو شب حساب آیا
پڑا تھا پردۂ غفلت تو آپ جانتے تھے کھلی جو آنکھ تو عالم نظر سراب آیا
ہزار سال کے بعد آئی گر کسی کی اجل وہ سمجھا بس یہی، دن مرگ کا شتاب آیا
جنازے سے ترے کُشتے کے اذنِ عام کے بعد وہ کون تھا جو نہ بادیدۂ پُر آب آیا

اُدھیڑ بُن سی رہی مصحفی جو صبح تلک
شبِ فراق میں مطلق نہ مجھ کو خواب آیا

92

ہم سروِ رواں ہوتا، ہم آبِ رواں ہوتا گر یار بھی گلشن میں ہوتا تو سماں ہوتا
یہ حسن کے عالم کا جادو ہے وگرنہ یوں آئینہ ترے رخ پر پہروں نگراں ہوتا؟
آغوش میں لینا تو دشوار ہے خوباں کا کاندھے پہ تو رہتا جو آغوش کماں ہوتا
گر ڈالتی آنکھ اس پر اک ناز سے تو لیلیٰ مجنوں کی طرح آہو سرگرمِ فغاں ہوتا
فاقے ہی مقدر تھے ازبس مری قسمت میں شعلہ بھی جو میں بنتا تو صرف دخاں ہوتا
کوچے کی طرف تیرے قاتل ترے کشتے کے گر پانو نہ چلتے تو سر آپ رواں ہوتا
بیمارِ محبت نے عیسیٰ سے نہ پوچھا کچھ پرہیز کو کہتا تو پرہیز کہاں ہوتا
ہے قہر شتاب اتنا رسوائی کا ہو جانا یک چند نہاں کرتے گر عشق نہاں ہوتا
بیمار جدائی کو کچھ تو نظر آتا ہے یوں خط پہ تو خط اس کو ہرگز نہ رواں ہوتا

1۔ دم دینا : دھوکا دینا

اک مرگ سے عاجز ہیں اے مصحفی ہم ورنہ
جا تجھ کو چھڑا لاتے، تو قید جہاں ہوتا

93

نام پر جس کے کہ نقاش قلم پھیر گیا
مرتے مرتے وہ ترے کو میں قدم پھیر گیا

آ گیا لاغریِ صید پہ کیا رحم اسے
نیمچہ اس کا دمِ ذبح جو دم پھیر گیا

آیا ہستی میں عدم سے جو کوئی وہ ہرگز
آہ یاں رہ نہ سکا سوے عدم پھیر گیا

آج کچھ شادی سی شادی ہے کمانداروں میں
سرِ تیر اس کے مگر صیدِ حرم پھیر گیا

سامنے آوے گا مقدور ہے یہ رستم کا
تیر سے جس کے کہ منہ شیرِ اجم[1] پھیر گیا

رشک کی جا ہے کہ ظالم تری سرگوشی کو
طرفِ گوش تری زلف کا خم پھیر گیا

چشمِ لیلیٰ کے ترحّم کا مزہ تھا جس میں
ہم سے وہ آنکھ ہی آہوے حرم پھیر گیا

مصحفی دیر کے جانے سے نہ باز آیا تو
روبرو کھا کے مرے جھوٹی قسم پھیر گیا

94

نگاہِ لطف کے کرتے ہی رنگِ انجمن بگڑا
محبت میں تری ہم سے ہر اک اہلِ وطن بگڑا

کچھ اس کی وضع بگڑی، کچھ ہے وہ پیماں شکن بگڑا
یہ سج دھج ہے تو دیکھو گے زمانے کا چلن بگڑا

خدا کہتا تھا روزِ حشر میں تجھ سے سمجھ لوں گا
ترے تیشے سے گر شیریں کا نقش اے کوہ کن بگڑا

میں سمجھا گریہ بے تاثیر اس دم شمعِ مجلس کی
یہ موتی اشک کا جاتے ہوئے جب تا لگن بگڑا

جو چنگِ نالہ کو ہم نے اڑایا ہجر کی شب میں
کہیں گے تب کہ تیرا کھیل اے چرخِ کہن بگڑا

جسے سب بانکے اور ٹیڑھے کریں تھے دور سے مجرا
وہی رستے میں آخر ہم سے کر کے بانک پن بگڑا

تری مژگاں کے رَوات[2] چڑھ گئے جب ان سے لڑنے کو
پڑی یوناں کے اندر کھلبلی، سارا دکن بگڑا

1۔ اجم: شام کا ایک علاقہ؟ 2۔ رَوات: سپاہی، بہادر

بری صورت سے رہنا ننگ ہے دنیا میں انساں کو وہ گڑ جاتا ہے خود جیتا جو کوڑھی کا بدن بگڑا
ہمیشہ شعر کہنا کام تھا والا نژادوں کا سفیہوں نے دیا دخل اس میں جب سے بس یہ فن بگڑا
مکانِ تنگ میں پائی نہ جا کلکِ تخیّل نے بناسب خال و خط مانی سے اس کا، پر دہن بگڑا
نہیں تقصیر کچھ درزی کی اس میں مصحفی ہرگز
ہماری نادرستی سے بدن کا پیرہن بگڑا

95

دعا دینے سے میرے شب وہ ترکِ تیغ زن بگڑا سپاہی زادوں کا بھی کچھ میں دیکھوں ہوں چلن بگڑا
سخن سیدھی طرح کا، وضع سادی، بے مسی دنداں بھلا کتنا لگے ہے مجھ کو اس کا سادہ پن بگڑا
کیا تاراج یوں پیری نے حسنِ نوجوانی کو بوقتِ صبح آرائش کا ہووے جوں چمن بگڑا
سوئی جس کو لگا دی زید کی معشوقہ نے اپنی سبھی سنورے وہی مجنوں کا بس اک پیرہن بگڑا
کمالِ حسن خالق نے دیا اُس پری رو کو نہ چتون کج ہوئی اس کی، نہ گانے میں دہن بگڑا
یہ تصویریں عجب نوآب نے کوٹھی میں بنوائیں کسی کی ہے پھری ٹھوری، کسی کا ہے دہن بگڑا
نہ مارے حق کسی کو کر کے مفلس وائے رسوائی جہاں کوتہ ہوا کپڑا کفن کا، وہ کفن بگڑا
رواج اس نے نہ پایا بس کہ عہدِ زلفِ مشکیں میں دھرا نافے میں جو برسوں رہا مشکِ ختن بگڑا
عجائب اور غرائب باتیں اب سننے میں آتی ہیں خمِ نیلی ترا شاید کہ اے چرخِ کہن بگڑا
خلل انداز جو لکنت ہوئی اس کی فصاحت میں زباں پر اس بُتِ الکن [1] کے آیا جو سخن بگڑا
ہمیں تکلیفِ نظمِ شعر کی دینے سے کیا حاصل زمانہ ہم سے ان روزوں ہے یارانِ وطن بگڑا
یہ صنعت جس سے شکلِ کافرِ شیریں بنائی تھی اسی تیشے سے پھر آخر کو کارِ کوہ کن بگڑا
رہی اے مصحفی تا صبح اس کی اس پہ جھنجھلاہٹ
بنانے میں جو مشاطہ سے شب خالِ ذقن بگڑا

1۔ الکن : ہکلا

96

شب گیا بھاگ خیالِ رخِ جاناں کیسا
چھپ گیا آنکھوں کے آگے سے گلستاں کیسا

ابر رحمت ہے گلہ تجھ سے سیاہی نہ گئی
تو نے دھویا یہ مرا دفترِ عصیاں کیسا

وصل کی شب بھی یہ ٹلتا نہیں اک ساعت ہائے
سر پہ رہتا ہے کھڑا گنبدِ گرداں کیسا

ایک ساعت بھی ٹھہرتا نہیں جب موت آئی
دیکھیو خاک میں مل جائے ہے انساں کیسا

دردِ دل اور ہوا اس کی دوا سے افزوں
ہائے عیسیٰ نے کیا یہ مرا درماں کیسا

دو قدم راہ کے چلنے میں تھکے جاتے ہیں پانو
کیسی منزل ہے کڑی، ہے یہ بیاباں کیسا

کیا کہوں میں کہ رہِ عشق میں عاشق کو ترے
ابھی درپیش ہے صحرائے مغیلاں کیسا

تم تو کہتے تھے نہیں رنگِ تمنا باقی
خوں یہ پھر روتے ہیں اے دیدۂ گریاں کیسا

مصحفی شمع صفت دیر تلک دیکھیو تو
جی جلاوے گی ابھی تو شبِ ہجراں کیسا

97

ہے یہی شورِ جنوں اب کے تو زنداں کیسا
فصلِ گل کی ہے یہ آمد تو گریباں کیسا

چرخ نے یار سے سو کوس مجھے پھینک دیا
یوں بچھڑ جائے ہے انسان سے انساں کیسا

آمدِ صبحِ وطن دور نہیں کچھ اس پر
جی کڑھاتی ہے مرا شامِ غریباں کیسا

روز اک تازہ گرفتار لگا لاتا ہے
جان کے پیچھے پڑا ہے مری درباں کیسا

سرکشی مجھ سے نہ کر دیکھ تو اے ابر بہار
اب کے لاتی ہے مری چشم بھی طوفاں کیسا

جوش پر دیدۂ گریاں کو مرے آنے دے
میں رِجھاتا ہوں تجھے ابرِ بہاراں کیسا

مثلِ پروانۂ ناچیز ہم آتے ہیں یہاں
جل گئے جب تو تماشائے چراغاں کیسا

خواب میں آ کے تصور نے کہا اس کے مجھے
میں نکالا ہے ترے جی سے یہ ارماں کیسا

مصحفی یار نے شب مہ سے اٹھایا جو نقاب
رہ گیا دیکھ اسے آئینۂ حیراں کیسا

98

دن رات طفلِ اشک کبھی نورِ دیدہ تھا — اپنا بھی آشنا دلِ حسرت کشیدہ تھا
دل جس کا نام ہے وہ کبھو رزمِ عشق میں — یک قطرہ خون بر دمِ خنجر چکیدہ تھا
اب لامکاں سے بھی ہے پرے اس کی بود و باش — عرش آشیاں جو طائرِ رنگ پریدہ تھا
دامن کشاں وہ جائے تھا سیرِ چمن کو، اور — میں پیچھے پیچھے اس کے گریباں دریدہ تھا
آتی تھی رنگِ گل سے مجھے رات بوے خوں — عاشق کا کیا ترے وہ گلوے بریدہ تھا
وہ دیکھ تجھ کو شعلہ جبیں کر گیا فرار — پارہ جو پشت آئنہ پر آرمیدہ تھا
از بس حسابِ شعر سے باہر قدم رکھا — یارانِ عہد کی جو غزل تھی قصیدہ تھا
کیا وہ بھی چاو چوز[1] کے دن تھے کہ جن دنوں — گردن میں میری یار کا دستِ خمیدہ تھا
ہر ماہ میری چشم میں بن یار ماہِ نو — صدرِ فلک میں صورتِ نعلِ پریدہ تھا

کیا پوچھتا ہے حالِ دلِ مصحفی، نہ پوچھ
فرقت میں تیری بسملِ درخوں طپیدہ تھا

99

نے سبو سے جامِ صہبا بھر لیا — ڈال کر میں خُم میں مینا بھر لیا
ناقۂ لیلیٰ نے مجنوں کے وونہی — جاتے جاتے اک بکٹّا[2] بھر لیا
دی مری تصویر میرے ہاتھ میں — خوں سے جب مانی نے خاکا بھر لیا
قتل کو آیا وہ قاتل تب بہ ناز — جب گنہگاروں سے صحرا بھر لیا
چشمِ تر میں آئے جو اشکِ سپید — موتیوں سے اس نے دریا بھر لیا
اس نے دنداں زد جو کی ساعد مری — میں بھی اس کے اک چلکّا بھر لیا
مہنگی نکلی اور کہوں ارزاں ہوئی — ہر کسی نے کوٹھی کٹھلا[3] بھر لیا

1۔ چاوچوز: نازنخرے   2۔ بکٹّا بھرنا: مٹھی بھر یعنی تھوڑا سا اٹھالینا   3۔ کوٹھا، کٹھلا: گودام، کوٹھری

اس کی ہمت پر نہ کہیے آفریں اشک نے کوزے میں دریا بھر لیا
ہم صراحی ہی رہے اک ڈھونڈتے مے سے میخواروں نے مٹکا بھر لیا
مصحفی یہ ہے شگفتہ کی زمیں
تول میں پیپے کا، پیسا بھر لیا

100

کیا جانے حال کیا ہو دلِ بے قرار کا اندیشہ رات دن ہے سرِ کوے یار کا
کر لے صبا طواف ہمارے مزار کا پاوے گی پھر نشاں بھی نہ ہرگز غبار کا
میں اس کا منھ تکوں ہوں وہ تکتا ہے منھ مرا ضغطے[1] میں کام ہے دلِ امیدوار کا
کچھ دیر ہے رہائیِ مرغِ اسیر میں جاوے ابھی چمن سے نہ موسم بہار کا
تا صبح ہوتے ہم نہ بچیں گے کمانِ چرخ لٹکا ہے ہر ستارہ شبِ انتظار کا
ہو جس ورق پہ عاشق و معشوق کی شبیہ گویا مقابلہ ہے خزاں و بہار کا
باغِ ارم کا سطحہ تو ہووے نہ کوے یار ہر تختۂ زمیں ہے چمن لالہ زار کا
عارض پہ میرے پنجۂ مرجاں کے ہیں نشاں کھایا ہے میں طمانچہ جو دستِ نگار کا
قسمت تو دیکھیو میں قفس سے رِہا ہوا جب باغ میں رہا نہ چہکنا ہزار کا
رہنے کا کچھ زمیں پہ نہیں غیر نام نیک مٹ جائے گا نشاں بھی ہمارے مزار کا
یہ انتقامِ چیدنِ گل ہے، بھلا ہوا گلچیں کے ہاتھ میں جو لگا زخم خار کا
تکّے لگیں گے سیخوں پہ مرغابیوں کے روز یعنی ہوا ہے شوق اسے بحری شکار کا
غافل فریبِ ساقیِ دوراں سے تو نہ رہ شربت پلا کے دیوے ہے پھر زہر مار کا
شاہ و گدا ہیں دست خوشِ امرِ ایزدی چہرے پہ سب کے رنگ ہے یاں اعتبار کا
ورنہ خلافِ رائے حکیماں ہے یہ سخن محشر میں لیجے جائزہ مشتِ غبار کا

1۔ ضغطہ: تنگی، تکلیف

دلّی کہیں ہیں جس کو زمانے میں مصحفی
میں رہنے والا ہوں اُسی اجڑے دیار کا

101

کون ہے وہ جو نہ تربت مری ٹھکرا گزرا
کاسۂ سر پہ مرے کیا کہوں کیا کیا گزرا

سامنے سے مرے، ساقی پہ ہوا ظلم کہ رات
ہاتھوں میں اپنے لیے شیشۂ صہبا گزرا

تیری شمشیر کے جس رہ میں پڑے تھے کشتے
کبھی اس راہ سے ہو کر نہ مسیحا گزرا

طرفِ در ہی رہی آنکھ لگی صبح تلک
یار کے آنے کا شب دل میں جو کھٹکا گزرا

منھ سے منھ اپنا تصور نے لگایا تیرے
تو بھی بوسے کا مرے دل میں نہ خطرا گزرا

کیا فراست ہے وہ نظروں میں وونہی بوجھ گیا
دل میں عاشق کے اگر حرف تمنا گزرا

پانو پر اس کے کہاں آنکھیں ملیں مجنوں نے
ناقہ کس دن طرفِ دامنِ صحرا گزرا

آ گئی یاد مجھے اس کے کھلے جُوڑے کی
جب بھی بادِ سحری کا کوئی جھونکا گزرا

مصحفی کوچۂ معشوق میں رونے سے ترے
رفتہ رفتہ سرِ دیوار سے دریا گزرا

102

کوئی نظر پڑا کیا معشوقِ خوش ادا کیا
کیا جانے بیٹھے بیٹھے یہ مجھ کو ہو گیا کیا

رخ کا ترے پسینہ کوثر سے کم نہیں ہے
گلزارِ حسن میں یہ پھولے ہے موتیا کیا

کہنا بھی مان میرا نازک دماغ ہے گل
ہر لحظہ چھیڑتی ہے تو اس کو، اے صبا، کیا

جعدِ سیہ کا اس کی رہتا ہے رَنت تصور
پیچھے مرے پڑی ہے کیا جانے یہ بلا کیا

رخ سے لٹک رہے ہیں دو خوشۂ ثریا
کانوں میں اس کے جھمکے لگتے ہیں خوشنما کیا

رنگِ کفک کی سرخی کم ہو تو زندگی ہو
آتش میں پھونک دے گی تو مجھ کو اے صبا کیا

اے مصحفی جو چاہے تجھ پر جفا کرے وہ
جور و ستم کا ناداں، معشوق کے گلا کیا

103

فصلِ گل شورِ جنوں ولولہ انگیز آیا موسم آیا تو ولے طرفہ جنوں خیز آیا
دل میں عاشق کے چبھے خارتری مژگاں کے تھا یہ ناکند بچھیرا[1] تہِ مہمیز آیا
کچھ تو صدمہ ہوا لیلیٰ پہ سفر اس کے کا آج مجنوں کی طرف ناقہ بہت تیز آیا
صبح دم بسترِ راحت سے وہ جیتا نہ اٹھا خواب میں جس کے ترا خنجر خوں ریز آیا
کیا جئیں خاک کہ خوانِ کرمِ گردوں سے منھ تک آیا کوئی لقمہ تو سم آمیز آیا
زخمِ شمشیرِ نگہ حیف کہ اچھا نہ ہوا کرنے کو اس کی دوا ڈاکٹر انگریز آیا
کہہ دو شیریں سے کہ منھ اپنا دکھاوے اس کو اب تو غرفے کے تلے خسروِ پرویز آیا
زخم دل پہ مرے گلشن کی طرف سے اے وائے آیا جو باد کا جھونکا سو نمک بیز آیا
رعشۂ دست برا ہو کہیں تیرا، ہے ہے مے کا لب تک نہ مرے ساغرِ لبریز آیا
درِ خسرو پہ نہ تابوت سمجھ، اے غافل! بعدِ مرگ اس کی سواری کو یہ شبدیز آیا
کر دیا تو نے جو یکبار مجھے سودائی کچھ ترے ہاتھ بھی، اے زلف دل آویز، آیا
تیغ ابرو کا تری کاٹ غضب ہے ظالم جس کے منھ پر نہ ہلاکو ہی نہ چنگیز آیا
مصحفی یار کو دینا تھا کوئی ہاتھ سے یوں تجھ کو، ہے ظلم و ستم اس کا نہ انگیز آیا

پہنچے صائب کو یہ مژدہ کہ خبردار ہو ٹک
مصحفی ہند سے اب جانبِ تبریز آیا

104

جس نے دیا خط اس کو پڑھ کر وہ پھاڑ چیرا کچھ ان دنوں پڑا ہے ظالم کا یہ وتیرا
شیخ الحرم، مؤذن دونوں چلن کے بد ہیں یہ صبح خیزیا[2] تو وہ ہے اُٹھائی گیرا
گر یہ چمک صفا ہے تو دیکھیو شبِ مہ بخشے گا مشتری سے اس اربسی[3] کا ہیرا

1۔ ناکند بچھیرا: گھوڑے کا اناڑی بچہ جس پر ابھی سواری نہ ہوئی ہو 2۔ صبح خیزیا: چور
3۔ اُربسی: گلے کا زیور

کچھ اس کی بدزبانی تلوار سے نہیں کم　　　کر ڈالتا ہے دم میں عاشق کو ککڑی کھیرا
مثلِ برنج سادہ عارض تھے اس کے ان پر　　　خطِ سیاہ نکلا جیسے پلاو زیرا
سو تیرہ بخت عاشق خون ہوس میں ڈوبے　　　سر پر وہ سج کے نکلا جب کاکریزی[1] چیرا
عاشق کے ساتھ کینہ، قاصد، نہ تھا تو پھر کیوں　　　اس نے چھری سے میرے خط کا لفافہ چیرا
یا رب نہ لکھنؤ کو عین الکمال پہنچے
دلّی میں تھا کہ اب ہے یاں حسن کا ذخیرا

105

کھایا تھا وہ جو میں نے نکلا وہ ریزہ ہیرا　　　مرنے کے بعد میرے میرا جگر جو چیرا
نالے سے میرے جس شب گوشِ فلک کو چیرا　　　مل کر کفِ تأسف بس رہ گیا مجیرا[2]
شیطان سا بھی عاشق اللہ کا نہ دیکھا　　　آدم کو سجدہ کرنا سمجھا گنہ کبیرا
آنسو لہو کی پٹھ سے کم قدر ہو نہ تیرا　　　پاتا نہیں ہے قیمت سرجن[3] کے ساتھ ہیرا
عاشق کا دل اڑایا یوں اس نگہ نے جیسے　　　مفلس کا مال مارے صحی[4] اٹھائی گیرا
کیا کیا ہوا ہے چہرہ اس گل کا سرخ اور زرد　　　میں نے کبوتر اس کا مارا جو سبز تیرا[5]
پھرنا فلک کا تارے کھوتے نہیں کبھی تھا　　　دورانِ سر کو نافع خشخاش کا حریرا
عالم کی سرد مہری اس میں سما رہی ہے　　　ہے ان دنوں یہ سینہ ایک برف کا ذخیرا
تھی تجھ سے مصحفی کو اے گریہ یہ توقع
''آخر بہ سیل وادی بنیادِ دوستی را''

106

عاشق سے بے دماغی اس گل کا ہے وتیرا　　　سرگوشیِ صبا پھر ہونے لگی پذیرا
جو داغ ابیض اس کے پنڈے پہ چھیپ کا ہے　　　وہ جِلد کی صفا سے چمکے ہے جیسے ہیرا

1۔ کاکریزی : گہرا سرخ دوپٹہ　2۔ مجیرا : ایک ساز　3۔ سرجن : دیوتا۔ (مراد پتھر کا بُت)
4۔ صحی: چور　5۔ سبز تیرا (کبوتر کی ایک قسم)

محتاج مفلسوں کے ہوتے ہیں اہلِ دولت — بندھتا ہے بے بطانہ[1] کب باندھنوں کا چیرا
وہ وصل کے مزے کو بھولا نہیں ہے، ہے ہے — عاشق کا خون اب بھی چپکے ہے جیسے شیرا
خاک بدن تری سب پامال ہو گی اک دن — ریگ رواں بنے گا آخر کو یہ جزیرا
کیا نازکی بدن کی اس رشکِ گل کے کہیے — مسِ ہوا سے جس کو ہوتا ہے قشعریرا[2]
کھانے کا اس سرا میں ہم نے مزہ نہ پایا — بلی ڈکیت دیکھی، کتا اٹھائی گیرا
پکّوں سے مل جو پاوے کچھ زیست کی حلاوت — انگور خام شیریں دیتا نہیں ہے شیرا

رتبے کو مصحفی کے کیا کوئی سمجھے یہ ہے
ہم نظم میں ظہوری، ہم نثر میں ظہیرا

107

شبِ فراق میں مَیں آہ و نالہ کیا کرتا — زباں کو دردِ دل اپنا حوالہ کیا کرتا
جو حسن دیکھتا اے مہ وہ تیری بالی کا — تو رنگِ زرد پہ ناز اپنے ہالہ کیا کرتا
عروس دہر کو داماد کش سمجھتا تھا — میں کھا کے چوتھی کا اس کی نوالہ کیا کرتا
پڑا تھا مجھ کو تو معشوقِ زرطلب سے کام — نہ بیچتا جو میں اپنا دوشالہ کیا کرتا
دیا تھا زہر کا مجنوں کو جام نوفل نے — وہ دست ساقی سے لے کر پیالہ کیا کرتا
لکھا تھا گرچہ اثر نسخۂ مسیحا میں — کسی کے درد کا لیکن امالہ[3] کیا کرتا
زمیں سے بام پر عاشق کا کھینچنا تھا محال — وہ پھینکتا جو کمندِ کلالہ کیا کرتا
نہ سوز دل کو اثر مرہم شفا نے دیا — لگا کے میں گلِ نمناک ژالہ کیا کرتا
کچھ اس کے خوانِ عطا میں کمی نہ تھی ہرگز — کریم سے میں سوالِ نوالہ کیا کرتا

تھے مصحفی کے تئیں یاد خود قوافیِ شعر
وہ پڑھ کے جامی کا مجز بھر رسالہ کیا کرتا

1۔ بطانہ: بٹن، گھنڈی 2۔ قشعریرہ: بدن کے رونگٹے کھڑے ہونا 3۔ امالہ: مائل کرنا، یہاں علاج کے معنی نکلتے ہیں۔

108

میں دُردِ بادہ کو لے مثلِ لالہ کیا کرتا زمیں پہ گر نہ ٹپکتا پیالہ کیا کرتا
ہزار دل تھے یونہی اس کے دامِ عشق میں صید بڑھا کے بال وہ مشکیں کلالہ کیا کرتا
مقابلہ مری وحشت کا دشت وحشت میں ہوا نہ آہو سے مشکیں غزالہ کیا کرتا
چمن میں مَیں نہ گیا آپ تھا وہ مرہم جو علاج دل کا مرے داغِ لالہ کیا کرتا
مجھے تو عزتِ تابوت تھی ضرور اپنی جو روزِ بد کو نہ رکھتا دوشالہ کیا کرتا
گر اس کے قدموں پر اپنی نثار کرتا جاں میں وقتِ نزع اجل کے حوالہ کیا کرتا
نہ رعبِ حسن نے آنے دیا اسے نزدیک قمر سے دور نہ رہتا جو ہالہ کیا کرتا
تنِ ضعیف مرا بن گیا تھا مور کا رزق زمانہ اس کو اجل کا نوالہ کیا کرتا
بہشت ہاتھ مرے بیچتا اگر رضواں طلب میں بیع کا اس سے قبالہ کیا کرتا
وہ سنگسار ستاروں سے آپھی تھا، گردوں ہمارے کھیت پہ برسا کے ژالہ کیا کرتا
اسے تو عشق نہ تھا مصحفی سخن سے مرے
میں دوستی کا بنا کر رسالہ کیا کرتا

109

محشر کو تھا جو وعدۂ دیدار آپ کا حاضر ہوا ہے یاں بھی گنہگار آپ کا
یہ پائچے پہ کفشِ انی دار واچھڑے الجھے نہ پانو کیوں دمِ رفتار آپ کا
بن ٹھن کے تم چلے ہو صنم بہرِ سیرِ باغ دامن نہ کھینچ لیوے کوئی خار آپ کا
جس روز ہم کو سایۂ طوبیٰ میں جا ملی آوے گا یاد سایۂ دیوار آپ کا
باتوں کے پیچ ہوگئی آخر شبِ وصال اور صبح تک رہا وہی انکار آپ کا
گرما میں ہم نہ آویں گے صاحب تمھارے پاس پنکھا ہی اب رہے گا ہوا دار آپ کا
تم یار چہ کہو ہو حقارت سے کیا مجھے اس کو کہو جو ہووے کوئی یار آپ کا

مر جائے التجا نہ مسیحا کی پر کرے آخر دماغ رکھے ہے بیمار آپ کا
تیغ نگہ کی باڑھ پہ رکھتے ہو انگلیاں زخمی کرے نہ ہاتھ یہ تلوار آپ کا
سودائیانِ عشق کو تم لوٹ لے گئے منھ دیکھتا رہا سبھی بازار آپ کا
دیکھے جو اک نظر تمھیں بازار مصر میں یوسف ہو لاکھ جی سے خریدار آپ کا

گستاخ کر دیا اسے چاہت نے، کب تلک
رکھتا لحاظ مصحفیِ زار آپ کا

110

اگرچہ روح سے پیوندِ آب و گل چھوٹا خیال تو بھی نہ تیرا بتِ چگل چھوٹا
یہ سُست پر ہوں میں صیاد، تو بھی اڑ نہ سکا قفس سے گرچہ گلستاں کے متصل چھوٹا
ہے عید، وا درِ زنداں ہوئے عجب کیا ہے گر ایک میں بھی اسیروں کے مشتمل چھوٹا
درِ قفس پہ ہوا سرد، موسمِ گل میں جو کوئی مجھ سا گرفتار مضمحل چھوٹا
یہ موتی اس کے لڑاویں گے آنکھ پرویں سے انارِ آہ جو شب ہو کے مشتعل چھوٹا
مرے مزار پہ قاتل جو میرا آیا رات تو اس سے خون کا فوارہ، توڑ سِل، چھوٹا

ہمیشہ مصحفی، خوباں کے ہم اسیر ہوئے
کبھی نہ دامِ محبت سے اپنا دل چھوٹا

111

عیش جہاں بغل میں تمھاری سب آ رہا دل ہی دیا جو تم کو تو پھر اور کیا رہا

رعشے کا ضبط ہو نہ سکا تیرے سامنے
خورشید جب تلک کہ رہا کانپتا رہا

بہ زیرِ پاشنہ[1] پاجامہ ہو جس ماہ پیکر کا
وہ عالم کیوں نہ دکھلا دے بھلا پر پا[2] کبوتر کا

1۔ پاشنہ : ایڑی 2۔ پر پا کبوتر : کبوتر کی ایک قسم، پاموز

ب

112

سایۂ خالِ ذقن ہے مگسِ جامِ شراب
کیوں کہ وہ شوخ کرے پھر ہوسِ جامِ شراب

چشم و مژگاں پہ کرے اُس بتِ کافر کے نظر
گر نہ دیکھا ہو کسی نے قفسِ جامِ شراب

میکدے سے نہ رکھیں مست کبھو باہر پانو
تا نہ ہو بہر سواری فرسِ جامِ شراب

نگہِ لطف کبھی حال پہ میرے بھی تو ہو
ہے تری چشم سے یہ ملتمسِ جامِ شراب

جب سے میخانے کی اس کو ہوئی چوکیداری
تب سے گردش میں ہے ہر شب عسسِ جامِ شراب

چاہیے خونِ جگر اپنا وہ پی کر رہ جائے
ہو نہ مفلس کو اگر دسترسِ جامِ شراب

رہِ میخانہ نہ مستی میں مجھے گم ہوتی
دستِ ساقی میں جو ہوتا جرسِ جامِ شراب

تشنگی سینہ جلاتی ہے جو مخموروں کا
آب بھی ان کو پلاتے ہیں پسِ جامِ شراب

مصحفی نے نہ ترے لب کا لیا اک بوسہ
لے گیا دل میں وہ اپنے ہوسِ جامِ شراب

113

شیشۂ مے جو نہ ہو ہم نفسِ جامِ شراب
دل سے مستوں کے نہ نکلے ہوسِ جامِ شراب

ابھی انگور میں تھی بادہ کہ مستوں کا ہوا
طائرِ روح اسیرِ قفسِ جامِ شراب

مغبچہ بھول نہ بیٹھے کہ لگا ہاتھ اسے
نخلِ خم سے ثمرِ پیش رسِ جامِ شراب

کم سوار اتنے تو کچھ ہم بھی نہیں، اے ساقی
کاسۂ سم [1] گو کہ ہے تیرا فرسِ جامِ شراب

ہائے روزوں میں لٹا قافلۂ مے نوشاں
اور نہ فریاد میں آیا جرسِ جامِ شراب

ساغر اس دست نگاریں پہ ہے ہر لحظہ، ہوا
دشمنِ دزدِ حنا کب عسسِ جامِ شراب

1۔ کاسہ سم: شہسواری کی کوئی اصطلاح

خالِ لب کا جو ترے کُشتہ ہو کیا دور اس کو حَبِّ افیوں سے غلط ہو مگس جامِ شراب
رسم میخانۂ الفت کی یہی ہے، یاں مست ساغرِ زہر بھی پیتے ہیں پسِ جامِ شراب
یاد آتی ہے جھجک یار کے مے پینے کی عکسِ مژگاں کو سمجھتا ہے خسِ جامِ شراب
مصحفی ابر کرم برسے جو میخانے پر
دامنِ رند سے دھووے دنس[1] جامِ شراب

114

قسمت دشمن نہ ہو یہ قصرِ منحوس حباب شمع سے خالی سدا رہتا ہے فانوسِ حباب
تاج بخشی گو کہ کی دریا نے پر کیا شاد ہو ایک دم کی زندگی پر جان مایوسِ حباب
ایک جھونکے میں ہوا کے دونوں مٹ جاتے ہیں ہائے موج کا میں غم کروں یا کھاؤں افسوسِ حباب
جسم خاکی کی سبک روحی مجھے آئی نظر دیکھ کر دوش ہوا پر صاف ملبوسِ حباب
ایک دم کی زندگی پر سر میں ہے بادِ غرور سطح دریا نہ کیوں ہو تختہ کاؤسِ حباب
کیا شکنجِ زلفِ خے آگیں کی لائی ہے خبر قطرہ زن جو موج کے پیچھے ہے جاسوسِ حباب
کر رہا تھا جب وہ اپنی بے ثباتی پر نظر جزر و مدّ بحر تھا خود دست افسوسِ حباب
خانہ راہِ سہل میں اس کو بنا کر نا نہ تھا کیوں نہ نت موجِ فنا ہو آکے پابوسِ حباب
کس کے نیرنگ نگاہ ناز کا ہے منعکس ناچتا ہے جو کھڑا دریا میں طاؤسِ حباب
قالبِ خاکی کے دم کا ماجرا ہرگز نہ پوچھ
ہے ہوا اے مصحفی یک لحظہ محبوسِ حباب

115

نالے کو شبِ ہجر تو میں ضبط کیا خوب پر اشک کا گلگوں تو یہ مجھ سے نہ تھا خوب
نسبت ہوئی لیلیٰ کی جو قیسِ ہنری سے سب بولے کہ پیوند کو پیوند ملا خوب

1۔ دنس : میل

عطّار ہزاروں ہیں و لے دردِ طلب کی ملتی ہی نہیں شہرِ نکویاں میں دوا خوب
کھاتا ہے جو چن چن کے سدا ہڈیاں اس کی پہچان گیا ہے ترے کشتے کو ہما خوب
پردے میں رہا کیجیے لیکن نہ مہینوں اتنی بھی تو عاشق سے نہیں تم کو حیا خوب
دیتے ہوئے گالی تو گئے ہو مجھے صاحب اس رہ سے کبھی پھر بھی تو آؤ گے بھلا خوب
لے جاتی ہے ہر لحظہ اسے تیری گلی میں پیچھے ترے عاشق کے پڑی ہے یہ قضا خوب
سوہے[1] کی پھبن ہوتی ہے نازک بدنوں کو ان سادہ سے ہاتھوں پہ رچے کیوں نہ حنا خوب
جوں غنچہ مرا دل نہ لگا مصحفی اس میں
ہر چند کہ تھی گلشنِ ہستی میں فضا خوب

116

صیّاد کر کے قید، گیا ہم کو بھول، خوب اس سال کھل رہے ہیں گلستاں میں پھول خوب
دل شاد ہو گیا کہ ہوا تھا ملول خوب شب وصل کے چمن سے چنے ہم نے پھول خوب
تال اس کا چاہیے تھا تجھے شورِ فاختہ اے سرو باغ رقص نہیں بے اصول خوب
سوز و گدازِ شمع پہ کر یاس کی نظر رویا تمام شب دلِ حسرت شمول خوب
جا کر کے دشتِ عشق میں مانندِ گردباد وحشت یہ ہے تو ہم بھی اُڑا دیں گے دھول خوب
تیرے سوا جو اور کو چاہا ہو میں کبھی واقف ہے اس سے میرا خدا، رسول خوب
دفتر سیاہ ہو گئے پر وہ نہ کم ہوئی الفت کی داستاں کو دیا ہم نے طول خوب
ڈالی ہی وہ کِھلی نہ رہی، جس پہ مصحفی
بلبل خوشی سے بیٹھتے تھے پھول پھول خوب

117

رہ جاؤ میرے گھر کبھی مہمان شب کی شب دشوار کیا ہے وقفہ مری جان، شب کی شب

1۔ سوہا: زرد

گو حجرۂ فقیر ہے تنگ اور کم فضا یاں بھی بسر کرو کسی عنوان شب کی شب
پھر صبح دم ہیں دستِ جنوں کی چڑھائیاں سی لوں میں اپنے چاک گریبان شب کی شب
دنیا میں ہم رہے تو پہ کم فرصتی کے ساتھ جیسے سرا میں رہتا ہے انسان شب کی شب
چہرہ بھلا لگے ہے ترا ان سے اے پری رہنے دے یونہی موے پریشان شب کی شب
جی بھر کے دیکھ لوں رخِ جاناں شبِ وصال ہے مغتنم تلاوتِ قرآن شب کی شب
کھویا گیا ہے زلف میں دل یہ یقیں رہے دینا پڑے گا آپ کو تاوان شب کی شب
پیدا ہی کرلیں ہم بھی کسی سگ سے راہ واں رہنے دے اس گلی میں جو دربان شب کی شب
گھبرا نہ ظلمتِ تنِ خاکی میں اتنا تو
ہے مصحفی یہ سختیِ زندان شب کی شب

118

تھا سر میں کچھ جنوں کا جو طغیاں تمام شب شب ہاتھ میں رہا ہے گریباں تمام شب
بالیں پہ میری نزع کے ہنگامے سے مرے جاگا کیے ہیں گبر و مسلماں تمام شب

ت

119

چلا میں ہو کے جونہی کوے یار سے رخصت ہوا قرار دلِ بے قرار سے رخصت
اب اس طرف کو نہ آوے گی پھر کہ بعد از دفن صبا ہوئی مری خاکِ مزار سے رخصت
کہا کہ اور ٹھہر اتنا اضطراب ہے کیا میں کی طلب جو شبِ انتظار سے رخصت
خوشی کا نام جو ڈھونڈو تو نام کو بھی نہیں وہ ہو گئی ہے ہمارے دیار سے رخصت
ادھر سفر کو چلا یار اور ادھر طاقت سلام کر کے ہوئی جسمِ زار سے رخصت

ہے طرفہ تفرقہ پرداز کوئی بادِ خزاں جو گل کو کرتی ہے پہلوے خار سے رخصت
صبا چمن کی طرف رو کرے نہیں ممکن نہ لیوے تا کہ ہمارے غبار سے رخصت

لگاوے تیر نہ تودے پہ مصحفی بہرام
نہ لے جو ناوکِ مژگانِ یار سے رخصت

120

بیمار کے تیرے کہوں کیا دل کی حقیقت دق ہی کی کھلے اس کی نہ کچھ سل کی حقیقت
گرداب میں اس ناف کے دل جا کے پھنسا ہے کیا غرقے سے پوچھے کوئی ساحل کی حقیقت
اس خط نے کیا بالِ کبوتر کو نگاریں جس خط میں لکھی تھی ترے بسمل کی حقیقت
بھیجا تھا جو خط قیس نے لکھ شاہدِ حی کو تھی اس میں لکھی ناقہ و محمل کی حقیقت
ہر آبلے میں نشترِ صد خار ہے پنہاں پانو سے مرے پوچھیے منزل کی حقیقت
خط بھی نہ پڑا تن پہ مرے تیغ کا اس کی معلوم ہوئی بازوے قاتل کی حقیقت
حق پیکرِ انساں میں نہاں کیوں کہ ہوا ہے کھلتی نہیں اس پردۂ حائل کی حقیقت
اے زاہدو! باطل سے قسم کھاؤ جو پہلے تو تم سے کہیں ہم حق و باطل کی حقیقت

ہے مصحفی اک شعبدہ سا شعبدہ تیرا
کچھ پوچھ نہ اس عارفِ کامل کی حقیقت

121

پھر فصلِ گل آئی ہوئے یہ نغمہ سرا مست پھر بادہ پیے باغ میں پھرتی ہے صبا مست
گردن کشیِ شیشہ نہیں اس پہ بھی جاتی اور دیکھے ہے یاں چلتے ہیں سب سر کو جھکا مست
ہر نقشِ قدم آئنۂ لغزشِ پا ہے کیا جھومتا کوئی ترے کوچے سے گیا مست
خود آوے ہے صیاد کی گولی کے وہ منھ پر اس دشت میں جب کرتی ہے آہو کو فضا مست
ہو کیسا ہی بیہوش پڑا کھول دے آنکھیں اس پاے نگاریں کی جو کھاوے سر پا مست

گوندھا تھا مگر رے میں صنم تو نے شب اس کو　　جو کرتی ہے عاشق کو تری بوے حنا مست
ہے میکدۂ دہر وہ میخانہ کہ جس میں　　اک جام سے ہو جاتے ہیں مستان فنا مست
در مشربِ رندانِ خرابات نگارا　ق　ہر چند کہ بے لعلِ لبت بادہ حرامست
گویند کہ از میکدہ برخاستہ شورے　　تا مستیِ چشمِ تو دگر کردہ کرامست
اے مصحفی پیری نے جھکایا[1] تجھے جیسا
ایسا تو جوانی میں تو زنہار نہ تھا مست

122

بندے پہ ترحّم کم اللہ کی یہ صورت　　بے سود نہ ہاتھ آوے تنخواہ کی یہ صورت
بہتے ہوئے آنسو جو رخسار سے پونچھے ہیں　　ہمدم مرے کہتے ہیں "ہے چاہ کی یہ صورت؟"
مٹ جائے گا اپنی تو پھر نقش ہی ہستی کا　　ٹھہری جو مرے دردِ جانکاہ کی یہ صورت
دیکھ آئنے میں اپنے وہ عکس کو کہتا ہے　　"انصاف کرو یارو! ہے ماہ کی یہ صورت؟"
تربت پہ مری اب تک انبوہِ حسیناں ہے　　یا رب کہ رہی برسوں درگاہ کی یہ صورت
اے مصحفی پھر کیوں کر سوؤں میں شبِ ہجراں
نالے کی یہ شکل اور ہو جب آہ کی یہ صورت

ٹ

123

ٹانگن[2] تو ترا آپ صنم جاوے ہے کھٹ کھٹ　　کس واسطے دوڑاوے ہے پھر تو اسے بگٹٹ
صیاد سے شکوہ ہے یہی مرغِ چمن کا　　ظالم نے کیا موسمِ گل میں مجھے پرکٹ

1۔ جھکایا، چھکایا؟　　2۔ ٹانگن: پہاڑی ٹٹو

ہے آہِ پریشاں سے مرے دل کی یہ صورت جوں خانۂ تاریک میں رہتا ہے دھواں گھٹ
ہے یہ فلکِ سفلہ وہ پھیکا سا فرنگی رکھتا ہے مہ و خور سے جو پاس اپنے دو بسکٹ
کیا فائدہ طالع سے جو ہوں دست و گریباں جب ہاتھ سے اس شوخ کا دامن ہی گیا چھٹ
جب حادثۂ چرخ کی فوج اس پہ چڑھ آئی
اے مصحفی اپنا تو وہ دل وونہی گیا لٹ

124

تختۂ آبِ چمن کیوں نہ نظر آوے سپاٹ یاد آوے مجھے جس دم وہ نگمبود[1] کا گھاٹ
زندگانی کا مزہ زیرِ فلک اب نہ رہا یا رب ایسا ہو کہ مل جائے کہیں پاٹ سے پاٹ
فن کشتی میں قیامت ہے وہ بت گاذر[2] کا دھوم دیتا ہے مچا آوے ہے جب دھوبی[3] پاٹ
جاتے ہی وادیِ وحشت میں قدم مارا میں چمنِ دہر سے دل اپنا ہوا جب کہ اچاٹ
خاک دہلی میں کیا جب سے نصاریٰ نے عمل شورِ گوجر ہی رہا اور نہ ہنگامۂ جاٹ
ترکِ غمزے کا مگر بر سرِ سقّا کی ہے اس کے کوچے سے چلی آتی ہے جب کھاٹ پہ کھاٹ
قتلِ عاشق کا جو ہوتا ہے ارادہ اس کو پہلے دیکھے ہے خر و گاؤ پہ تلوار کا کاٹ
کوئی سیکھے بھی قناعت کو تو سگ سے سیکھے پڑ رہے ہے وہ بیک گوشہ دیا رات کو چاٹ
روز ہنگامہ ہے اس گنبدِ نیلی کے تئیں
مصحفی شک نہیں بگڑا ہے مگر نیل کا ماٹ[4]

125

کیوں نہ دل نظارگی کا جاوے لوٹ لکھنؤ میں حسن کی بندھتی ہے پوٹ
اتفاقاً ہم میں ہے لطفِ حیات مجگ[5] کے ہوتے ہی جدا مرتی ہے گوٹ

1۔ دہلی کے قریب جمنا کا ایک گھاٹ (آثار الصنادید) فائز نے اس پر ایک نظم کہی ہے۔ مصحفی نے کئی جگہ اس کا ذکر کیا ہے
2۔ گاذر : دھوبی 3۔ دھوبی پاٹ : ایک داؤ، حریف کو اٹھا کر پٹخ دینا 4۔ ماٹ : مٹکا
5۔ مجگ : چوسر کے کھیل میں دو گٹوں کا ایک خانے میں جمع ہونا

کام اس زرگر پسر کے ساتھ ہے کیا دکھاوے دیکھیے طالع کی کھوٹ
اک خدنگِ ناز میں تیرے صنم ہو گئے دل قدسیوں کے لوٹ پوٹ
نالۂ زندانیانِ عشق کو سدِّ رہ کھائی ہوئی گا ہے نہ کوٹ
ذبح کرنا تیرہ بختوں کا ہے کیا تم جو کچھ چاہو کرو زلفوں کی روٹ
اور تو ثانی کوئی اس کا نہیں
مصحفی کا ہے قتیل البتہ چوٹ

126

مارِ افیوں ہے یاں سدا چٹ کھا جاتے ہیں زہر بھی بلا چٹ
بقال پسر ہے اک فریبی کتنوں کا یہ مال کر گیا چٹ
مہ عشق میں بے نوا بنا ہے کر ریش و بروت کا صفا چٹ
گلچیں کے ہاتھوں مر گئے ہم ٹوٹے جو چمن میں گل چٹاچٹ
کیا مال ہیں استخواں میرے جو ان کو کریں سگ و ہما چٹ
تھا مصحفی میوہ خوار کیسا
جو باغ کا باغ کر گیا چٹ

ش

127

رنگ رخ کرتا ہے تیرا گل سے بحث گیسوے مشکیں کو ہے سنبل سے بحث
نالہ کش اس باغ کی وہ ہی سہی کون اس ساعت کرے بلبل سے بحث
کرتے دیکھی ہم نے پیشِ مے کشاں اس کی چشمِ مست جامِ مُل سے بحث

اصفہاں میں جاویں گر خوبانِ ہند زلف واں کرنے لگے کاکل سے بحث
گریہ ہوتا ہے گلو میں جب گرہ شیشے کی کرتا ہے وہ قلقل سے بحث
مدرسہ تو نے لیا سر پر اٹھا
مصحفی کرتے نہیں اس غل سے بحث

128

کس نے لکھا ہے ترے رخ پہ خطِ ریحاں مُثلث سامنے جس کی صفا کے ہے خطِ خوباں مُثلث
آفریں پر نہ روافض کی دلا تو بھولیو حرف رکھتے ہیں یہ موذی بہ بنِ دنداں ثُلث
ہے یہ آبادی و ویرانہ چہارم حصہ کی ہے صانع نے تہِ آب زمیں پنہاں ثُلث
گھیر لے یار کے رخسار کو جب افعیِ زلف منخسف[1] کیوں نہ نظر آئے مہِ تاباں ثُلث
جی لگایا ہے تو ہمت تو نہ ہار اے حافظ منزل آسان ہے جب یاد ہوا قرآں ثُلث
تین منزل مجھے اک دم ہیں اگر ہوں قاصد[2] پڑھنا قاری کو ہے سیپارہ بہت آساں ثُلث
اور بھی چاہیے کچھ اس کو میں معمور کروں
مصحفی ہے ابھی مقدار میں یہ دیواں ثُلث

ج

129

جتنا میں راست خم میں کیا امتحانِ موج دیکھا سوائے موج نہ تیر و کمانِ موج
میں ناتواں جو آپ کی چادر میں چھپ گیا سر پر کہاں سے ٹوٹ پڑا آسمانِ موج
شاید یہ رود پیش ازیں قتل گاہ تھی دیتی ہیں کشتگاں کا نشان استخوانِ موج

1۔ منخسف: گہنایا ہوا 2۔ اگر ہوں قاصد: اگر میں روانہ ہوں، روانگی کا قصد کروں

گر وقتِ گریہ شوقِ تعرّج ہوا ہمیں دیویں گے آسماں سے لگا نردبانِ موج
سمجھا نہ رمز کو میں تباہی نصیب ہاے گو دستِ دور باش تھی مدِّ زبانِ موج
کس کو ہے پیش و پس کا روارو میں امتیاز جاتا ہے یاں ہوا پہ چلا کاروانِ موج
چینِ جبیں سے رکھتے ہیں نفرت جو خاکسار پڑتا نہیں ہے ریگِ رواں میں نشانِ موج
کشتی ہماری کیوں کہ بلندی کو جا سکے ہم کو تو اس جگہ نہیں پڑتا گمانِ موج
ہر چند اس کے دم سے فنا ہے لگی ہوئی دریا کے ہوتے مٹ نہیں سکتا نشانِ موج
تیغِ کشیدہ ہے کفِ طوفانِ آب میں ہم شاعروں سے اور نہ پوچھو بیانِ موج
بے تہ کو آئے خاک نظر یاں تو مصحفی
دریاے ذات سخت ہے پنہاں میانِ موج

130

مرد قانع کو خدا دیوے ہے بے منّت گنج واسطے زر کے دلا کر نہ تو اتنی شش و پنج
کان دھر کر جو سنیں نالۂ موزوں میرا ہوں نہ پھر باغ میں مرغانِ چمن قافیہ سنج
سچ جو پوچھو تو بدیہی ہے اثر صحبت کا سرخ ہو جاویں ہیں جوں بیربہٹی سے برنج
صفحۂ کاغذِ منقوش سمجھ سطحِ زمیں چشم دانا میں یہ عالم ہے طلسمِ نیرنج
پیل ہے زلف تو رخسارہ رخ اور فرزیں خال خوب رویوں کا نرالا نظر آیا شطرنج
بے غلط سامنے شارع کے وہ ہے تخمِ حرام
مصحفی جس کو اطبّا نے لکھا بذرالبنج[1]

چ

131

ہم رہے دل کے یاں ملال کے بیچ تم گئے اور ہی خیال کے بیچ

1۔ بذرالبنج: (بذر = بیج، بنج = بھنگ) اجوائنِ خراسانی (لغت میں لکھا ہے کہ یہ بنگ کا مفرّس نہیں)

جی ہی جانے ہے ہم نے لوٹے تھے — جو جو خطرے شبِ وصال کے بیچ
یا رب اس سال میں نہ دکھلانا — جو تعب[1] کھینچے اگلے سال کے بیچ
حب افیوں سے کچھ زیادہ سرور — میں نے دیکھا صنم کے خال کے بیچ
کس کا دیکھا دہن جو گل کی کلی — جھک گئی آ کے انفعال کے بیچ
دی ہیں بھر کوٹ کوٹ صانع نے — شوخیاں اس کے بال بال کے بیچ
کیا کہوں اس کی جالی کی کُرتی — لائی کس کس کو اپنے جال کے بیچ

عربی کا ہے مصحفی کو شوق
نہیں وہ اور قیل و قال کے بیچ

132

یوں تو کیا کیا نہ کہا یار نے شب پیار کے بیچ — پر نہ سوجھا مجھے کچھ نشۂ سرشار کے بیچ
دست و بازو کو ترے صدمہ نہ پہنچے یا رب — کاش ہو کام مرا ایک ہی تلوار کے بیچ
رشک نظارہ پرستوں کو ترے کیوں نہ رہے — ان پہ جو دیتے ہیں جاں حسرتِ دیدار کے بیچ
نقطۂ مرکزِ پُرکار خمِ زلف ہے یہ — خالِ مشکیں نہیں پیارے ترے رخسار کے بیچ
چرخ مینائی کے تاروں سے ہوا یہ روشن — سب کچھ آتا ہے نظر شیشۂ دیوار کے بیچ
تو عیادت کو جب آوے وہ ذرا اُٹھ بیٹھے — طاقت اتنی بھی کہاں ہے ترے بیمار کے بیچ
خبرِ کوہ کن افسوس نہ لی شیریں نے — مر گیا سر کو پٹک دامنِ کہسار کے بیچ
میں نہ دیکھا کبھی صیاد نے جا گلشن میں — رکھ دیا ہووے قفس کو مرے گلزار کے بیچ
آج آتا ہے نظر نالۂ بلبل رنگیں — برگِ گل کو نہ لیا ہو کہیں منقار کے بیچ
سادہ وضعی پہ امیر اب کے بہت مرتے ہیں — طرہ رکھنے کی نہیں رسم ہی دستار کے بیچ

اس سے اے عشق کہیں ہاتھ اٹھا جانے دے
اب تو باقی نہیں کچھ مصحفیِ زار کے بیچ

1۔ تعب : تکلیف، سختی

133

رنگِ ثبات ہم نے نہ دیکھا چمن کے بیچ
آتے ہی منہ کلی نے لپیٹا کفن کے بیچ

اب ذکرِ خال وخط سے گر ایسی ہی ہے بجاں
تو اے زباں، نہ رہیو تو میرے دہن کے بیچ

شانہ اگر نہ زلف میں اپنی کرے وہ شوخ
اک بانک پن تو نکلے ہے چین وشکن کے بیچ

ہمدم پرے سرک کہ میں پاتا ہوں ان دنوں
بجلی کی کوند اس نفسِ شعلہ زن کے بیچ

رنگِ بدن سے اس کے یہ ہوتا ہے جلوہ گر
اک تہ گلابی دی ہوئی ہے پیرہن کے بیچ

توڑے[1] چھڑوں[2] کے ساتھ میں بانکے کڑے[3] ہیں واں
نکلا ہے بانک پن یہ نیا بانک پن کے بیچ

اتنا وہ خوبرو ہے کہ صورت کو جس کی دیکھ
تصویر کے بھی لب وونہی آویں سخن کے بیچ

ازبس کہ اس نے تیشہ زنی کی ہے بعدِ مرگ
دیکھا تو آبلے تھے کفِ کوہ کن کے بیچ

اہلِ خرد کے واسطے مضمر ہے مصحفی ق ایذا دہی[4] طبیعتِ چرخِ کہن کے بیچ

شکوہ میں کیا کروں یہ جفا پیشہ رات دن
رکھتا ہے اس لیے مجھے رنج ومحن کے بیچ

134

جب وقتِ نزع کھائے گی تیری زبان پیچ
تب تجھ کو یاد آئے گا مردے کا ران[5] پیچ

کنابہ[6] آفتاب کا کٹ جاوے دفعتاً
بگلی[7] سے تیری لیوے اگر میری جان پیچ

گر اٹکے زلف میں تو گہے جعد میں پھنسے
دیتا رہا ہمیں تو مدام آسمان پیچ

ہے سچ تو یہ کہ کام میں عاشق کے آپڑے
یک پیچہ باندھنے سے ترے اے جوان پیچ

کُشتی فلک سے جیت سکوں کیا بزورِ عقل
رکھتا ہے یاد سیکڑوں یہ پہلوان پیچ

ہے یہ خیالِ زلف تو شاید غزال وار
کھاویں گے گور میں بھی مرے استخوان پیچ

1۔ توڑا : زیور 2۔ چھڑا : زیور 3۔ کڑا : زیور 4۔ اصل : انداز ہے
5۔ ران پیچ : لغت میں نہیں ملا۔ شاید کُشتی کی کوئی اصطلاح 6۔ کنابہ : پتنگ کا وہ حصہ جس میں ڈور باندھتے ہیں
7۔ بگلی: غالباً بگلے کی شکل کی پتنگ۔ لغت میں نہیں ملا۔

وہ جعدِ عنبریں کفِ شانہ میں دیکھ کر کھاتا ہے جی ہی جی میں دلِ بدگمان پیچ
گردابِ نافِ یار میں جوں خس گرا کے آہ قسمت نے میری مجھ کو دیا ہے سنان[1] پیچ

اے مصحفی کسی کے نہ آئی وہ ہاتھ ہائے
تابِ کمر سے کھائے ہے کیا اک جہان پیچ

135

جھیل سکتے نہیں رستم تری تلوار کی آنچ کوہ کو خاک کرے برقِ شرربار کی آنچ
جوہرِ جنبشِ مردم کو جلا دیتی ہے مہر کی طرح تری آتشِ رخسار کی آنچ
جس طرح شمع کے شعلے پہ جلا پروانہ اس طرح یار کو دیتی ہے جلا یار کی آنچ
کر گیا دیکھ تجلّی کو تری غش موسیٰ اس سے جھیلی نہ گئی شعلۂ دیدار کی آنچ
اس کے مرتے ہی وہ آتش میں نہ یوں جل جاوے ہو ستی کو نہ اگر شوہرِ بیمار کی آنچ
کیوں کہ جل کر کے وہ بھسمنت[2] نہ ہو، ایسی ہے دلِ بلبل کو لگی الفتِ گلزار کی آنچ

دم محبت کا تو احباب سبھی بھرتے ہیں
پر نہیں ایک کو بھی مصحفیِ زار کی آنچ

ح

136

دیکھ کر پیشانیِ دلبر کی لوح اپنا[3] سر پٹکے ہے نت پتھر کی لوح
اس کے چہرے کا ہے زیور سے بناؤ جوں سرِ قرآن پر ہو زر کی لوح
دیکھ خط سیلی کا اس کی گات[4] پر مٹ گئی سیمِ صفا پرور کی لوح

1۔ سنان پیچ : کُشتی کی کوئی اصطلاح 2۔ بھسمنت ہونا: جل کر خاک ہونا 3۔ اصل: اپنے
4۔ گات: بدن، عورت کے جسم کا اوپری حصہ، دھڑ، سینہ

پڑھ لے میری اس سے تاریخ وفات　ہے سرہانے جو کھڑی مرمر کی لوح
مشقِ خوں ریزی سے باز آیا نہ شوخ　ہاتھ میں اس کے رہی خنجر کی لوح
قد نما آئینہ ہے اس ماہ کا　صاف سطحِ چشمۂ کوثر کی لوح
سنگِ تربت کا کھلے کیا خاک بھید　ہے طلسمِ گنجِ باد آور کی لوح
اب تو ہم ہیں اور وہی نقشِ فنا　اور وہی سر پر کھڑی پتھر کی لوح

خشتِ خُم مجھ کو کبھی اے مصحفی
تھی کلیم اللہ پیغمبر کی لوح

137

ہم لے گئے بخاک سیہ آرزوے صبح　دیکھا شبِ فراق میں ہرگز نہ روے صبح
گردوں شبِ فراق میں، کھو اپنی صبح کو　کرتا ہے پیرہن میں ترے جستجوے صبح
ہوتی نہیں نماز قضا عشق کی کبھی　کرتے ہیں آبِ اشک سے عاشق وضوے صبح
مایوس جی سے ہوں ظلماتِ فراق میں　ہاں جی بچے، کرے جو کوئی گفتگوے صبح
یا رب شبِ فراق تو اتنی نہ تھی دراز　یہ ظلمت نصیب ہے کس کی عدوے صبح
پیراہنِ سپید ترا گو ہو ملگجا　آتی ہے میرے مغز میں نت اس سے بوے صبح

جوں آفتاب جام نہ دے کف سے مصحفی
رنگِ شفق کو جان شرابِ سبوے صبح

خ

138

آتشِ غم نے دیا یوں دلِ بیتاب کو چرخ　جس طرح دیوے مہوّس[1] کوئی سیماب کو چرخ

1۔ مہوّس : کیمیاگر

نتھ کے حلقے کی ترے ڈالی ہے زرگر نے طرح
دے کے سو بار کٹھالی میں زرِ ناب کو چرخ
دور دامن پہ ترے ہے جو تمامی کی سنجاف
رقص کے وقت وہ شب دیتی ہے مہتاب کو چرخ
کیا کہروے[1] کا ترے ناچ سکھاتا ہے اسے
دے رہا ہے یمِ جوشندہ جو گرداب کو چرخ
بارے کس مہ سے ملاوے گا مجھے آج کی رات
لے گیا ہے مری آنکھوں سے جو تو خواب کو چرخ
کیوں نہ ہو تیز کہ یہ چشمِ سیہ کی پتلی
ہے ترے سرمے کی شمشیرِ سیہ تاب کو چرخ
کیوں نہ دل لوٹ ہو اس پر کہ صدف میں بھی دیا
نتھ کے موتی نے ترے گوہرِ نایاب کو چرخ
کیلی والے کی صدا مصحفی دیوے نہ رُلا
جس کی تاثیر سے ہو کوزۂ دواب کو چرخ

139

شکل دیکھی جو تری نرگس بدخواب کی سرخ
آنکھ اس دن سے ہوئی جامِ مئے ناب کی سرخ
زائچ[2] چرخ کا ہے رنگِ شفق سے یہ حال
جس طرح ہوتی ہے جوتی کسی قصاب کی سرخ
قتلِ مریخ پہ باندھی جو کمر چودھویں شب
اس نے پوشاک نکالی شبِ مہتاب کی سرخ
خون جاری تھا بدن سے جو ترے زخمی کے
زخم کے دھوتے ہی رنگت ہوئی بس آب کی سرخ
فندقِ دستِ نگاریں کا کہوں کیا عالم
جیسے ہوتی ہے کلی لالۂ شلواب[3] کی سرخ
حال کچھ کشتیِ خصمانۂ رستم کا نہ پوچھ
ایک ہی دشنے میں پہلو ہوئے سہراب کے سرخ
مصحفی مشتِ حنائی کو تو ٹک یار کی دیکھ
پور اس لطف سے ہوتی نہیں عناب کی سرخ

140

آپ مردم کو کرے ہے ترا چہرا گستاخ
خود بخود ہوتی ہیں آنکھیں بہ تماشا گستاخ
دلفریبی میں ہر اک عضو بلا ہے تیرا
میری خوبی ہے جو میں خود نہیں ہوتا گستاخ

1۔ کہروے کا ناچ: کہاروں کا ایک مخصوص رقص 2۔ زائچ: ؟

3۔ لالۂ شلواب: لالہ، سیراب اکثر جگہ استعمال کیا ہے۔ ''شلواب'' لغت میں نہیں ملا

اب ہمیں بھول گیا سیبِ زنخداں سے ترے تھا کبھی، جان مری، دستِ تمنا گستاخ
بیڑیوں میں اسے لہروں کی جکڑتا ہے بہ زور ہے ترے غرقے کے لاشے سے یہ دریا گستاخ
ہے یہ مقدور مرا اس کو میں چھیڑوں شبِ وصل؟ جس کے بستر پہ نہ ہو صورتِ دیبا گستاخ
گو تو بیمار ہے پر ہو نہیں سکتا تو بھی نبض گیری میں تری دست مسیحا گستاخ
سگ و درباں تو روادار ہی آنے کے نہیں
مصحفی کیوں کہ میں اس کو میں رکھوں پا گستاخ

141

دیکھے اس نور تجلّی کو کوئی کیا گستاخ جس پہ موسیٰ کی نہ ہو چشم تماشا گستاخ
ماہِ کنعاں کی تو آساں نہیں دامن گیری کچھ سمجھ کر ہو تو اے دستِ زلیخا گستاخ
دست بوسی وہ[1] صنم تیری کرے عید کے دن تجھ سا اتنا بھی نہیں عاشقِ شیدا گستاخ
گنجِ لب میں ترے یہ خال سیہ ہے گستاخ یا ہوئی ہے دلِ عاشق کی سویدا گستاخ
مصحفی آہ مری کو تو سبک اتنا نہ جان
ہے یہ با کنگرۂ عرشِ معلّٰی گستاخ

142

کام کرتی ہی نہیں سنگ کی تعمیر میں میخ ہووے ہر چند کہ فولاد کی تاثیر میں میخ
عقدۂ بندِ قبا اس کے جو مجھ سے نہ کھلے کس نے گاڑی تھی مرے ناخن تدبیر میں میخ
تیر گر تیر کو خالی نہ کرے تو ہرگز نہ دھنسے شاخِ گلو تیری ئے تیر میں میخ
خیمۂ وصل تلک تو نہ یہ کافر آتا کاش الجھتی کوئی پائے فلکِ پیر میں میخ
آہ بھی وہ تو نہ زنہار کرے گر رانجھا گاڑ دے بھینس کی اپنے جگر ہیر میں میخ
کام نکلے ہے میاں چی سے، نہ کترے گلِ شمع واسطے ہو جو نہ مقراض کے گلگیر میں میخ

1۔ اصل: کو = گو

چور کے ہاتھ کو رکھتے ہیں سوار اس سے باندھ دخل رکھتی ہے گنہگار کی تعذیر میں میخ
پُتلیاں دونوں نظر آتی ہیں کوکے[1] سی سیاہ کس کی حیرت نے جڑیں دیدۂ تصویر میں میخ

مصحفی گرچہ زمیں سخت تھی پر اس میں قلم
پھر بھی گاڑے ہے مرے دفترِ تحریر میں میخ

143

منچو[2] داغ تو ہے نالۂ تاثیر میں میخ کیوں کہ ٹھوکوں نہ میں چشمِ فلکِ پیر میں میخ
رسنِ زلف سے وابستہ ہے یوں یہ دلِ زار جیسے بے چوبہ کی ہو طوقِ گلوگیر میں میخ
واسطے چور کے بن جاوے وہی مارِ سیاہ اس کے گھوڑے کی اکھاڑے جو شب قیر میں میخ
وصل کی شب ہے زحل تو ہی کر اس سے یہ ہنسی گاڑ دے پیچھے سے دامانِ شبِ قیر میں میخ
سوکھے سہمے کو ستاتا ہے بہت جورِ فلک ضربِ شلّاق[3] سے خالی نہیں تقدیر میں میخ
ساقِ مجنوں کا یہ عالم نظر آیا، حدّاد جیسے لوہے کی رکھے یک سرِ زنجیر میں میخ

چاروں پایوں کے تلے مصحفی اس کے گاڑا
کام آتی ہیں پڑھیں عالمِ تسخیر میں میخ

د

144

سمجھتا ہے اس کو خدائے محمدؐ میں ہوں جان و دل سے فدائے محمدؐ
سمجھ قدرِ شاعر، بہ اخلاق پیش آ صلہ شعر کا ہے ردائے محمدؐ
برے وقت میں میں نے ہرگز نہ دیکھا کوئی داد رس ماسوائے محمدؐ
تبھی تو وہ ہر اک پہ ور[4] تھا عرب میں کہ تھا جبرئیل آشنائے محمدؐ

1۔ کوکا: کیل 2۔ منچو: ٹھوکنے والا، نیز ہتھوڑا 3۔ شلّاق: دُرّے لگانے والا 4۔ ور ہونا: غالب ہونا

نمازیں پڑھیں اتنی صانع کی اس نے — کہ آخر گئے سوج پائے محمدؐ
ہر اک رزم میں اس کو منصور پایا — اجابت قریں تھی دعائے محمدؐ
پیمبر سبھی با صفا تھے و لیکن — نہ تھی ایک میں بھی صفائے محمدؐ
کیا خون سے اپنے قرآں کو رنگیں — کہ عثمانؓ میں تھی حیائے محمدؐ
زبانِ قلم مصحفی گھس گئی ہے
کہاں تک لکھوں میں ثنائے محمدؐ

145

کیا خاک سوزِ دل سے کریں ہم فغاں بلند — اس آگ سے ہوا ہے نہ ہوگا دھواں بلند
شب سیر کرنے باغ کی آتا ہے شیر بھی — اپنا مچان باندھیو تُو باغباں، بلند
وہ بادشاہ وفوجِ ملک اس کی ہے سپاہ — جس نے کیے ہیں خیمۂ نہ آسماں بلند
چاہیں ہیں لے کے ماہ کو مٹھی میں دیں فشار — کرتے ہیں ہاتھ رقص میں جب مہ وشاں بلند
آتش سے رنگ گل کی شکایت ہے اب عبث — بلبل نے اپنا کیوں نہ رکھا آشیاں بلند
ان منعموں کو خاک نہ سوجھا زمیں کا پھیر — پستی میں بھی بنائے ہے کوئی مکاں بلند
قصرِ فلک پہ جس سے میں چڑھتا برائے سیر — ایسی نہ ہاتھ آئی کوئی نردباں بلند
ہوتے ہیں روز و شب مہ و خورشید جبہہ سا — کرسی سے کم نہیں ہے ترا آستاں بلند
دشمن نے کی ہے سامنے تیرے جو صف کشی — اے نالہ تو بھی کر عَلَمِ کاویاں[1] بلند
بلبل کی باغباں سے وصیت ہے بعد مرگ — گلبن سے باندھ رکھیو مرے استخواں بلند
آخر کو تکیہ خشتِ لحد ان کا ہووے گی — دو چار دن ہوں گر سرِ گردن کشاں بلند
بجلی کی کوندسی مری آنکھوں میں پھر گئی — جس دم ہوئی وہ تیغ دمِ امتحاں بلند
وہ پیل مال چرخ[2] میں آ پست ہو گئے — چلتے تھے ہاتھیوں پہ جنھوں کے نشاں بلند

1۔ عَلَمِ کاویاں : فریدوں بادشاہ کا پرچم جسے کاوہ کہار نے کھال سے بنایا تھا
2۔ مالِ چرخ (مالیدن=ملنا) مراد آسیائے چرخ

یہ اعتدالِ حسن کی مرضی نہیں کبھی سروِ چمن سے ہو قدِ سروِ رواں بلند
دامن کشی میں کیوں کہ کروں اس کی بہرِ داد کوتاہ دست نالہ مرا، آسماں بلند
لگتے ہی تیرِ غمزہ یہاں دل کے پار تھا ہم نے اُدھر سے ہوتے نہ دیکھی کماں بلند
کیواں[1] کو میری آہ پرو لے گی دیکھیو جس دم شبِ فراق ہوئی یہ سناں بلند
تربت پہ مصحفی کی لگا تھا یہ کس کا تیر
اب تک جو اس سے ہوتی ہے گردنشاں بلند

146

کہا تھا ایک دن اُس نے زبان سے "ناشاد"! گیا میں بس اسی غم میں جہان سے ناشاد
کہیں ہیں عشق جسے قیس و وامق و فرہاد ہوئی ہے خلق اسی دودمان سے ناشاد
یہ چاہتی ہے مروّت کہ بعدِ جاں دادن نہ جائے سگ بھی مرے استخواں سے ناشاد
گناہِ مادرِ گیتی، نہیں خدا نے مجھے زمیں پہ پھینک دیا آسمان سے ناشاد
کلی نے گل کی نہ دیکھا رخِ بہارِ مراد گئی وہ عاقبت اس گلستان سے ناشاد
ہوا ملالِ اسیراں فزوں مرے باعث گیا قفس میں جو میں آشیان سے ناشاد
ذرا ذرا سی روئی سب کو بانٹ دی تو نے رہا میں ایک ترے عطردان سے ناشاد
وہاں تو یار کے گھر غلغلہ ہے شادی ہے میں ہو رہا ہوں یہاں اپنی جان سے ناشاد
نہ مصحفی کو تہی پھیریو خداوندا!
گیا ہے کون ترے آستان سے ناشاد

147

کرے گا ذبح تو پھر کیا درنگ ہے صیّاد کہ جاں مری بھی اسیری سے تنگ ہے صیّاد
قفس تو میری اسیری کا تنگ ہے صیّاد میں کیوں کہ سر نہ دھنوں خانہ تنگ ہے صیّاد

1۔ کیواں: ایک سیارہ، نیز ساتواں آسمان

خزاں میں سوے چمن لے نہ جا قفس میرا کہ چوبِ گل مجھے لگتی خدنگ ہے صیاد
کیے ہیں چور اسیروں کے لاکھ شیشۂ دل یہ دل نہیں ترے پہلو میں سنگ ہے صیاد
خدا کے واسطے چاکِ قفس میں گل کو نہ رکھ کہ برگ گل مری چھاتی پہ سنگ ہے صیاد
حباب وار کوئی دم کا میہماں ہوں میں قفس کا در مجھے کام نہنگ ہے صیاد
ترا گلہ نہیں کچھ صلح کل کے عالم میں مجھے تو اپنے نصیبوں سے جنگ ہے صیاد
فراقِ گل ہے قفس کو مرے غلاف میں رکھ کہ مجھ کو منہ کے دکھانے کا ننگ ہے صیاد
جو چھوڑ دے تو مجھے فصل گل میں دکھلا دوں قفس سے تا بہ چمن اک شلنگ ہے صیاد
اسیر تازہ ہوں یادِ چمن دلا نہ مجھے کہ اشک خوں سے قفس لالہ رنگ ہے صیاد
عجب نہیں جو قفس ساتھ لے کے اُڑ جاؤں یہ جی میں سیرِ چمن کی امنگ ہے صیاد
خدا کے واسطے، اے بلبلِ اسیر! خموش کہ تیرے شور وفغاں سے تنگ ہے صیاد
نہ چھوڑتا ہے مجھے تو نہ ذبح کرتا ہے ستمگری کا کوئی یہ بھی ڈھنگ ہے صیاد
میں تیلیوں سے قفس کی گلا رگڑتا ہوں کہ تیرے تیغ تغافل پہ زنگ ہے صیاد
تو کر نہ فکر کہ صنعت سے اشکِ خونیں کی قفس میں گلشنِ چین و فرنگ ہے صیاد
خوشی سے کیوں کہ رہے مصحفی کا طائرِ دل
ہے باغباں جو ہیولیٰ دبنگ ہے صیاد

148

اتنا رہے تو عاشقِ مشتاق سے بعید یہ بات ہے صنم ترے اخلاق سے بعید
بندے کو تیرے اہلِ تنعم سے کیا ہے کام اک گوشے میں پڑا ہے وہ آفاق سے بعید
مشتاقِ وصل کی ترے حالت تباہ ہے کیا زہر خوردہ جی سکے تریاق سے بعید
پاے ثباتِ عقلِ فلاطوں پھسل نہ جائے دامن جو لہنگے کا وہ رکھے ساق سے بعید
پامال اس طرح نہیں کرتے کسی کا دل یہ چال ہے بتانِ سمن ساق سے بعید

کچھ چاہ کے مزے سے مگر آشنا نہیں وہ لب شکر جو رہتے ہیں عشاق سے بعید
گر مجھ کو زر کہیں سے دلا دے وہ مصحفی
یہ کب ہے مہربانیِ خلّاق سے بعید

149

مر ہی جانا ہے دلِ زار کا قصد نہیں معلوم کیا ہے یار کا قصد
ہاتھ پہنچا تھا شب اس بام تلک نہ کیا میں نے ہی دیوار کا قصد
نالہ جاتا ہے سوئے قصرِ فلک ہے اسے بامِ ہوادار کا قصد
اُڑ نہ جاویں وہ قفس کو لے کر جن اسیروں کو ہو گلزار کا قصد
وہ گر آتا نہیں تو تُو ہی کر
مصحفی کوچۂ دلدار کا قصد

ذ

150

خط کو شہدِ لبِ جاناں ہے لذیذ مور کو جوں شکرستاں ہے لذیذ
تنگی ان کو ہی مبارک جن کو نمش [1] سفرۂ شاہاں ہے لذیذ
سیبِ جنت سے ہمیں کام نہیں بوسۂ سیبِ زنخداں ہے لذیذ
شوق انگور خوری میں ہم کو سفرِ ملکِ صفاہاں ہے لذیذ
استخواں سخت تو ہوتا ہے ولے سگ کے وہ بھی تہِ دنداں ہے لذیذ
ہم ہیں واں خونِ جگر پر قانع جس جگہ نعمتِ الواں ہے لذیذ
مصحفی یاں عوضِ ماقوتی [2]
آش کشکولِ فقیراں ہے لذیذ

1۔ نمش : فیرنی 2۔ ماقوتی: سرخ رنگ کا پلاؤ (فیروز اللغات) ایک قسم کا حلوہ۔ یاقوتی: ایک مٹھائی، معجون

ر

151

زبانِ نالہ کش کس کی ہوئی سرگرم شیون پر
گدازِ موم کا عالم نظر آتا ہے آہن پر

نہ مجھ سا قدر دانِ ظلم ہوگا، میں وہ ہوں جس نے
دیے ہیں تازیانے کھا کے بوسے دستِ رہزن پر

چمک اے برقِ مے تو بھی ذرا اودی گلابی سے
سماں ہی زور اس دم چھا رہا ہے ابرِ گلشن پر

لگی تلوار چلنے اس ادا پر بانکے ٹیڑھوں میں
ذرا کج ہو کے بیٹھا تھا وہ کافر پشت توسن پر

اسیری گر مقدر ہے تو ہرگز غم نہ کھا اس کا
گراں لگتا نہیں قمری کو اپنا طوق گردن پر

شگفتہ تیرہ دل ہوتے ہیں صحبت سے حسینوں کی
جہاں آتش میں رکھا سرخی آجاتی ہے آہن پر

ہلالِ عید تب سے ہو گیا ہے سوکھ کر کانٹا
پڑی ہے آنکھ اس کی جب سے اس بازو کے جوشن پر

نشاں ہم دل جلوں کا کب مٹا ہے دیکھ تو جا کر
کہ شمع کشتہ کا اب تک دھواں باقی ہے مدفن پر

اگر سر پھینک دے تو کاٹ کر میرا، وہ عاشق ہوں
برنگ نے کروں پیدا میں آنکھیں اپنی گردن پر

رہے عشاق یک سُو مٹ گیا اس کا بھی نظارہ
ستم کرنے لگا مکڑی کا جالا چشم روزن پر

قدم یہ ہیں تو ٹھوکر کھائیں گے سرہائے مشتاقاں
روش یہ ہے تو تلواریں چلیں گی طرز رفتن پر

ملائم تربیت سے ہووے آخر سخت طینت بھی
کسے ہے تیغ تب جب محنتیں ہوتی ہیں آہن پر

کیا تھا جمع مال اپنا، مصیّب[1] یہ نہ سمجھا تھا
ستارے برق ہو ہو کر گریں گے میرے خرمن پر

فلک رہتا نہیں نازک دلوں کا بے جگر بیندھے
گزارا پھول کا ہوتا ہے آخر نوکِ سوزن پر

ہوئے بھسمنت لاکھوں خانۂ ہمسایہ جل جل کر
پڑے بجلی الٰہی اس فغانِ آتش افگن پر

نہ رہتا اک خیاباں میں وہ ہرگز گر سمجھ جاتا
نگاہِ گُل پڑی اب تک نہیں نرگس کی چتون پر

گر اس دہقاں پسر کے ہاتھ سے وہ ہم تلک پہنچا
کریں گے سجدۂ شکرانہ ہم سنگ فلاخن پر

1۔ مصیّب : ٹھیک سمجھنے والا، ذی فہم۔ غالباً یہاں معنی مطلوب کچھ اور ہیں۔

لگی آتش کو آتش، آبداں سب جوش میں آئے میں حالِ سوزِ دل لکھا تھا اک شب خشتِ گلخن پر
جو روے بت سے وہ پردہ اٹھادے جان بچ جاوے ہماری زندگی موقوف ہے دست برہمن پر

نہیں، اے مصحفی! رکھتے جو اسبابِ سفر ہمرہ
تجرّد میں انھوں کو حرف ہے عیسیٰ کے سوزن پر

152

ہزاروں کے رکھی غمزے نے سیدھی تیغ گردن پر ہزاروں جان سے مارے گئے اس الٹی چتون پر
سروہی ہے سیہ تاب اس کی مسّی کی دھڑی جس نے کمر باندھی ہے خوں ریزی کی خاطر برگ سوسن پر
سہاگے کی طرح اس کو جلا کر آب کر دیوے جو رکھ دوں آتشِ دل کا میں اپنی ذرّہ آہن پر
خرام ناز میں اس کے وہ پس کر ہو گیا سرمہ پڑا کس منخنی حورا کا دامن برگ سوسن پر
مصور نے غضب کھینچا ہے نقشا اس کی آنکھوں کا حیا قربانِ شوخی ہے، نگہ صدقے ہے چتون پر
شبیہ اس چشم کی مانی نے کھینچی اس لطافت سے کہ خونِ کشتگاں ثابت نہ ٹھہرا جس کی گردن پر
لٹیں اس زلف کی باہم گتھی یہ لطف دیتی ہیں سوار ایک اور ناگن دوسری ہو جیسے ناگن پر
ابھی ناقہ بٹھا کر اس کو محمل میں چڑھا لیوے کرے لیلیٰ نظر گر قیس کے پانو کی سوجن پر
جہاں دست جنوں نے ٹک چھوا بس وونہی چل نکلے مرے چاک گریباں سب کے سب عاشق ہیں دامن پر
عجائب کھیل اس جالی کے پیچھے اس کو سوجھا ہے کبھی ہے ہاتھ روزن پر، کبھی رخسار روزن پر
جو یہ رخ ہے، جو یہ لب ہے، جو یہ بینی ہے، یہ آنکھیں شگوفے سیکڑوں پھولیں ہی گے گلہاے گلشن پر
زری کی قور[1] سے باندھے ہیں جوڑے جوڑے والوں نے کہو بجلی کو جاوے یہ کسی دہقاں کے خرمن پر
نشاں یہ دل جلوں کا ہے ادھر کب جب صبا آئی کئی لالے کے گل پائے ترے عاشق کے مدفن پر
اٹھاوے گا تو اے جراح خفت دور ہو یاں سے کرے ہے خندہ زخمِ سینہ اپنا روے سوزن پر
جہاں میں کام بے قدروں سے نکلے ہے امیروں کا رفوے شال ہے موقوف اک اڈھی[2] کی سوزن پر
خدا سر سبز رکھے باغ کو اور باغباں کو بھی کہ جانِ طائراں ہے لوٹ آوازِ فلاخن پر

1۔ قور: گوٹ 2۔ اڈھی کی: مراد کم قیمت

نگاہ اس بت کی گر جادو بھری یہ ہے تو دیکھو گے لے آوے گی مسلمانوں کو بھی کیشِ برہمن پر
عرق حمام میں آیا جو اس کو اس خجالت سے پڑے سو سو گھڑے پانی وو نہی سکّانِ گلخن پر
زبانِ مصحفی گر لال ہے تو غم نہیں اس کا
برائے سینہ کوبی ہاتھ ہیں آمادہ شیون پر

153

دلِ معشوق ہے سختی میں غالب سنگ و آہن پر میں سِل سمجھوں اسے رکھ دے وہ برگِ گل جو مدفن پر
ہوس گو پانو پھیلاوے پہ کب چاہے ہے یہ ہمت طبیعت نازکش و قفے کی ہو دہقاں کے خرمن پر
تونگر سے جہاں میں فیض پہنچے ہے غریبوں کو ہجومِ خوشہ چیں ہوتا ہی ہے دہقاں کے خرمن پر
جواہر شوق سے پہنو، رکھو پر دھیان اتنا ہی نہ ہیرا پیس کر کھاوے کوئی ہیرے کی سمرن پر
نہ کیوں پھر اس میں پائے طائر نظارہ پھنس جاوے کہ واں اس چشم کا پھندا لگا رہتا ہے روزن پر
جو چاہا دل نے وہ ہم نے نہ چاہا واہ رے ہمت رہے گا حشر تک خونِ تمنا اپنی گردن پر
نہ دیکھے تا کوئی اس رتھ نشیں کو بل بے ہشیاری دوپٹا بھی کھنچا رہتا ہے اک اندر سے چلمن پر
نہیں آرام دیتی یاں تک اس کو حسن کی شوخی کہ بندھنے چھٹنے کا اک رنج ہر ساعت ہے چلمن پر
مکدّر طینتوں سے کام قلاشوں کا چلتا ہے مہوّس خود کھدا رکھتے ہیں نقشِ سکّہ آہن پر
سرِ دہقاں پسر کے گرد میں کس دن پھرا اتنا مری سرگشتگی کو رشک ہے بختِ فلاخن پر
وہ جب اس بت کی پیشانی کو صندل زیب کرتا تھا نگاہ ناز کج پڑتی تھی کچھ دستِ برہمن پر
بہانے غسل کے تم نے بلا کر کس کو مارا ہے جو چھینٹیں خوں کی آتی ہیں نظر دیوارِ گلخن پر
کوئی جن تو عناں اس کی ادھر کو کھینچ لاوے گا لکھیں گے ہم عزیمت اب کے نعل پائے توسن پر
کہر دے کا تماشا تجھ کو ہے منظور دکھلانا پتنگے چاک باندھیں کیوں نہ اس شب شمع روشن پر
تری شمشیر معجز آفریں کے کشتے گر اٹھے لکھیں گے خوں سے بے سرنامہ اپنا اپنی گردن پر
جو گوشِ گل سنے ان کو تو اپنی تیرہ بختی کے سخن دو چار ہیں اب بھی زبانِ برگِ سوسن پر

بہارِ گل میں مرنا مصحفی اس کے نہ کام آیا
نہ لایا پھول گل ہرگز کوئی عاشق کے مدفن پر

154

ہوں میں در سیر و سفر طرزِ نظر گہ زمیں، گہ چرخ پر طرزِ نظر
آہ چشمِ شرم گینِ یار کی دل میں کرتی ہے اثر طرزِ نظر
پیشِ مردم عشقِ پنہاں کی مرے ہے تمھاری پردہ در طرزِ نظر
عشق بازی صفحۂ کاغذ سے ہے تجھ بن اپنی رات بھر طرزِ نظر
اشکِ پے در پے سے اپنی بن گئی ہر مژہ سلکِ گہر طرزِ نظر
غمزۂ خونینِ خوباں کی سناں دل سے جاتی ہے گزر طرزِ نظر
تیر سی کس چشمِ کافر کی ہوئی دل پہ میرے کارگر طرزِ نظر
اک سلائی میں ہے جامِ جم کی سیر سرمہ کر وہ خاک در طرزِ نظر
رفت و آمد کا ہے اس کی عالم ایک ہے ہمارا نامہ بر طرزِ نظر
عرشِ اعلیٰ تک مری پرواز ہے گو نہیں رکھتا میں پر طرزِ نظر
مصحفی کی تو نے اک عالم کی دید
اب تو آنکھیں بند کر طرزِ نظر

155

دیکھ تو اے چشمِ تر طرزِ نظر برق سے یہ یا شرر طرزِ نظر
دل چُرا لیتی ہے مردم کا وونہی اور جاتی ہے مُکر طرزِ نظر
صورت وہمی دکھاتا ہے ہمیں یار کا موے کمر طرزِ نظر
پردہ چشم و زخم پر رہتا نہیں دل سے دیتی ہے خبر طرزِ نظر
چشمِ گویا کی ترے اے کم زباں سمجھے ہے ہر اک بشر طرزِ نظر

دل ہے تیرے ہاتھ میں یا دور بیں آسماں کی سیر کر طرزِ نظر
چشم مردم کش سے تیرے، اے صنم ہے مقامِ الحذر طرزِ نظر
مصحفِ رخسارِ جاناں کے تئیں بے طہارت مس نہ کر طرزِ نظر
ہستیِ پنہان و پیدا کی دلیل ہے بعینہ جلوہ گر طرزِ نظر
ہوں وہ نورِ بخت میں جس نور کا سات پردوں میں ہے گھر طرزِ نظر
ہے بتاں کی نرگسِ مخمور کی باعث نفع و ضرر طرزِ نظر
مصحفی ہے یہ شگفتہ کی زمیں
پر نہیں آتا نظر طرزِ نظر

156

کون سمجھا تھا کدھر طرزِ نظر اور گئی کیا کام کر طرزِ نظر
سوجھتا ہے یہ پھر آوے گی مجھے اپنی خاطر دربدر طرزِ نظر
اضطرابی میں دیا تھا اس کو خط آہی پہنچا نامہ بر طرزِ نظر
حسن کا گوہر چنا میں چھوڑ کر اشک کے غلطاں گہر طرزِ نظر
کچھ نہیں دیکھا پر اتنا سمجھے ہیں ہے نہیں اس کی کمر طرزِ نظر
اپنی منزل سے جو باہر بھی گئے تو کر آئے ہم سفر طرزِ نظر
کب سبک روحی ہماری ہے گراں عینکِ بلّور پر طرزِ نظر
پوچھ مت کچھ زاد کی میرے کہ ہے لختِ دل یاں دوش پر طرزِ نظر
دل لیا پھر جان کی گاہک ہوئی بل بے تیری مفت بر طرزِ نظر
آرسی میں کس سے ہے گفت وشنید کچھ تو دیتی ہے خبر طرزِ نظر
نیچی آنکھیں کر کے ڈالے کتنے مار بلہ بے تیری کتر طرزِ نظر
بے گناہوں کو تو کیا کرتی ہے ذبح کچھ خدا کا بھی ہے ڈر طرزِ نظر

کھو کے پیشِ عاقبت ہم نے کیا دیدۂ اعمیٰ میں گھر طرزِ نظر
دن اڑاتا ہے تجھے کرتی ہے رات قصہ تیرا مختصر طرزِ نظر
اس کی کج بینی وہی ہے مصحفی
کس دن آئی راہ پر طرزِ نظر

157

بے قراری ہے مری در پئے تدبیر آخر کھل ہی جاوے گی مرے پانو کی زنجیر آخر
خاتمہ حسن کا خوباں کے ہوا تجھ پر ہی تب تو صانع نے بنائی تری تصویر آخر
عیب کیا ساتھ پریشاں کے پریشاں جو ملے ہم بھی ژولیدہ ہیں، اے زلف گرہ گیر آخر
نگہِ یاس نے میری جو اثر اس کو کیا گر پڑی ہاتھ سے جلاد کے شمشیر آخر
مرغ زیرک کی بھی کچھ پیش نہیں جاتی، اسے دام میں کھینچ کے لے جاتی ہے تقدیر آخر
ہم بھی کیا جھوٹے ہیں، تھا ضبط کا کتنا ہمیں لاف خط شکایت کا کیا ہے اسے تحریر آخر
ساتھ اس کے جو کئی اشک جگر گوں بھی گرے رنگ لاوے گا مرا نالۂ شب گیر آخر
تیرے رخسار پر اس کی نگہِ حسرت تھی جب ہوا کشتۂ مژگاں دمِ تکبیر آخر
کیا خطا ہم سے ہوئی جو نہیں بولتے تم عفو بھی ہوتی ہے انسان کی تقصیر آخر
مصحفی یار کے ملنے سے تو نومید نہ ہو
کر رہیں گے یہ دمِ سرد بھی تاثیر آخر

158

اپنے صاحب سے مجھے ہے یہ گلہ آخرکار مستحقوں میں دیا مجھ کو ملا آخرکار
پرسشِ شعر و سخن تو نہ رہی، قدر ہو اب ہاں مگر بولنے لگیے جو ضلا[1] آخرکار
بانٹ دی صاف تو اوروں کے تئیں ساقی نے دُردِ تہِ شیشہ گیا مجھ کو پلا آخرکار

1۔ضلا : غالباً ضلع، مراد ضلع جگت

ناتواں آہ کو میری نہ سبک سمجھو تم — دبوے گی قائمۂ عرش ہلا آخرکار
نہیں جائے گا مرا رنجِ خموشی ضائع — گل کھلاوے ہی گا کچھ تو یہ دلا آخرکار
مصحفی کیا ہوا اوروں نے قبائیں پائیں
تو بھی شلوار کا پاوے گا صلا آخرکار

159

قلعۂ مجمر میں دیکھ جنگِ سپند و شرر — شب کفِ افسوس تھے چنگِ سپند و شرر
ہے حبش و روم میں فرق بہت درمیاں — حسن میں کیونکر ملے رنگِ سپند و شرر
اس رخِ گل رنگ پر رکھے جو خالِ سیاہ — لالہ رخوں کا ہو حسن ننگِ سپند و شرر
شیشہ دل کیا بچائے عاشقِ نازک مزاج — برسیں جب اس بزم میں سنگِ سپند و شرر
محفلِ ہستی سے کیا قافلہ کوئی چلا
مصحفی ہیں نالہ کش زنگِ سپند و شرر

160

قاتل نے پھر رکھی ہے سروہی جو سان پر — یارب یہ برق، دیکھیں گرے کس کی جان پر
افتاد تیری قتل کی یہ ہے تو وقتِ قتل — سر سیکڑوں گریں گے ترے آستان پر
شوخی میں تیری چشم کی بجلی کے ڈھنگ ہیں — گاہے نظر زمیں پہ، گہے آسمان پر
کتنوں کا دھکدھکی[1] سے بھی دم دھکدکے[2] میں ہے — کیا غش ہیں ایک ہم ہی ترے عطردان پر
تیغی نہ آئے واں سے تو نافذ ہوا یہ حکم — چڑھ جائے فوجِ غمزہ ابھی بردوان پر
غیروں کو پان دیتے ہو ہر وقت تم لگا — اک روز خون ہوگا اسی برگِ پان پر
دیکھا ہے کب میں گل کو یہ اس کا خیال ہے — کیوں برق کوندتی ہے مرے آشیان پر
باتیں چبا چبا نہ کرو تم چبا کے پان — سرخی لبوں کی لائے گی آفت دہان پر

1۔ دھک دھکی، دھگدگی: گلے کا ایک زیور 2۔ دھکدکا: گھبراہٹ، اختلاج

یک لحظہ چھوڑتا نہیں اس زلف کا خیال　　باندھی ہے کس بلا نے کمر امتحان پر
وہ سرگزشتہ ہم ہیں جو کرتے ہیں بعد قتل　　سر کو کٹا کے سجدہ ترے آستان پر
مجنوں کا دھیان لگ گیا قصابِ عشق کو　　بوٹی چڑھی جو اس کے تنِ ناتوان پر
لیلیٰ کے غم نے قیس میں باقی رکھا ہے کیا　　اک پوست رہ گیا ہے فقط استخوان پر

پھرتا ہے اس کے کوچے میں سرگشتہ مصحفی
آتا ہے رحم مجھ کو بہت اس جوان پر

161

جنسِ دل پر گرتے ہیں کم مایہ زردار آن کر　　دیکھ لیں گے جب کوئی ہوگا خریدار آن کر
مرغِ بستاں نے بس اتنی بات پر ہی جی دیا　　رہ گیا تھا برگِ گل اک زیرِ منقار آن کر
شاد تھے جب تک عناصر کا نہ تھا دام و قفس　　یاں ہوئے ہم کس خرابے میں گرفتار آن کر
لاگ تھی جب ان کو مجھ دیوانہ وحشی کے ساتھ　　جالیوں سے جھانک جاتے تھے وہ سو بار آن کر
اتنی فرصت بھی نہیں دیتا ہمیں چرخِ سفیہ　　کچھ تو ہم کر جائیں سودا سوے بازار آن کر
دم جو اوپر کا میں کھینچا بیمِ رسوائی سے رات　　کھنچ گئے مژگاں کو آنسو تا بہ رخسار آن کر
وصل تو ممکن نہیں پر اس در و دیوار ساتھ　　دل کو کر جاتے ہیں ہم خالی شبِ تار آن کر
گر یہی بیع[1] و شرائے حسنِ شہر آشوب ہے　　خاک چھانیں گے ترے کوچے میں تجار آن کر
خود گلے کا ہار وہ زخمِ حمائل ہو گیا　　صاف شانے پر جو بیٹھی اس کی تلوار آن کر
آبلے پانو کے سختی میں نہیں حصبا[2] سے کم　　سر چرا لیتے ہیں میرے زیرِ پا خار آن کر

مصحفی بارِ جفاے آسماں میں دب گیا
سر پہ اک مسکیں کے ٹوٹا غم کا کہسار آن کر

162

چونک اٹھا تھا زیرِ خنجر حلقِ بسمل دیکھ کر　　موند لیں آنکھیں میں آخر روے قاتل دیکھ کر

1۔ بیع و شرا : فروخت و خرید　　2۔ حصبا : چیچک کی اک قسم

کاتکی کے نہان میں اندیشہ حیراں رہ گیا اک مرقعے کا ورق بر لوحِ ساحل دیکھ کر
حسرتِ نظارۂ عاشق پہ لب کاٹا کیا آرسی میں اپنی وہ شکل و شمائل دیکھ کر
روشنی تھوڑی سی دیتا تھا سہا[1] پہلوے مہر چھپ گیا آخر کو غبغب کا ترے تل دیکھ کر
خواری و سرگشتگی پر اس کی میں نے رو دیا روحِ قیسِ ناتواں دنبالِ محمل دیکھ کر
کیا کہوں میں کتنا گزرا دل میں لیلیٰ کے گزند پانو میں مجنوں کے ناگن سی سلاسل دیکھ کر
سختیِ دوراں سے میں زیرِ زمیں دھنستا گیا بعدِ مُردن اپنی چھاتی پر دھری سل دیکھ کر

مصحفی کیا کیا نہ شب جی میں مرے گزرے خیال
اس حیا آگیں کو ہم بزموں کے شامل دیکھ کر

163

نہ گیا کوئی عدم کو دلِ شاداں لے کر یاں سے کیا کیا نہ گئے حسرت و حرماں لے کر
جی ہی جی بیچ بہت شاد ہوا کرتی ہیں تیرے عارض کی بلائیں تری مژگاں لے کر
کیا خطا مجھ سے ہوئی رات کہ اس کافر کا میں نے خود چھوڑ دیا ہاتھ میں داماں لے کر
باغ وہ دشتِ جنوں تھا کہ کبھی جس میں سے لالہ و گل گئے ثابت نہ گریباں لے کر
طرفہ سوجھی یہ جنوں کو ترے دیوانے کے راہ میں پھینک دیے خارِ مغیلاں لے کر
زلف و رخسار کا عالم ہی غضب ہے اس کے شاد ہوں کیوں نہ دل گبر و مسلماں لے کر
پردۂ خاک میں سو سو رہے جا کر افسوس پردہ رخسار پہ کیا کیا مہِ تاباں لے کر
ابر کی طرح سے کر دیویں گے عالم کو نہال ہم جدھر جاویں گے یہ دیدۂ گریاں لے کر
پھر گئی سوے اسیرانِ قفس بادِ صبا خبرِ آمدِ ایامِ بہاراں لے کر
دوستی تھی مجھے ہر اک سے، گئے تا درِ قبر دوش پر نعش مری گبر و مسلماں لے کر
رنج پر رنج جو دینے کی ہے خو قاتل کو ساتھ آیا ہے بہم تیغ و نمک داں لے کر

1۔ سہا : ایک دھندلا ستارہ

مصحفی گوشۂ عزلت کو سمجھ تختِ شہی
کیا کرے گا تو عبث ملکِ سلیماں لے کر

164

اس باغِ بے ثبات میں فکرِ مکاں نہ کر　بلبل، تو جمع خار و خسِ آشیاں نہ کر
عاشق ہوا ہے گر سنم پردگی پہ تو　رو دل ہی دل میں چشم سے آنسو رواں نہ کر
گزریں خوشی کے ساتھ مگر دن بہار کے　اے گل، تو یاد سیلیِ بادِ خزاں نہ کر
خونِ جگر تو عشق میں کھاتا رہا ہوں میں　ہم دم رقیب سے طلبِ برگِ پاں نہ کر
ان نالہ ہائے گرم سے جل جائے گا چمن　ہے ہے یہ ظلم بلبلِ آتش زباں نہ کر
فرہاد، پہلے سن لے مری داستاں ذرا　اپنی تو سرگزشتِ مصیبت بیاں نہ کر
کچھ آدمی کو مہر و مروت بھی چاہیے　آنے سے یاں کے منع مجھے، پاسباں، نہ کر
مت پھینک کوے یار سے مجھ کو ہزار کوس　دو چار دن تو یہ ستم، اے آسماں، نہ کر
کہتا ہے آئینے میں ترا عکس تجھ سے یوں　مجھ کو ہی دیکھ، سیرِ گل و گلستاں نہ کر
محمل نشیں کے خواب میں آجائے گا خلل　اتنا بھی شور، اے جرسِ کارواں، نہ کر
کیا لطف تلخ ہووے جو دو دم کی زندگی　وقتِ نشاط یادِ عدم رفتگاں نہ کر
نازک دلوں کے شیشۂ دل چور ہوگئے　پتھر سے سخت تر دلِ نا مہرباں نہ کر
جب تک بھی دم میں دم ہے رہے گا ترا خیال　نادان! ترکِ عشق کا مجھ پر گماں نہ کر
رکھ تُو تو دوستوں سے حساب اپنا مصحفی
کیا ذکر ان کا ہے، گلۂ دشمناں نہ کر

165

ذبح کر، پٹی مری آنکھوں کی قاتل، کھول کر　تا دمِ آخر تو تجھ کو دیکھ لوں دل کھول کر
سست بندش میں نہ کج ہو پشت ناقے سے کہیں　پھیر باندھ، اے سارباں! لیلیٰ کا محمل کھول کر

چوری چوری ناتے کو ہاکے ہے جس دم سوے نجد
پاس رکھ لیتی ہے زنگِ محمل کھول کر

خون جوشاں تھا لحد سے بس کہ اس کی تہ تلک
آشنا پچھتائے تربت کی مرے سل کھول کر

گر مرے جوشِ جنوں سے باخبر ہوتے رفیق
پھینک دیتے میرے پانو سے سلاسل کھول کر

آفریں ان کو جنھوں نے اس شہادت گاہ میں
بند کیں آنکھیں طلسمِ حق و باطل کھول کر

جب کیا خنجر گلے پر اس کے قاتل نے رواں
رہ گیا حیران، آنکھیں اس کا بسمل کھول کر

ہم نے قزاقوں کو بلوایا پئے تاراج آپ
اپنا اسبابِ سفر پائینِ منزل کھول کر

پھر کہاں پاوے گی یہ فرصت، نہالے اے پری!
موے سر جمنا میں تو بھی سب کے شامل کھول کر

لہریں سر پٹکیں تھیں دریا میں سحر وہ رشک ماہ
بند جامے کے کھڑا تھا روے ساحل کھول کر

عکس تیرا آرسی میں آپ حیراں رہ گیا
حسن و خوبی میں ترے آنکھیں مقابل کھول کر

گو مگو ہے ماجرا سوزِ دلِ پروانہ کا
بات کہتی ہی نہیں کچھ شمع محفل کھول کر

آرزو میں دید کی مرتے ہیں جوان کو دکھا
چہرہ اپنا ایک دن حورا شمائل کھول کر

جی بھرا آتا ہے میرا ضبط سے اے مصحفی
اور حیا رونے نہیں دیتی مجھے دل کھول کر

166

لے جا چمن میں میری تُو خاک کو اُڑا کر
اتنی تو آدمیت تو مجھ سے، اے صبا، کر

موج ہوا میں باہم جو تیغ چل رہی تھی
آئے گلی سے اس کی ہم تیغ میں نہا کر

اے آسیاے گردوں مت پیس مجھ کو اتنا
آٹا تو بن گیا ہوں آگے، نہ تو تیا کر

آئینہ اس نے اپنے جب ہاتھ سے نہ رکھا
ناچارا رہ گئے ہم آنکھوں کو ڈبڈبا کر

دلداری سے نہ میری قاتل نے ہاتھ اٹھایا
سینے پہ زخم مارے پر جاے دل بچا کر

خوبی تو طالعوں کی دیکھو کہ پھر گیا روٹھ
لائے جو اپنے گھر ہم اس شوخ کو منا کر

اے مصحفی یہ آنسو ضائع نہ ہونے پاویں
آنکھوں سے گر پڑیں تو دامن میں لے لیا کر

167

کتنوں کے سر پہ آفت لائے جبیں دکھا کر
کتنوں کو مار ڈالا پردے میں منہ چھپا کر

ہنگامِ تشنہ کامی سقائے دہر ہم کو
دیتا ہے کوئی قطرہ سو بھی لہو رُلا کر

پیچھے پڑی ہیں دل کے بے طرح میری آنکھیں
کیا جانے کیا کریں گی دریائے خوں بہا کر

آخر تو ایک دن ہے سر پر کھڑی جدائی
اے چرخ ہم سے اس کو جیتے تو مت جدا کر

میں نے کہا تھا اس سے احوالِ گریہ اپنا
سنتے ہی ہنس پڑا وہ یکبار کھلکھلا کر

کی جس سے آشنائی وہ خود غرض ہی نکلا
آخر ہوئے پشیماں ہم اس سے دل لگا کر

اے مصحفی دیا ہے گر دل کسی کو تو نے
اس بات کا تو چرچا، ناداں! نہ جابجا کر

168

میں کیا وہ ہوں جو زباں وا کروں تلاش بغیر
کہ اپنی نبھتی نہیں جنسِ خوش قماش بغیر

شہیدِ گل کا جنازہ مگر ہے اُٹھنے پر
نہیں ہے ایک کلی جو گلاب پاش بغیر

یہی ہے ناخنِ دستِ جنوں کی گر کاوش
نہ پائے گا کوئی چہرہ مرا خراش بغیر

تو پہلے اوروں سے ہم کو ہی ذبح کر قاتل
نہ ہوگی رونقِ مشہد ہماری لاش بغیر

کسی کا قتل تو منظور اس سے ہے ان کو
جو ان دنوں نہیں رہتی ہیں وہ تراش بغیر

بہ اضطراب میں کہنے لگا جو حال اپنا
کہا نہ اس نے بھی کچھ "دور باش باش" بغیر

مریضِ غم کی نہ آیا وہ جب کہ بالیں پر
زباں سے حرف نہ نکلا کچھ اس کے کاش بغیر

نہیں ہیں مطبخ شاہاں کی چشم دوختہ وہ
جو بیٹھ رہتے ہیں پی خونِ دل کو آش بغیر

وہ دن گئے کہ میں کھاتا تھا خونِ دل پنہاں
نہیں ہے اک مژہ اب لختِ دل کی قاش بغیر

یہ خوئے ظلم ہے اس میں کہ خط کا عاشق کے
کبھی لفافہ نہ کھولا قلم تراش بغیر

ہے تربیت کدۂ امتحاں ضرور ہمیں
کہ ظرفِ خام گلی پختہ ہو نہ واش[1] بغیر

1۔ واش : بھٹی، پژاوہ، آوا

عدوے فکرِ سخن مصحفی نہیں کوئی
مرے خیال میں تو تنگیِ معاش بغیر

169

پہنچا قریبِ مرگ تو میں تجھ کو چاہ کر — تو ابتداے عشق پہ میری نگاہ کر
اے دل! شبِ فراق پھر آئی ہے سو نہ رہ — میں نالہ سر کروں تو مرے ساتھ آہ کر
اوروں سے ہم کلام تو ہوتا ہے ہر کہیں — مجھ سے بھی کوئی بات تو اے رشکِ ماہ! کر
میں تیرہ بخت آپ ہی ظلمت نصیب ہوں — اے دودِ آہ تو نہ مرا گھر سیاہ کر
ظالم تو رحم کھا مرے احوال پر کبھی — اس سے زیادہ اور نہ مجھ کو تباہ کر
رہتے ہیں ساکنانِ قفس منتظر ترے — بادِ صبا! ادھر بھی گزر گاہ گاہ کر
گو خلق جانے عاشقِ فاسق تجھے، دلا! — عصمت کا اپنی اپنے خدا کو گواہ کر
اے مصحفی اگر وہ لگاتا ہے تجھ پہ تیغ
جاے سپر تو ہاتھوں کو اپنے پناہ کر

170

تلوار کو سج کر تُو نہ بن یار بہادر — کتنے کی اجل مرتے ہیں تلوار بہادر
ہر آبلہ پا سے مرے رکھے ہے کاوش — صحراے جنوں کا ہے ہر اک خار بہادر
چڑھتا نہیں کچھ سوچ کے رستم بھی منہ اس کے — از بس ہے ترا غمزۂ خوں خوار بہادر
صحراے شہادت میں جو قاتل کہیں مل جائے — سر دینے سے کرتے نہیں انکار بہادر
دل لختِ جگر پر کوئی منہ آتا ہے، سچ ہے — نامرد کا ہوتا ہی نہیں یار بہادر
بوسوں کی لڑائی میں نہیں موڑتا منہ کو — ہے بس کہ شبِ وصل مرا یار بہادر
محبوس نہیں رہتے وہ زندانِ ابد میں — جو پھاندتے ہیں قلعے کی دیوار بہادر
تلوار لیے ہاتھ میں دھمکانے کو تیرے — آیا ہے وہ گر بن کے دھواں دھار بہادر

ہوں مصحفی اس شوخ کے لب زخم رسیدہ
لے بوسے تو آج ایسے ہی دو چار بہادر

171

ہے ترے عارض کی سرخی دین و ایمانِ بہار　ہو تو مہمانِ چمن اک شب تو اے جانِ بہار
چاک ہے موجِ تبسّم سے گریبانِ بہار　ہے ترے ہونٹوں کی سرخی آفتِ جانِ بہار
گل فروشوں کی دکاں تک جا کے بلبل مر گئی　یوں نکالا فصلِ گل میں اس نے ارمانِ بہار
رو کے اشک سادہ پھر روتی ہیں آنکھیں لختِ دل　آب میں کرتے ہیں ہم سیرِ گل افشانِ بہار
تیرے ہنسنے کی ادا نے کر دیا ان کو خجل　بے حیائی سے ہیں وا اب لعلِ خندانِ بہار
تیغ کھینچی کس کے یہ دزدِ حنا نے باغ میں　خونِ بلبل موجزن ہے تا گریبانِ بہار
اشکِ رنگیں نے ہمارے کر دیا پامال اسے　تھی گلِ تکمہ سے گو زیبِ گریبانِ بہار
گر یہی مستی ہوا میں ہے تو اک دن دیکھیو　تیغِ موجِ گل کرے گی خونِ مستانِ بہار
باغ میں مجھ کو نہ لے جاؤ کہ ہوں میں دردمند　نالۂ مرغِ قفس ہوگا نہ شایانِ بہار
پرتوِ افگن ہے شفق پر سرخیِ گلہائے سرخ　تا فلک پہنچا ہے جوشِ رنگِ طوفانِ بہار
ہیں جو غنچے فندقِ دستِ نگاریں کی شبیہ　اس سبب عاشق کے بھی سر پر ہے احسانِ بہار
ہر طرف اثمار مہتابی کے سر ہیں لوٹتے　جنگ کا میداں نظر آتا ہے میدانِ بہار
اس کی انگشتانِ فندق بند کے عالم کو دیکھ　ہاتھ مل کر رہ گئے بس نخل بندانِ بہار
ہے یقیں مجھ کو لبِ جو میں جو عکسِ گل پڑا　خار ماہی سبز کر دیوے گا طغیانِ بہار
ایک دم تابِ وصالِ گل وہ لا سکتے نہیں　جب بہار آتی ہے مر جاتے ہیں مرغانِ بہار
جان دے چکتے ہیں پہلے چھوڑتے ہیں تب اسے　ہاتھ سے آساں نہیں ہم دیتے دامانِ بہار
کوئی گل مہندی فندق ہے بتاں کے پانو کی　ان کے قدموں سے لگا رہتا ہے سامانِ بہار
برگ برگِ گل چمن میں ہاتھ مل کر رہ گئے　اک تبسّم وار تھا از بس کہ دورانِ بہار

مصحفی اس باغ سے کچھ زر لگے اپنے بھی ہاتھ
اشرفی کا گل اگر ہو خانِ سامانِ بہار

172

چھاونی چھانے پہ ہیں اس سال فرمانِ بہار
آشیاں بندی کے ہیں مصروف مرغانِ بہار

قطرہ قطرہ اشک گرتا ہے (جو اس کی چشم سے)
گریۂ عاشق میں ہے سامانِ بارانِ بہار

جھولیاں بھر بھر کے گل چیں لے گئے گلشن سے پھول
رہ گیا آخر لٹا کھسٹا سا میدانِ بہار

اور چوبِ گل سے اس کا ہووے ہے سودا فزوں
سودمند آتا نہیں مجنوں کو درمانِ بہار

گل ہے یا لالہ ہے جو کچھ رنگ روئے یار ہے
لالہ و گل پر عبث رکھا ہے بہتانِ بہار

باغ بے برگ و نوا کیوں کر نہ پھر آوے نظر
گل جھڑے ایدھر، موئے اودھر نوا خوانِ بہار

گل کی پتی کھائے اور اخگر کی لذت بھول جائے
مرغ آتش خوار بھی گر ہووے مہمانِ بہار

لالہ ایک اک گز زمیں سے ہوا پر موجزن
جوش پر ہے ان دنوں خونِ شہیدانِ بہار

زعفرانی رنگ آتا ہے نظر صحنِ چمن
گیندہ بازی کے جو ہیں مشغول طفلانِ بہار

باغ میں مت لے چلو مجھ کو نہ ہوگا مجھ سے یہ
ساتھ میں شبنم کے دیکھوں گا گریبانِ بہار

خار کی سوزن رگِ گل سے ہوئی ہے رشتہ دار
ہے جو اس کو فکر جز بندی دیوانِ بہار

زردیِ رخسارۂ گل دیکھ بلبل مر گئی
چھوڑنا تھا کیا اسے صیّاد پایانِ بہار

چشم نرگس، چہرہ گل، غنچہ دہن، لب برگِ گل
کیوں بہارِ گل نہ ہووے تیرے قربانِ بہار

اوّلِ موسم رہا صیّاد نے ان کو کیا
ہے اسیرانِ قفس پر اتنا احسانِ بہار

وہ جو جانے پر ہٹی[1]، ہرگز نہ ٹھہری پھر ذرا
دیر تک کھینچا صبا نے گرچہ دامانِ بہار

مصحفی لالے نہیں دستے قزلباشوں کے ہیں
کیا خزاں سے جنگ کو نکلا ہے سلطانِ بہار

1۔ ہٹی: یعنی ضد کرنے لگی

173

غنچوں نے ٹوپی پھینک دی ترچھی کلاہ پر
گل ہنس پڑے چمن میں تری قاہ قاہ پر

کج رو سے کج روی نہیں جاتی بہر طریق
ٹیڑھا چلے ہے سانپ سدا سیدھی راہ پر

میں کس حساب میں ہوں صنم! لوٹ پوٹ ہے
بجلی کی کوند بھی تری طرزِ نگاہ پر

اللہ رے شانِ عفو حجاب اس کو آ گیا
قطرے عرق کے دیکھ جبینِ گناہ پر

دیکھا چمن میں قطرۂ شبنم کا رنگ ڈھنگ
چنّی [1] بنی ہے گل پہ تو سبزہ [2] گیاہ پر

مستوجبِ عذاب میں ہوں گرچہ، اے فلک
تھوڑا سا رحم بھی مرے حالِ تباہ پر

گر ہے یہی تغافلِ معشوق مصحفی
ہو کر سپید آوے گا زاغِ سیاہ پر

174

کل شوق لے گیا تھا مجھے وعدہ گاہ پر
بجلی پڑی نقاب کے اٹھتے نگاہ پر

پڑتا گمانِ لطف ہے اس کی نگاہ پر
آتی چلی ہے طالعِ خوابیدہ راہ پر

وہ سنگ دل نہ رام ہوا اور میں مر چلا
پتھر پڑیں کہیں دلِ شیدا کی چاہ پر

دیکھا ہے اس کا سبزۂ خط خواب میں مگر
منہ ڈالتے نہیں ہیں جو آہو گیاہ پر

دشمن فقیر کی ہے سیہ بختیِ فقیر
اکثر گرے ہے برق گلیم سیاہ پر

جب تک نہ تیرے ہاتھ پہ گھس لیوے وہ جبیں
کچھ جذب کہربا نہ چلے برگِ کاہ پر

یوں دیکھتا ہوں دیدۂ حسرت سے اس کو میں
جیسے نظر گدا کی رخِ بادشاہ پر

ہم ہیں ازل سے شیفتۂ حسنِ خوش ادا
اپنی نظر نہیں ہے سپید و سیاہ پر

تاجِ شہی ہے دست خوشِ انقلابِ دہر
نازاں نہ ہو تو بھان متی کی کلاہ پر

میں کر کے اس سے دعویِ دل منفعل ہوا
لکنت سی آ گئی جو زبانِ گواہ پر

1۔ چنّی: ریزۂ عقیق 2۔ سبزہ: سبز رنگ کا قیمتی پتھر، پنّا

تیغ قضا کرے ہے زرہ پوش کو دونیم بھولا ہوا ہے کیا تو سپر کی پناہ پر
سرو چمن کے جا کے گلے میں لپٹ گیا خفت اٹھائی رات ترے اشتباہ پر
بے ہیچ بھی نہیں ہے یہ ہنگامۂ سپہر کرنا نظر ضروری ہے گردِ سیاہ پر
مارے نہ مجھ کو دستِ حنائی کی آرزو ہوتے رہے ہیں خون سدا حبِ جاہ پر
یہ زور ایک رند نے تضحیک کی کہ رات توڑا خُمِ شراب درِ خانقاہ پر
کر ذبح اس کو، شوخی تو تم اس کی دیکھیو پر مرغِ نامہ بر کے رکھے ہیں کلاہ پر
کچھ کم نہ ہوتی شان جو زیب اپنی دیکھتا گل رکھ کے ایک دن پرِ بلبل کلاہ پر
ابرو سے کہہ کہ درپے قتلِ فلاں نہ ہو تلوار کھینچتا ہے کوئی بے گناہ پر
کاجل ہی کے لگاؤ میں رکھتا ہے تیرا دھیان عاشق ہے آئنہ تری چشمِ سیاہ پر
چینِ جبیں پہ چٹخیں ہیں لہروں کی انگلیاں صدقے ہے ماہِ نو تری طرفِ کلاہ پر

کیا کام آسماں سے مجھے، میں نے مصحفی
خورشید و ماہ دیکھے ہیں پنگھٹ کے چاہ پر

175

لذتِ شعر وسخن ہوتی ہے بیکاری میں اَور رات کو اس کا مزہ ملتا ہے بیداری میں اَور
کاش کہ وہ بھی ہمارے سامنے ہی ہوچکیں گردشیں باقی ہیں جتنی چرخِ زنگاری میں اَور
التجا کرنی نہیں پڑتی کسی اشراف کی ہم نے اک آرام دیکھا ذلت وخواری میں اَور
گاہے گاہے روٹھ جانے کا تو عالم تھا ہی لیک ہے مزہ تیری صنم ہر دم کی بیزاری میں اَور
اس طرف ہم ہوں گے رخصت اُس طرف تو جائیو کاٹ لے اے شمع اک شب گریہ وزاری میں اَور
دمبدم کرتا ہے جو دعوی تری رفتار سے ڈھنگ ہیں شاید روش کے کبکِ کہساری میں اَور
سوجھے ہے آخر کو بچنے کا نہیں تیرا مریض کٹتے ہیں مسکیں کو دن دو چار بیماری میں اَور
جال مارا تھا ہوا پر گیسوے صیاد نے بچ رہے ہم آ گئے دامِ گرفتاری میں اَور

مصحفی آخر تو تن چھوڑے گا نفسِ ناطقہ
چند روزہ رہ لے تو اس چار دیواری میں اَور

176

پانو رکھتا ہی نہ تھا گھر سے جو دلبر باہر — نکل آیا مری آواز کو سن کر باہر
داغِ دل شب کو جو بنتا ہے چراغِ دہلیز — روشنی گھر میں مرے رہتی ہے اندر باہر
لے گئی چشم سیہ کر کے مرے دل کو شکار — نہ گیا پنجۂ زمّج [1] سے کبوتر باہر
ہوسِ نامہ بری میں مری مرتا تھا تبھی — ابھی بیضے سے نہ نکلا تھا کبوتر باہر
شمع کے پاس جو آنے نہیں دیتی فانوس — گرد پروانے پھرا کرتے ہیں باہر باہر
دفعتاً دیدۂ فصاد سے خوں آنے لگا — اس نے پردے سے کیا ہاتھ جو چھپ کر باہر
ہے تصور وہی مژگاں کا تب آوے کچھ چین — یہ خلش دل سے نکل جائے جو کافر باہر
سگِ ناپاک سا پاس اس کے جو جاتا ہے رقیب — دیکھتے ہی اسے کہتا ہے وہ باہر باہر
جن دنوں جذبِ محبت میں اثر تھا میرے — آئے تھا در سے نکل شب کو وہ چھپ کر باہر
خواہشِ وصل میں دی جان تڑپ کر میں نے — دیر قاتل کا ہوا میان سے خنجر باہر
کر ہدف اس کو جو اس شوخ نے آ کر دیکھا — تیر تھا سینۂ عاشق سے سراسر باہر
خارِ صحرائے جنوں تیز روی کے باعث — پشتِ پا سے بھی نکل آتے ہیں اکثر باہر
سبزۂ خط کا نہ انبوہ سمجھ اس رخ پر — خسروِ حسن کا نکلا ہے یہ لشکر باہر
اس نے ہر چند رکھائی تو بتائی مجھے لیک — بزم سے کر نہ سکا پیار کا تیور باہر

مصحفی یہ وہ غزل ہے جو شگفتہ نے کہی
تھے جنازے سے تہی دستِ سکندر باہر

177

تھا رقص بسملوں کا تری انجمن میں زور — تڑپا کیے ہیں رات پتنگے لگن میں زور

1۔ زمّج : کبوتر بازی کی کوئی اصطلاح۔ (لغت میں نہیں ملا)

اتنے کشادہ پائچے پاجاموں کے نہ تھے — ایجاد ہوتے جاتے ہیں اب کے چلن میں زور
پیچوں سے جس کے دل کا نکلنا محال ہے — پھندے ہیں تیری زلفِ شکن در شکن میں زور
اٹھے نہ حشر کو بھی ترے کشتگانِ ناز — کنجِ لحد میں سوئے لپٹ کر کفن میں زور
نافے ہوئے ہیں کیا تری زلفوں سے فیض یاب — اک بوے ناز آتی ہے مشکِ ختن میں زور
عاشق کی جان لوٹی ہی جاتی ہے جن پر آہ — آتی ہیں نکہتیں ترے سیبِ ذقن میں زور
بوسہ ہر ایک عضو کا معشوق کے، دلا! — شیریں ہے پر اک اور مزہ ہے دہن میں زور
کھینچے تھا اشتیاق سے دامانِ گل کو خار — دیکھا یہ ہم نے رات تماشا چمن میں زور

پیری نے خشک و قاق[1] کیا اب تو مصحفی
ہم تھے جواں تو تھا کبھی اپنے بدن میں زور

178

ہوتا ہے جو اس باغ میں گل کوئی ہوادار — جوں بادِ صبا اس کا میں بنتا ہوں ہوا خوار
گویا کہ ڈبوئی ہوئی ہے خون میں میرے — اس پنجۂ رنگیں کی ہر انگشت حنادار
چاہوں ہوں شبِ ہجر کروں نالہ و لیکن — ہمسایوں کی ایذا کا نہیں خود میں روادار
عاشق تو وفا کرتے ہی آئے ہیں بتاں سے — یہ حق کی عنایت جو ہو معشوق وفادار
ہے خاک میں ملنے کا سر انجام بلندی — محکم وہی ہوتی ہے جو دیوار ہو پادار
معشوق سے گو دور تو ہوں میں یہ یقیں ہے — چاہے تو ملا دیوے ابھی قدرتِ دوّار
افلاس کی کیا اس سے زیادہ ہو اذیّت — رہتا ہے سدا دار پہ یاں مردمِ نادار
یوں کھب گئی ہے دل میں مرے پنکھڑی گل کی — جس رنگ کوئی صاف نگینہ ہو جلا دار
پھر کیوں ہے بپا خیمۂ زنگاریِ گردوں — گر ہم شبِ ہجراں میں نہیں دل کے عزادار
نامے بہ جہاں ماندہ و دیگر ہمہ ہیچ است — حلاج کجا مردِ غریبی و کجا دار

1۔ قاق : لاغر

گل ہی کے لجائے ہوئے عارض کبھی دیکھے ق نرگس ہی کی خوش آئی کبھی آنکھ حیادار
گل پھول سے جی لگ ہی گیا مصحفی اپنا
ہرچند کہ یہ باغ نہ تھا اتنا فضا دار

179

عاشق ہی کا فقط نہ گریباں ہے تار تار معشوق کی بھی زلفِ پریشاں ہے تار تار
پہنا ہے جب سے تارکشی کی کلاہ کو اُس گل کا[1]، تب سے اپنا گریباں ہے تار تار
رختِ شہی میں نکلے ہے رنگِ جنونِ عشق تارِ زری سے خلعتِ سلطاں ہے تار تار
دیکھا ہے جب سے طرّۂ دستارِ یار کو جیبِ قبائے مہرِ درخشاں ہے تار تار
گھنڈی ازار بند کی لچھی کی اس کے دیکھ پیراہنِ صبوریِ یاراں ہے تار تار
زیبِ بدن ہے اس کا جو پیراہنِ کتاں گردوں پہ جوں کتاں مہِ تاباں ہے تار تار
دیوانی ہوگئی ہے اسے دیکھ ساری خلق تنہا نہ جیبِ گبر و مسلماں ہے تار تار
اے مصحفی کسی کی سنانِ نگاہ ہے
نورِ نظر بصورتِ مژگاں ہے تار تار

180

نہیں سیرِ گل و گلزار کی خاطر منظور زندگی ہے تو مجھے یار کی خاطر منظور
کچھ سمجھ جی میں وونہی کبکِ دری بیٹھ رہا تھی اسے جو تری رفتار کی خاطر منظور
تجھ سے گر شیخ و برہمن ہوں خفا وہ جانیں ہے کسے سبحہ و زنّار کی خاطر منظور
ایسی شدت سے جو اس سال میں باراں برسا کیا نہ تھی کچھ در و دیوار کی خاطر منظور
برخلافی میں رہا دورِ فلک اس کے تئیں
کب ہوئی مصحفیِ زار کی خاطر منظور

1۔ اُس "گل کا" (قیاسی)

ڑ

181

سر کا جُوڑا اس کا ہے کالا پہاڑ　　موتیوں کا کان کا بالا ہے جھاڑ
انتظارِ آمدِ دلبر میں رات　　صبح تک ہم نے کھلے رکھّے کواڑ
زلف سنبل پیشِ کاکل ہے طویل　　سرو عرعر[1] نسبت اس قد کی ہے تاڑ
ہم سے بندھانی[2] اگر جیتے رہے　　آسماں کے قصر کی باندھیں گے پاڑ
کیا بری خو ہے کہ ہم کو دیکھ کر　　منھ چھپا لیتے ہو تم زلفوں کی آڑ
یاں کی آبادی کا عالم کچھ نہ پوچھ　　دہر لگتا ہے مجھے اس بن اُجاڑ

مصحفی دیوان ہفتم میں مرے
ہر غزل کا شعر ہے کٹی پچھاڑ

182

ہے بلا زلفِ پریشاں کی اکڑ　　اور غضب ان موے پیچاں کی اکڑ
ہاتھ سے عاشق کے جب کھائے ہے مار　　تب کہیں نکلے ہے درباں کی اکڑ
اپنے اپنے کیش پر بل بے غرور　　دیکھیو گبر و مسلماں کی اکڑ
مجھ کو وہ سروِ سہی مطلوب ہے　　جس میں نکلے نوجواناں کی اکڑ

مصحفی خدمت پر اپنی ہے بجا
بندگانِ خاصِ سلطاں کی اکڑ

1۔ عرعر: ایک درخت Cypren، سروِکوہی، چیر کا درخت

2۔ بندھانی ربندھانے : باندھنے والے؟

ز

183

ماتم میں سنی ہووے گی جنّات کی آواز
جاتی ہے بہت دور تک رات کی آواز

نے ساز، نہ سازندہ، نہ رقاصہ ہے آپھی
آتی ہے چلی سازِ طلسمات کی آواز

دشنام کے بعد اس کا میں بوسہ جو لیا تھا
اس بوسے میں نکلے تھی مکافات کی آواز

جب سوے چمن جاتے مجھے اس نے پکارا
پہچان گیا میں وونہی وہ گھات کی آواز

اس طفل نمازی کے جو کوچے میں گیا میں
آئی در و دیوار سے صلوات کی آواز

اغلب تری خلوت میں صنم رات کوئی تھا
کچھ آتی تو تھی حرف و حکایات کی آواز

سن کر وہ مری بات کو یوں غیر سے بولا
ہے یہ تو اسی کافرِ بد ذات کی آواز

ارگن کے تئیں جس نے بنایا ہے رکھے ہے
ہر پردے میں سو ساز مقامات کی آواز

کھنڑانیاں ساون میں جو گاتی تھیں غضب تھی
وہ شوخ گلی اور وہ برسات کی آواز

نامردی سے اڑ جائے ہے یہ[1] طائر وحشی
آتی ہے ہوا سے بھی اگر بات کی آواز

اس نرمیِ گفتار کے صدقے میں کہ ہرگز
کانوں تلک آئی نہ تری بات کی آواز

تلخی ہی سے بولا، لبِ شیریں سے میں اس کے
ہرگز نہ سنی لطف و عنایات کی آواز

اندازِ سخن نے ترے سو مردے جلائے
عیسیٰ میں کہاں تھی یہ کرامات کی آواز

شب جا کے مگر مصحفی مسجد میں رہا تھا
تا صبح دم آتی تھی مناجات کی آواز

184

دل تو لگتا ہے مرا کوچۂ جاناں میں ہنوز
عہدِ پیری بھی ہیں سو چاک گریباں میں ہنوز

پانو رکھا نہیں وحشت کے بیاباں میں ہنوز
الفتِ لیلیٰ و مجنوں ہے دبستاں میں ہنوز

1۔ یہ (قیاسی)

عندیہ اپنے نے انساں کو کیا ہے رسوا	تب تو یہ تفرقہ ہے گبر و مسلماں میں ہنوز
خط کے آنے پہ بھی ہے حسن کا اس کے وہی رنگ	سیر کرتی ہے نظر روضۂ رضواں میں ہنوز
گرچہ پیری نے مرا رنگ کیا خاکستر	طرفہ آتش ہے دبی سینۂ سوزاں میں ہنوز
امتحاں شوق کا مجنوں کے مگر کرتا ہے	ناقہ آتا ہے ٹھہرتا جو مغیلاں میں ہنوز
خط کے آتے وہ ملاحت نہ رہی لب کی ولے	گرد پس ماندہ سی باقی ہے نمکداں میں ہنوز

مصحفی اپنے نصیبوں کا کروں کیا شکوہ
ہے گزارا تو مرا مجلسِ خوباں میں ہنوز

185

شوق فنا جو ہے دلِ بیتاب میں ہنوز	مردے نظر پڑیں ہیں مرے خواب میں ہنوز
ظاہر ہے بے ثباتیِ دنیا تو اس پہ ہائے	دل لگ رہا ہے عالم اسباب میں ہنوز
سردی کا چاندنی کی بھی اس کو رہا ہی ڈر	نکلا نہیں وہ مہ شب مہتاب میں ہنوز

دل گرم و سردِ دہر سے کب محترز ہوا
آتش میں ہوں کبھی تو کبھی آب میں ہنوز

186

منھ وصل کی شب مجھ کو دکھاتی نہیں ہرگز	میں جان سے جاتا ہوں وہ آتی نہیں ہرگز
پانی جو اچھال اس کے تئیں دیوے ہے، ہے ہے	مردہ مرا آتش بھی جلاتی نہیں ہرگز
جس شکل کو دل میں نے دیا بل بے فراست	وہ خواب میں بھی شکل دکھاتی نہیں ہرگز
سَو فتنے اٹھاتی ہے ترے پانو کی ٹھوکر	پر خفتہ نصیبوں کو جگاتی نہیں ہرگز
تا کھینچے نہ تصویر وہ، شاپور کو شیریں	پردے میں بھی آواز سناتی نہیں ہرگز
لیلیٰ کو خوش آیا ہے جو انداز کچھ اس کا	مجنوں کا گریبان سلاتی نہیں ہرگز
کیا اس کی طبیعت بھی الگ مجھ سے پڑی ہے	خاطر میں مری بات تو آتی نہیں ہرگز

ہے حور و پری دخترِ رز کون ہے کیا ہے جو رستے میں منہ اپنا چھپاتی نہیں ہرگز
گو کھاتی ہے مژگاں سے طمانچے بھی مری چشم نظّارے سے پر ہاتھ اٹھاتی نہیں ہرگز
اے مصحفی اس گردنِ مغرور سے ڈر ہے
سجدے میں جو سر اپنا جھکاتی نہیں ہرگز

187

تمام موسمِ برسات میں ہے صحرا سبز نہ سبزہ چاٹ کے کس طرح ہووے حربا[1] سبز
نشے میں بنگ کے آنکھیں گئی ہیں جو چرنے نظر پڑے ہے زمین آسمان سارا سبز
میں جانوں جب ترے کشتے کو وہ جلا دیوے سخن کو اپنے کیا چاہے گر مسیحا سبز
جو سبز رنگ ہیں سرخیِ خوں نہ ان کو پھبے شرابِ سرخ سے پھبتا ہے کتنا مینا سبز
جمے ہے زنگ انھوں پر جو بے تردد ہیں نہ دیکھا میں کہ ہو کاہی سے آبِ دریا سبز
فراقِ یار نے یوں مجھ کو کر دیا مسموم ہوں زہر خوردہ کے جیسے تمام اعضا سبز
موئے ہیں مصحفی جو یادِ قدِ جاناں میں
انھوں کی خاک سے ہوتا ہے نخلِ طوبا سبز

س

188

ہو چکا ناز، منہ دکھایئے بس غصہ موقوف کیجیے، آیئے بس
فائدہ کیا ہے یوں کھنچے رہنا میری طاقت نہ آزمایئے بس
"دوست ہوں میں ترا" نہ کہیے یہ حرف مجھ سے جھوٹی قسم نہ کھایئے بس
آپ کو خوب میں نے دیکھ لیا تم ہو مطلب کے اپنے، جایئے بس

1۔ حربا: گرگٹ

مصحفی عشق کا مزہ پایا
دل کسی سے نہ اب لگایئے بس

189

ساقیا! ہیں یہ تری چشم کے دو فنجاں بس — اور مے مانگیں ہیں کیا تجھ سے سیہ مستاں بس
فائدہ کچھ نہیں منت کشِ عیسیٰ ہونا — ہو چکا دردِ دلِ زار، ترا درماں بس
یہ ستم کُشتوں پہ اپنے نہ روا رکھ، ظالم! — کر چکا ان کو تو پامالِ سُمِ یک راں بس
تیغ پر تیغ نہ غصے سے لگا ہر ساعت — مجھ میں باقی نہیں کچھ بس میں ترے قرباں بس
زخمِ کہنہ تو مرے سارے ہرے ہو آئے — آگے طاقت نہیں اب، اے خطِ مشک افشاں، بس
گوہرِ جاں بھی کیا آپ کے قدموں پہ نثار — تھے غریبوں سے اسی بات کے تم خواہاں بس
کیا زلیخا نہ دکھاوے گی تو اوروں کو اسے — تیرے حصے ہی میں آیا ہے مہِ کنعاں بس
قتل و غارت ہے طبیعت میں تری آنکھوں کی — ترکتازی سے کوئی کرتے ہیں یہ ترکاں بس
اب تو فریاد کے سننے کی تری تاب نہیں — بے دماغ اتنا نہ کر مجھ کو، دلِ نالاں، بس
لاکھ عاشق سے نہ ہو حسن کو اس کے سیری — ملک گیری سے بھی کرتے ہیں کہیں سلطاں بس

مصحفی اب تو نظر بازیِ خوباں کر ترک
نخلِ الفت سے چُنے خوب گُلِ حرماں بس

ش

190

کیا اسے پروائے پیرِ مے فروش — ساقیِ مجلس ہے خود گم کردہ ہوش
مار اور مُہرے کا قائل ہو گیا — دیکھ کر میں اختلاطِ زلف و گوش
لب پر آ رہتی ہے اس کے منہ کی گونج — ایک جا کیونکر نہ ہووے نیش و نوش

آدمی سے ہو گئے حیوان ہم فصلِ دے نے کر دیا پشمینہ پوش
یا الٰہی بھیج قاتل کو کہیں سر مرا کب تک رہے گا بارِ دوش
ہم ہیں خوگر التفات یار کے غیب سے پہنچے ہے نت ہر دم سروش
سینہ کوبی میں نہ کر تو کاہلی
مصحفی یہ بزم ماتم ہے، بجوش

191

لوٹیں ہیں صبح تک شبِ غم میں بہارِ عیش اپنی بلا کرے ہے بس اب انتظارِ عیش
ہر چند ہم کریں ہیں بہت اس کی جستجو ہم کو یہ بختِ بد نہیں کرتے دوچارِ عیش
تھا اس قدر شباب کو جانے میں کیا شتاب کیوں ہم کو پیچھے چھوڑ گیا روزگارِ عیش
لاکھوں چراغ مردہ پڑے ہر طرف ہیں یاں لاکھوں بنے ہیں شہر میں اپنے مزارِ عیش
زندانیانِ غم ہیں جو زانو پہ سر رکھے ان کی طرف کو کیا نہیں ہوتا گزارِ عیش
کیا کیا بہاریں وصل کی اوروں نے لوٹیاں اک ہم کو بخت نے نہ کیا ہمکنارِ عیش
سب باتیں یک طرف رہیں پیری میں مصحفی
ٹھہرا ہے اکل و شرب پر اپنا مدارِ عیش

ص

192

کر نہ اے عاقل تو اتنا بر طلسمِ خام رقص ہر حبابِ بحر کو ہے مرگ کا پیغام رقص
تیرہ بختی عاقبت ہوتی ہے باعث وصل کی شمع پر کرتا ہے پروانہ بہ وقتِ شام رقص
ہے دلِ پُر داغ کو دنیا میں رفعت سے خوشی یعنی یہ طاؤس کرتا ہے بہ پشتِ بام رقص
''وادیِ مجنوں یہی ہے کیا؟'' یہ لیلیٰ نے کہا ناقہ جب کرنے لگا چلتے ہوئے ہر گام رقص

ٹک قدم آہستہ رکھیو فرش پر، پیارے، کہ ہاے
دردمندوں کا تمھارے کر چکا ہے کام رقص

ہجر میں ہے تو قلق لیکن تسلّی کے لیے
اضطرابِ دل کا ہم نے رکھ لیا ہے نام رقص

کس طرح بھر نیند سوویں اس قیامت جلوہ کا
خفتگانِ خاک کو دیتا ہے کب آرام رقص

کیا محرک کے انھیں رشتے سے ہووے آگہی
پتلیوں کا جن کی نظروں میں ہے پوچ اور خام رقص

جب سوادِ نجد میں پہنچے ہے لیلیٰ شاد شاد
پاے ناقہ پر کرے ہے گرد بھی ہر گام رقص

ماہیِ ساقِ بلوریں کس کی دیکھی آب میں
جوں بھنور کرنے لگے جو حلقہ ہاے دام رقص

اشتیاقِ بوسۂ لب ہاے رنگیں میں ترے
جوش کھا کھا خم میں کرتی ہے مۓ گلفام رقص

یہ بھی ہے گردش نصیبوں کی کہ در بزمِ شہاں
واسطے زر کے کریں طفلانِ سیم اندام رقص

گرد اپنے تیرا شوریدہ پھرے ہے لاکھ بار
حلقۂ گرداب نے اس سے لیا ہے وام رقص

لطف سے خالی نہیں ہنگامۂ بزمِ سماع
جس میں خود کرتے ہیں اُٹھ اُٹھ صاحبِ اسلام رقص

قابلِ دیدن ہے شب کو نقشِ فانوسِ خیال
آہ کیا کیا صورتیں رکھتا ہے بے آرام رقص

جب قضا آئی رکھی گردن تہِ شمشیرِ تیز
مرغِ بسمل کو ہے کیا ہنگام و بے ہنگام رقص

کُشتنی باقی رہا ہے کیا کوئی، اے مصحفی
دستِ قاتل میں جو کرتی ہے ابھی صمصام رقص

ض

193

ہرگز ملا نہ ہم کو کوئی آشنا غرض
پایا ہر اک کو آپ سے ہم نے تو لاغرض

تب دب چلے کہ اس کو بھی ہووے کچھ احتیاج
رکھتا نہیں کسی سے مرا بے وفا غرض

وہ ہم سے بے غرض ہے تو ہم کو بھی کیا غرض
جیسا وہ لاغرض ہے، ہوں ویسا میں لاغرض

اُس کا ہو تیرے گر چمنِ حسن میں گزار
رکھے کبھی گلوں سے نہ بادِ صبا غرض

واں بھی اُنھوں کو آنکھ کے پڑنے کا بیم ہے　　آئینہ دیکھتے نہیں اہلِ حیا غرض
جس دن کروں گا عالمِ فانی سے میں سفر　　نکلے گا بس اجل سے مرا مدّعا غرض
آخر ہوا ہلاک تپِ غم سے مصحفی
کی اس غریب کی نہ کسی نے دوا غرض

ط

194

ہووے شبِ فراق کی جب شام بے نُقط　　میں کیوں کہ دوں نہ پھر اسے دشنام بے نُقط
آسان کیا نکلتی ہے ان ہندوؤں کی جاں؟　　پڑھنا پڑے ہے ان کو سر انجام بے نُقط
بس اس قدر ہی فرق ہے اسلام و کفر میں　　گر کفر با نُقط ہے تو اسلام بے نُقط
محتاج زیب عاریتی کب ہے ذات بحت[1]　　اللہ کا قدیم سے ہے نام بے نُقط
کیا میرے علم و فضل میں شک مصحفی رہا
میں کر چکا قصیدہ جب ارقام بے نُقط

195

کیا کہوں اپنی میں تباہیِ خط　　اس نے دھو ڈالی سب سیاہیِ خط
اس نے خط ہاتھ سے مرا پھینکا　　دیکھ کر نظم و نثر واہیِ خط
قتلِ منصور جب مقدر ہو　　کیوں نہ شبلی کرے گواہیِ خط
مہرِ بادامی دیکھ عاشق کی　　تا کھلے تجھ پہ کج کلاہیِ خط
کشورِ حسن کیوں نہ ہو سرسبز　　ان دنوں واں ہے بادشاہیِ خط
یار نے خط تو مجھ کو بھیجا لیک　　نہ کھلا مطلبِ کماہیِ[2] خط

1۔ بحت: خالص، پاک　　2۔ کماہی: کما حقہ، جیسا کہ چاہیے

مصحفی ربط تھا مرا اس کا   تا ملاقات گاہی گاہِی خط
اب وہ نامہ رہا نہ نامہ رساں
رہ گئی صرف عذر خواہیِ خط

ع

196

دیکھ لوں ٹک سعادتِ طالع   ٹھہریو اے نحوستِ طالع
ہم کو آقا ملا کیے ہی خسیس   تھی ہی اپنی ہی خِستِ طالع
وہ ہمیں ہیں کہ جن کے نکلے ہے   ضعفِ طالع میں قوتِ طالع
ایک ادنیٰ کو کردے پیل سوار   گر مدد پر ہو رفعتِ طالع
مصحفی خوش ہیں جو مقدر پر
نہیں کرتے شکایتِ طالع

197

ایک ہی ہے اس کی فندق کی حنا کا رنگ و شمع   اشکِ خوں روتے ہیں باہم عاشقِ دل تنگ و شمع
ہجر کی شب کی سیاہی نور کی دشمن ہے آہ   منہ دکھاوے کیوں کہ وقت شام شب آہنگ و شمع
جانتا گر میں کہ مانی تیری کھینچے گا شبیہ   متصل ہونے نہ دیتا کاغذِ بے رنگ و شمع
کس معذب[1] کا یہ لاشہ تھا سزائے رجم[2] و نار   چرخ مینائی سے برسے جس پہ پہروں سنگ و شمع
وہ تو ہووے اس پہ صدقے، وہ کرے اس سے گریز   دیدنی ہے صحبتِ پروانۂ بے ننگ و شمع
اس نے پروانے جلائے اس نے مرغانِ ہوا   ایک ساعت کیا بنا تھا اس رِفل[3] کا سنگ و شمع
کی شبِ مہتاب میں دریا پہ کس نے روشنی   جو تجلّی سے پڑی لڑتی ہے موجِ گنگ و شمع

1۔ معذب: عذاب پانے والا   2۔ رجم: سنگسار کرنے کا عمل   3۔ رِفل: رائفل (پلیٹس نے رِفل ہی لکھا ہے)

اس پہ خونِ صید کی شب کس گھڑی چھینٹیں پڑیں — گر نہیں باور یہ ہے توسن کا تیرے تنگ[1] وشمع

نالۂ شور آفریں تھا شب ہوا میں شعلہ ور
مصحفی جس پر کیا سب نے گمانِ جنگ وشمع

198

کب تلک پیشِ نظر ہر دم نئے فرہنگ وشمع — کاش ہووے صبح اور ہو سیر وقتِ بنگ وشمع

یہ جلے آتش میں غم کی وہ جلی شعلے کے ساتھ — کیوں نہ یکساں ہو ہمارے استخواں کا رنگ وشمع

سختی و نرمی میں ان کی گو بظاہر ہے تضاد — ایک ہو جاتا ہے تلتے وقت وزنِ سنگ وشمع

ہاتھ میں دستانہ ہے پھر اس پہ شعلے کا تبر — بزم میں یہ کس سے بگڑی اتنا ساز جنگ وشمع

آ نہیں سکتی وہ بزم تیرہ روزاں میں کبھی — داغ وہ جانِ غریباں کا ہے عذر لنگ وشمع

مجلسِ ہستی سے وہ اور ہم جو تھے رخصت طلب — صبحدم تھا ایک چہرے کا ہمارے رنگ وشمع

کر کے روشن اس کو بلبل کو جگاتا ہوں مدام — گوش وچشم اپنا جو مائل ہے سوئے آہنگ وشمع

مرغ آتش خوار نے بھی یوں نہ نگلا شعلہ آہ — بل بے، اے گل گیر، یہ تیرا دہان تنگ وشمع

جامہ جوں فانوس بہتر دل جلے کے تن سے دور
مصحفی یکجا نہ ہو ہرگز لباسِ تنگ وشمع

199

روبرو اس کے جو تھی شب فندق گل رنگ وشمع — تا سحر کرتا تھا وہ سیرِ گلِ اورنگ وشمع

مجلسِ تصویر میں گر ہم گئے تو لطف کیا — چاہیے پیشِ نظر ہو یار کر آہنگ وشمع

کیوں نہ بزم عیش میں ہووے دو چنداں روشنی — شیشے کے فانوس کے یکجا ہو جب مردنگ وشمع

تنگ پاجامے میں نقشا دیکھ کر اس ساق کا — جل بجھے آخر کو شب پروانۂ دل تنگ وشمع

منعکس اس قد کا ہے آینۂ لوحِ مزار — قبرِ عاشق کو نہیں کچھ احتیاج سنگ وشمع

ژالہ باری یک طرف، یکسو چمکنا برق کا — ابر نے ہم کو دکھائی زور سیرِ سنگ وشمع

1۔ تنگ: نواڑ جس سے گھوڑے کا زین کستے ہیں (لغاتِ سعیدی)

دزدِ دل کیونکر کہوں اس کو کہ راتوں کو مدام — ہر گلی کوچے میں وہ پھرتا ہے با سرہنگ وشمع
ہم سے مفلس کیا رہِ الفت میں رکھیں گے قدم — جن کو شب ہر گام پر ہو عذرِ پائے لنگ وشمع
منزلِ ملکِ عدم طے کر تو بے کھٹکے ہی یار — کاروانِ عمر کو کیا چاہیے ہے زنگ وشمع
ملگجے کپڑوں میں اس کے حسن کا ہے یوں فروغ — جیسے ہو فانوس جونے[1] کی کوئی بدرنگ وشمع

اس کو گل کاری بنا کر رنگ دیتے ہیں کئی
مصحفی دیکھا ہے ہم نے عالمِ نیرنگ وشمع

200

شب کہ تھا حجرے میں وہ زیبِ مکانِ تنگ وشمع — دل کو گرماتا تھا اس کا روئے آتش رنگ وشمع
ہم تصور میں تری انگشتِ فندق بند کے — رکھ کے سو رہتے ہیں بالیں پر گلِ اورنگ وشمع
یہ کنول روشن کیے دریا میں کس کے حسن نے — بن گئی بال پری جو موجِ آبِ گنگ وشمع
پرتوِ افگن تیرہ دل میں ہو نہ حسنِ سرکشاں — ربط کب رکھتی ہے باہم آئنے کی زنگ وشمع
شب رہا کون اس کی مجلس میں کہ وقتِ صبحدم — کچھ پتا دیتا تھا مجھ کو برگِ پاں کا رنگ وشمع
کر مئے گلگوں کے شیشے کی تو گردن پر نگاہ — ایک قالب میں نظر آوے تجھے تا سنگ وشمع
شب کو برقِ حسنِ شیریں بیستوں پر گر گرے — دفعتاً ہو جائے جلنے میں برابر رنگ وشمع
عاشقِ دیوانہ کو کیا مجلس افروزی سے کام — عشق میں یکجا ہو کیونکر ترکِ نام وننگ وشمع
میں قسم کھاتا ہوں جھپکی ہو ذرا گر میری آنکھ — شب کہ پیشِ دیدہ تھا اس حسن کا نیرنگ وشمع
رقص کی مجلس میں گر آنکھ ان پہ تیری جا پڑے — سیر کی جا ہے پتنگوں کی وہ باہم جنگ وشمع

جب کہ ہو مشکل دیا باتی بھی اس کو مصحفی
کیوں کہ پھر ہم بزم ہووے مفلسِ دل تنگ وشمع

201

ہے دزدِ شمع کو سرِ تسخیرِ پائے شمع — جاتا ہے اس لیے وہ بہ تدبیرِ پائے شمع

1۔ جونا : صفائی کرنے کا کپڑا۔ اصل میں ''جھونے'' لکھا ہے، ممکن ہے جونا کی جگہ کوئی اور لفظ ہو

ہووے گا نقطہ کیا کہیں جاگیر پاے شمع — مخروطی شکل پر ہے جو تعمیر پاے شمع
بے رخصت اس کے فرش پر اس نے قدم رکھا — سچ پوچھیے تو کم نہیں تقصیر پاے شمع
پروانوں ہی کے خوں سے لگن سرخ کچھ نہیں — کیڑے پتنگے کتنے ہیں نخچیر پاے شمع
چاندی کے پترے سے ہیں پتنگوں کے پر تمام — زرگر انھیں سے گھڑیو تو زنجیر پاے شمع
قصدِ سنانِ شعلہ کرے کس طرح پتنگ — وہ ناتواں ہے کشتۂ شمشیر پاے شمع
انجامِ عمر پر نہ چمک اتنا مصحفی
رکھتا ہے یہ تو عالمِ تصویر پاے شمع

202

لختِ دل سے آہ ہے عاشق کی تیاری کی شمع — گھر میں ہر منعم کے روشن جیسے گلکاری کی شمع
شمعداں اس کا بنا لیتے ہیں حقے کی چلم — ہم سمجھتے ہیں فتیلے ہی کو ناداری کی شمع
گو نہ لاوے قبرِ عاشق پر کوئی شمع و چراغ — شب کو واں رہتی ہے روشن چرخِ زنگاری کی شمع
روح سے رہتا ہے روشن آدمی کا قصرِ تن — سچ جو پوچھو ہے یہی اس چار دیواری کی شمع
اُس طرف جلتی تھی وہ، تھا اشک افشاں میں اِدھر — ہے شبِ ہجراں میں شاہد میری بیداری کی شمع
داغِ شیریں میں موا ہے، تربتِ فرہاد پر — چاہیے ہو لالۂ خود روے کہساری کی شمع
میں بھی، اے پروانہ، گر رونے پر آیا بزم میں — تاب لاوے گی نہ میری گریہ وزاری کی شمع
فیض پاتے ہیں سدا دنیا میں چھوٹوں سے بڑے — روشنی میں اپنی ہے محتاج چنگاری کی شمع
گہ پہر بھر مصحفی جاگا تو اس سے فائدہ؟
چاہیے جلتی رہے تا صبح بیداری کی شمع

203

ہجر کی شب گر ہوئی ہے مجھ سے تو ہم خانہ شمع — تُو مرا سن اور میں تیرا سنوں افسانہ شمع
بے قراری کس لیے ہے اتنی شعلے کو ترے — کیا کوئی فانوس سے باہر رہا پروانہ شمع

برق کی چشمک گئی جب آنکھ ہی اس سے چُرا کرمکِ شب تاب کو سمجھا مرا ویرانہ شمع
تا نظر آوے کچھ اس کو تیرہ شب کا اپنے حال پر سے پروانے کے پہروں دیکھتی ہے شانہ شمع
جسمِ کافوری میں تیرے موتیوں کی ہے صفا ہے بجا گر نام میں تیرا رکھوں دردانہ شمع
طائرِ تصویر یہ جو شمع داں پر ہیں بنے اپنے اشکوں سے انھیں دیتی ہے آب و دانہ شمع
قصۂ عاشق رہا موقوفِ شب ہائے دگر کرگئی اپنا تمام اک رات میں افسانہ شمع
فاتحہ کو قبرِ لیلیٰ پر جو مجنوں جائے ہے داغ حسرت کی چڑھا آتا ہے یہ دیوانہ شمع
راہِ تاریکِ عدم میں ہر قدم پر چاہ ہے تو نے گل کردی کہاں حیف، اے دلِ دیوانہ شمع
چاندنی راتوں پہ ٹھہرا آشنائی کا مدار اپنی بزمِ وصل سے برسوں رہی بیگانہ شمع
کیا مزہ ہووے، مرا ہم بزم ہو جس شب کہ یار مار کر سیلی بجھا دیوے پرِ پروانہ شمع
اس قدر دزدِ حنائے پا کا خطرہ ہے اسے عکس بالیں پائنتی رکھتا ہے وہ فرزانہ شمع
بن گئی سنگِ محک پر شب کے سونے کی لکیر بس کہ مجلس میں ہوئی محوِ رخِ جانانہ شمع
گریہ یہ چشمِ لگن میں اس کا بے موجب نہیں کھا گئی آخر فریبِ ساعدِ جانانہ شمع
شعلہ بن جاوے گا کالا جیسے آہو کی زباں گر شبِ تاریک سے میری ہوئی ہم خانہ شمع
دیدبانی کچھ نہ اس کی اہلِ مجلس سے ہوئی چور سے لٹوا رہی آخر متاعِ خانہ شمع
مستِ صہبائے غرور اس کو میں پایا شب مگر دور پروانوں کا سمجھی گردشِ پیمانہ شمع
ظلمتِ بختِ سیہ چھائی ہے کس کی قبر میں جا بجا کرتے ہیں روشن آدمی روزانہ شمع
پر پتنگے نے جلا کر اس پہ اک شب یوں کہا جان قیمت ہو چکی یہ ہے ترا بیعانہ شمع
صبح تک اس کی زبانِ شعلہ جنبش میں رہی چُپ ہوا جب میں تو اپنا لے چلی افسانہ شمع

کیوں ستی کی طرح اس کی لاش لے کر جل گئی
مصحفی، جی سے نہ تھی گر عاشقِ پروانہ شمع

204

اشکِ ریزاں سے لگن کو بخشے ہے دُردانہ شمع کیا سخاوت میں رکھے ہے ہمّتِ شاہانہ شمع

روزِ محشر جوش میں آوے گا پروانے کا خوں
اس کی خوں ریزی نہ سمجھے بازیِ طفلانہ شمع

میں نہ سوؤں گا تری ہی آنکھ جاوے گی جھپک
ہے بلا بیداریِ شب کا مری افسانہ شمع

آپ سے پہلے ذرا کر لیجیو فکرِ لگن
ہے مثل خارا گزاری میں مرا افسانہ شمع

گرتے ہی شعلے پہ پروانے کے تو اُٹھی بھڑک
کان میں تیرے گیا کیا پھونک یہ دیوانہ شمع

جب سے دیکھی ہے ترے شانے پہ یہ زلفِ سیاہ
اپنی جعدِ دود کو سمجھے ہے مارِ شانہ شمع

خانۂ تاریکِ مفلس سے نہیں کچھ اس کو کام
ہے ضیا بخشِ نشاطِ مجلسِ شاہانہ شمع

قدرِ شب بیدار کیا ہے اہلِ دولت کے حضور
دیکھ لو اُٹھوائی جاوے بزم سے روزانہ شمع

سرکشی اتنی بھی حسنِ عارضی پر تو نہ کر
شعلہ ہو جاوے گا تجھ سے عاقبت بیگانہ شمع

پردۂ فانوس میں اپنا چھپا لیتی ہے منھ
رو سیہ گلگیر کو سمجھے ہے حد بیگانہ شمع

پرتوِ مہتاب سے عاشق کا گھر روشن ہوا
حسنِ بالادست کی چاہے ہے بام خانہ شمع

پنج شاخے کی رہی کیا مجھ کو حاجت مصحفی
وصل کی شب ہو گئی ہر فندق جانانہ شمع

غ

205

دوستو! بالیں پہ میری مت کرو روشن چراغ
تیرہ تر لگتا ہے نظروں میں دمِ مُردن چراغ

صرصرِ آہِ تند کی آخر بجھاوے گی اسے
مہر کا گو آسماں رکھے تہِ دامن چراغ

آہ کے شعلے کے ساتھ آنسو بھی جاتے ہیں ٹپک
ہے شگوں شادی کا جب ہووے شرر افگن چراغ

دخترِ شب کے ہے سر پر آسماں جھجری[1] کی شکل
اک دیے سے بن گیا ہے جس کا ہر روزن چراغ

دیکھ سکتا ہے کوئی کب اپنے غالب دست کو
سچ اگر پوچھو ہے نورِ مہر کا دشمن چراغ

1۔ جھجری: جالی

شامِ غربت کی شبِ تاریک سے جانبر ہو کیا
جس اسیرِ یاس کو کالے کا ہووے من چراغ
گم ہوئی دنبالہ وہ شب، اس کے رخشِ ناز کے
ہر قدم پر گرچہ تھا نعلِ سُمِ توسن چراغ
داغ حسرت لے گئے دنیا سے یعنی بعدِ مرگ
کون لاتا ہے غریبوں کے سر مدفن چراغ
ہجر کی شب کی سیاہی میں نہ کام آئے ذری
سیکڑوں رکھتے تھے گو سر پر یہ مرد و زن چراغ
کیوں بنارس کی نہ گلیاں ہوویں رشک کہکشاں
آخرِ شب نکلے جب لے لے کے ہر اک زن چراغ
شعلہ اُٹھتا ہے حنائی جو دلِ پُر داغ سے
ظرف میں رکھتا ہے شاید خون کا روغن چراغ
ہم سے گرمی کی توقع رکھ نہ پیری میں دلا
کس طرح ہووے چراغِ مردہ سے روشن چراغ
اس تجلی جلوہ کا عکس ان پہ جب جا کر پڑا
بن گیا ہر برگِ نخلِ وادیِ ایمن چراغ

عشق کا جن سر سے کب اترے ہے آساں مصحفی
گو کہ یہ عامل کچھوچھے [1] کا کریں روشن چراغ

206

رنگِ گل سے آب جو میں ہے یہ عکس افگن چراغ
چشمِ ماہی نے کیا یا دوسرا روشن چراغ
تیرہ روزی پر ترحم اس کی کرنا تھا ضرور
گل نے کیوں اپنا جلایا پہلوے سوسن چراغ
خانہ چشمِ مور سے رکھتا ہوں میں تاریک و تنگ
چاہیے اس اس گھر کا ہووے دیدۂ سوزن چراغ
نور کے آگے نہیں ہوتا فروغِ اہلِ ناز
اپنا منھ دیکھے ہے تیرے سامنے روشن چراغ
سوزِ دل رکھتا ہے عاشق کو نہایت بے قرار
جیسے پروانے کے ہو آرام کا دشمن چراغ
حسن کی تیرے نفاست مجلس آرا ہو جہاں
ساغر یاقوت اُس مجلس میں جاوے بن چراغ
جب میں آتش زیرِ پا پھرتا تھا دشتِ عشق میں
کفش جستہ میں پڑے تھا نعل کا آہن چراغ
داغِ دل کو چشمِ لاغر نے مری بخشا فروغ
سچ ہے کرتے ہیں سب آتش برگ سے روشن چراغ
ہے صفاے سینۂ معشوق کی سی کچھ شبیہ
یا ہے اس کجلی قبا کا چاکِ پیراہن چراغ

1۔ کچھوچھا : ایک مقام جہاں ایک بزرگ کا مزار ہے

قبر کا جن کی نشاں با خاک یکساں ہو گیا
چاہیے کیا مصحفی ان کو سرِ مدفن چراغ

207

گو دھرا ہو سامنے با آتش و روغن چراغ
بجھ رہا ہو جس کا جی وہ کیا کرے روشن چراغ

چرکِ مفلس کا ازالہ اہلِ دولت سے نہ ہو
فائدہ کیا گل جلاوے پہلوے سوسن چراغ

تُو تو اُٹھکیلی سے چلتا ہے تجھے کیا ہے خبر
بجھ گیا کس کا بہ بادِ جنبشِ دامن چراغ

تشنگی عاشق کی جیتے جی تلک جاتی نہیں
دمبدم رکھتا ہے جیسے خواہش روغن چراغ

رہنما برسات میں مردم کا ہونا ہے ثواب
کوچۂ تاریک میں کر رکھتے ہیں روشن چراغ

اربسی یہ لعل کی اس کے نہیں زیبِ شکم
لب پہ چاہِ ناف کے ہے حسن کا روشن چراغ

آستیں کی شکل سے اس کی یہ ہوتا ہے عیاں
گل کرے گا سیکڑوں اس تیغ کا آہن چراغ

دفن کے قابل رہے ہے کب سبک روحوں کا جسم
کس نے محتاجِ کفن دیکھا پس از مردن چراغ

مصحفی برقِ تجلی ہے سراپا اس کا تن
حسن نے روشن کیا ہے زیرِ پیراہن چراغ

208

سیکڑوں مضموں بجھاوے تا یہ بے روغن چراغ
ظلمتِ شب میں ہے شاعر کا دل روشن چراغ

شعلۂ عارض سے اس کے تا کرے روشن چراغ
گل کے آگے لاتی ہے اپنا بجھا سوسن چراغ

زندگی میں تن رہا ہے بس کہ میرا داغ دوست
بعدِ مردن بھی یہ گل چاہے ہے جاوے بن چراغ

ظلمتِ شبہائے ہجراں میں نہ دیکھی روشنی
گرچہ تاروں کے رہے تا صبح دم روشن چراغ

اس کو جب جلنے کی لو لگتی ہے شیخی دیکھیو
اپنا پروانے سے کر لیتا ہے دل آہن چراغ

اس کی طینت میں نہیں ہے بیمِ قاتل سے گریز
سامنے گلگیر کے رکھ دیوے ہے گردن چراغ

شب جو گزرا میری تربت سے وہ مانندِ نسیم
کر گیا گل دامنِ زیں سے ترا توسن چراغ

درد سے جلتے ہوؤں کے گر کبھی واقف ہوا طرح آتش کی کرے گا دیکھیو شیون چراغ
وصف کیا اس کی دھڑی کا ہو کفِ عشاق میں چاہتی ہے مسّیِ لب کے تری سوسن چراغ
عرس تھا کس کی حنائے پا کے کشتے کا رات بن رہا تھا باغ میں ہر لالۂ گلشن چراغ
چار غزلیں ہو گئیں اے مصحفی مجھ سے رقم
میں نے اس چومکھ دیے کے یوں کیے روشن چراغ

209

آہ سے روشن کیا میں نے بیاباں میں چراغ میرے ہاتھ آیا یہی شام غریباں میں چراغ
دوست اہلِ سوز کا ہوں میں، مرا جی بجھ گیا ایک بھی گر گل ہوا سروِ چراغاں میں چراغ
معنیِ روشن پہ میرے پڑ سکے کیا دستِ غیر سانپ کے مَن کا یہاں جلتا ہے میداں میں چراغ
دائما رہتی ہے کوئی روشنی اقبال کی کون اب روشن کرے کسریٰ کے ایواں میں چراغ
سر سے ٹلتی گور کی ظلمت نظر آتی نہیں نورِ حق لاوے تو لاوے اس شبستاں میں چراغ
سامنے جب سے ہوا اس روئے آتشناک کے دمبدم پکڑے ہے خس کو اپنے زنداں میں چراغ
شب کہ تاریکی میں جاتا تھا میں اس کوچے کی سمت لختِ دل کا تھا فروزاں دستِ مژگاں میں چراغ
داغِ دل کی روشنی عاشق کو بس ہے مصحفی
وہ جلا کر کیا کرے شبہائے ہجراں میں چراغ

210

اپنا منہ دیکھے نہ کیوں شبہائے ہجراں میں چراغ سر مرا پاتا ہے ہر ساعت گریباں میں چراغ
یوں عناصر نے ہمارے کھوئی قدرِ داغِ دل جوں کوئی رکھ جائے چوراہے کے میداں میں چراغ
شعلہ اس کا محضرِ خوں لاکھ پروانوں کا تھا دیکھتا گر ڈال کر سر کو گریباں میں چراغ
جھلملائی شدتِ دودہ سے یوں اس کی بصر روشنی دیتا ہے کم جیسے شبستاں میں چراغ
برق رفتاروں کا تیرے وادیِ وحشت کے بیچ ہجر کی شب بن گیا ہر خارِ داماں میں چراغ

یوں نہ یارب چشم کی جاوے کسی کی روشنی — گم ہوا یعقوب کا جوں چاہ کنعاں میں چراغ
بس کہ تاریکی سے خوگر ہے نظر بے روے یار — ہم جلاتے خود نہیں شبہاے ہجراں میں چراغ
وصل کا مائل تو اس کو تب میں جانوں جب وہ شوخ — اُٹھ کے گل کر دیوے پنکھے سے شبستاں میں چراغ
پیشتر کی کچھ حقیقت سے نہیں ہم کو خبر — رات تھا ڈیوڑھی تلک تو دست درباں میں چراغ
وصل کی شب بھی نہیں پوچھا گیا اس بزم میں — بجھ گیا ہے ماہ کا یاں طاقِ نسیاں میں چراغ
جل گئے سو آشیانے جب کبھی روشن کیا — آہِ آتش بارِ بلبل نے گلستاں میں چراغ
کب ہیں طالب روشنی کے مصحفی ظلمت نشیں
راہ کم پاتا ہے محبوسوں کے زنداں میں چراغ

211

مت بیٹھیو یوں جا کے تو زنہار تہِ تیغ — سر رکھتے ہیں سوگھات سے ہشیار تہِ تیغ
کیا اس کو رہائی کی خوشی چوب قفس سے — رہتا ہے سدا مرغِ گرفتار تہِ تیغ
لایا ہے بلا مجھ پہ مرا قدِ خمیدہ — پیری میں مجھے زیست ہے دشوار تہِ تیغ
مژگاں سے عیاں ہے کہ نکیلوں[1] کی صفوں کو — رکھتی ہے تری ابروے خم دار تہِ تیغ
یاں خضر بھی آتا ہے سر اپنے کو کٹانے — رنگیں ہے شہادت کا یہ گلزار تہِ تیغ
آفت ہے سرِ مومن و کافر پہ ہمیشہ — تسبیح تہِ تیغ، نہ زنّار تہِ تیغ
اے مصحفی ہے کچھ تو دبیل اس کا جو دن رات
اس جسم پہ رہتا ہے یہ کہسار تہِ تیغ

212

یکبار خصمِ جاں ہوا چرخ بریں دریغ — دیکھی نہ میں پھر اس کی گلی کی زمیں دریغ
کرنی تھی قدرِ لختِ جگر تجھ کو، چشمِ تر — کھووے تو اپنے ہاتھ سے ایسا نگیں دریغ

1۔ نکیلا: نوک دار، طرحدار، حسین

بوسہ بھی ہم تو رنگِ حنا کا نہ لے سکے
کیا ہاتھ سے گئی وہ کفِ نازنیں دریغ

پھرتے ہی رت کے اس کی حرارت نہ وہ رہی
سردی پہ آگیا نفسِ آتشیں دریغ

میرا چراغِ عیش سرِ شام بجھ گیا
بادِ فنا کی اس پہ لگی آستیں دریغ

عیسیٰ نے میری بالیں پہ یکبار رو دیا
نکلا زباں سے جب نفسِ واپسیں دریغ

گلشن کو چھوڑ کر میں اسیرِ قفس ہوا
تو نے مری خبر بھی نہ لی، ہم نشیں، دریغ

مر جاتے ہم تو اس کے بچھڑتے ہی مصحفی
مرنا بھی اختیار میں اپنے نہیں دریغ

213

نہ سر انجام ہوا کام کوئی ہائے دریغ
گر دریغ اس کا کروں میں تو ہے یہ جائے دریغ

بے دریغانہ وہ جب کھینچ کے تیغ آتا ہے
موج مارے ہے مری چشم سے دریائے دریغ

دیکھیو سنگ دلی، سن مرے مرنے کی خبر
منھ سے اس دشمن جاں نے نہ کہا ہائے دریغ

کوئی گردن زدنی کیا بہ تہِ تیغ آیا
رات تھا کوچۂ قاتل میں جو غوغائے دریغ

مصحفی کیسا تو پیری میں ہوا ہے ہلکان
تیرے احوال پہ کیونکر نہ مجھے آئے دریغ

ف

214

دو بات کی فرصت ہمیں نہ گر پائی تو کیا لطف
چوری سے شب وصل جو ہاتھ آئی تو کیا لطف

افسوس کہ نکلی نہ ہوس ایک بھی دل کی
یہ رات فلک نے ہمیں دکھلائی تو کیا لطف

اس بت نے پھر آنے کے لیے بہر تسلی
جھوٹی جو مرے سر کی قسم کھائی تو کیا لطف

برسوں تو ہمیں دور رکھا بخت نے اس سے
اک دم کو اگر ہوگئی یکجائی تو کیا لطف

آتے ہی ذرا بیٹھ کے پھر اُٹھ چلے ووں ہی
تا دیر ٹھہرنے کی نہ ٹھہرائی تو کیا لطف

اس لطف نمایاں پہ ملاقات کا اس کی ویسا ہی رہا دل جو تمنائی تو کیا لطف
گھر اپنے وہ چپکے ہی گئے چپکے ہی آئے
اے مصحفی کچھ بات نہ فرمائی تو کیا لطف

ق

215

میں دیکھ اپنے دل کو پریشاں شبِ فراق
رویا بہ یادِ کاکلِ پیچاں شبِ فراق
اسباب خانہ سب مرا اس نے بہا دیا
آیا ہے سیلِ اشک سے طوفاں شبِ فراق
نے صبح ہو نہ زیست کی صورت نظر پڑے
اپنے لیے ہے یاس کا زنداں شبِ فراق
مجھ سا بھی سخت جاں کوئی دیکھا ہے، اے فلک
جھیلے ہیں میں نے ظلمِ فراواں شبِ فراق
اس کے تو طول نے مرا قصہ کیا تمام
یا رب تمام ہو کسی عنواں شبِ فراق
بیٹھا ہوا میں چرخ کے تارے گنا کیا
مژگاں سے کب ملیں مری مژگاں شبِ فراق
کیا موردِ عذابِ فلک ایک میں ہی ہوں
تارے ہیں مجھ پہ کیوں شرر افشاں شبِ فراق
کوتاہیِ نصیب نے رکھا ہے مجھ کو مار
ورنہ نہ تھی دراز تو چنداں شبِ فراق
تیرِ شہاب چھٹتے نہیں آسمان سے
لگتے ہیں میرے دل پہ یہ پیکاں شبِ فراق
میرے تو حق میں یہ بھی نہیں چاہتا فلک
ہوں ہمکنارِ حسرت و حرماں شبِ فراق
آنا اگر ہے تجھ کو تو آ ورنہ جانِ زار
ہے کوئی دم کی ہونٹوں پہ مہماں شبِ فراق
ازبس شرارے اس کے سراپا میں ہیں محیط
ہے سرد آہ سرد چراغاں شبِ فراق
مجنوں اُدھر تو جائے تو کہیو خبر ہے شرط
آتے ہیں ساکنانِ بیاباں شبِ فراق
شاید گلے کو اس کے کوئی ذبح کر گیا
گم ہے خروسِ صبح کی افغاں شبِ فراق
یاد ان مژہ کی جاتی نہیں جی سے مصحفی
چھاتی پہ کوئی مارے ہے انیاں شبِ فراق

216

صورت دکھا وصال کی بازی گرِ فراق پھر دل پہ مارے دیوے ہے اک نشترِ فراق
تسکیں ہو آبِ اشک سے کیا خاک رات دن سینہ جلا رہے ہے مرا اخگرِ فراق
ہے عاشقوں میں اس کی شہادت قبول حق پہلے جسے شہید کرے خنجرِ فراق
کیوں کہ لگے نہ اس کے عقارب سے مجھ کو ڈر زائندۂ وصال نہیں مادرِ فراق

اے مصحفی امام ہے گر ان کا دردِ دل
ہیں آہ و نالہ امّتِ پیغمبرِ فراق

217

پھولی ہے زلف میں رخِ گلفام کی شفق میں کیوں کہ پھر نہ اس کو کہوں شام کی شفق
پیری میں فائدہ نہیں دیتی حنائے عیش ہم جانتے ہیں اس کو لبِ بام کی شفق
چڑھتی ہے آسماں کے جو کوٹھے پہ شام و صبح عاشق ہے کس کی سیرِ لبِ بام کی شفق
دستِ نگار بستہ ترے، اے بہارِ حسن ہیں جامہ کن کے پھول تو حمام کی شفق
وقتِ غروبِ مہر پیو مے تو مے کشاں تکلیف دے رہی ہے یہاں دام کی شفق
ہے رنگِ پاں سے لعل مسی زیب پُر بہار لگتی ہے جوں اودھ میں بھلی شام کی شفق
تاروں کی مہندی اس نے لگائی ہے ہاتھ میں پھبتا ہے گر میں اس کو کہوں دام کی شفق

دیتی ہے یاد دستِ نگارینِ گل رخاں
دشمن ہے مصحفی مرے آرام کی شفق

218

چالیس برس کا ہی ہے چالیس کے لایق یاں مردِ معمّر نہیں دس بیس کے لایق
اے وائے کہ پچیّس سے اب پانچ ہیں اپنے تھے ہم بھی کبھی روزوں میں پچیّس کے لایق

استاد کا کرتے ہیں امیر اب کے مقرر ہوتا ہے جو درماہہ کہ سائیس کے لایق
چارے کے لگائے سے ہوا دو کا اضافہ پھر وہ نہ چلے جی میں جوتیں کے لایق
خورشید سے لازم نہیں آنکھ اس کو چرانا گو امرِ حکومت ہوا برجیس کے لایق
منھ تھیلیوں کے کھلتے ہیں از بہرِ طوائف یعنی کہ یہ بگڑے ہیں سب ابلیس کے لایق
اے مصحفی طالع کی مرے شکل قضا نے
پیشانی پہ کھینچی بھی تو انکیس[1] کے لایق

219

باغباں، کھود نہ تو گردِ گلستاں خندق مانعِ دخل مجھے ہوگی نہ، ناداں، خندق
قلعۂ یار میں پہنچیں ہیں دلاور پیراک گرد ہو اس کے اگر قلزم و عماں[2] خندق
آپ ہے مرکزِ خاکی کا محافظ خالق حکم سے اس کے بنی گردشِ دوراں خندق
یار کے وصل کی امید پڑے جب مجھ کو پھاند جاوے اگر اس کوچے کی انساں خندق
تو نواڑے[3] کی کرے سیر تو بس ہو جاوے مثلِ آئینہ ترے حسن کی حیراں خندق
عمقِ آب اس کی کا اندازہ کوئی کیا لیوے دیدۂ تر کی تو رکھتی نہیں پایاں خندق
ایک ہی جست میں جاتا ہے اچک نالہ مرا سدِّ رہ اس کی تو ہوتی نہیں چنداں خندق
دخل کیا دیدۂ گریاں سے مری ہووے دو چار گو سمندر کے رکھے آبِ فراواں خندق
سیرِ خندق کو جو وہ ماہ ہو کشتی پہ سوار شب کو ہو عکسِ کواکب سے چراغاں خندق
آفتِ برق سے کچھ بچنے کی تدبیر کریں کھیت کے گرد عبث کھودیں ہیں دہقاں خندق
مصحفی سب نے سنا شورِ مبارک بادی
فتح کر آئے جو گھر کو شہِ مرداں خندق

1۔ انکیس؟ 2۔ عماں: سمندر (عرب کا جنوبی ساحل) 3۔ نواڑا: چھوٹی کشتی

ک

220

چھڑک، اے ابر، مری خاک پہ تو پانی ایک
سبزہ چاہے ہے یہاں بہرِ نمو پانی ایک

اختلافاتِ مذاہب نے صفا سب کھو دی
گرچہ صد ظرف میں تھا برلبِ جُو پانی ایک

ہوں جو آمیختہ گلرو کسے فائق سمجھوں
عطر مجموعہ کی دشوار ہے بو پانی ایک

برق کا ابر سے افزوں ہے مجھے اندیشہ
کاغذیں تن کا نہیں میرے عدو پانی ایک

اس میں سرخی کی جھلک اس میں صفا کی خوبی
میں دُر و لعل کا دیکھا نہ کبھو پانی ایک

جس کی شفّافیِ روغن پہ پڑی آنکھ کہا
اس کی تصویر کا ہے تا بہ گلو پانی ایک

اس کی قلعی میں نہیں دخل کمی بیشی کا
صاف رکھتا ہے وہ آئینۂ رو پانی ایک

مصحفی رحم نہیں یار کے دل میں مطلق
کر نہ رو رو کے عبث اپنا لہو پانی ایک

221

تصویر کا وہاں کی ہوتا ہے رنگ نازک
حسنِ فرنگ وش ہے کارِ فرنگ نازک

سینکوں کے پٹی پائے کلیاں انار کی ہیں
لعبت کا اس پری کی دیکھا پلنگ نازک

اک نیمچہ ہے کافی، باندھا نہ کر تو تیغا
تیری کمر بہت ہے اے خانہ جنگ نازک

کیونکر چبھیں نہ دل میں عشاق کے کہ نکلیں
مژگاں سب اس کی مثلِ تیرِ خدنگ نازک

اے مصحفی میں دیکھا وہ شے گدازِ الفت
اک دم میں جس سے ہووے جوں شیشہ سنگ نازک

گ

222

بس کہ نکھرا ہے مرے طالعِ مسعود کا رنگ
اس میں آتا ہے نظر آتشِ بے دود کا رنگ

خود پیے گا اسی صورت سے اگر اس کا ایاز
سرخ رہنے کا نہیں عارضِ محمود کا رنگ

حق نہ دشمن کی بھی قسمت میں کرے داغ فراق
آگ پر رکھنے سے ہوتا ہے سیہ عود کا رنگ

دیکھ لو بخششِ بسیار ہے خجلت کی دلیل
سرخ ہو جاوے ہے آخر کو کفِ جود کا رنگ

کیا شبِ وصل کی ہیبت میں کہوں کچھ مت پوچھ
اُڑ گیا جس سے مرے چہرۂ مقصود کا رنگ

حسن وہ شے ہے کہ بوڑھے کو جواں کرتا ہے
کر دیا صاف زنِ بیوہ نے داؤد کا رنگ

طرفہ عالم ہے جنوں کا ترے سودائی کے
نہ زیاں کی کوئی پُٹھ اس میں نہ کچھ سود کا رنگ

طفل جب طالعِ[1] عاشق پہ تولّد ہو تو پھر
زرد ہو جاوے نہ کیونکر شبِ مولود کا رنگ

کون سا کام نہ عاشق کا سر انجام ہوا
دیر میں اس کی جھلکتا ہی رہا زود کا رنگ

یوں ہے اس گل کے لبِ لعل پہ مجلس حیراں
کم نما شعلۂ کم دود پہ جوں دود کا رنگ

مصحفی تفرقۂ ممکن و واجب کے سوا
فرق رکھتا نہیں کچھ عابد و معبود کا رنگ

223

رونے سے مرے دیدۂ گریاں میں لگی آگ
یہ طرفہ کہ یاں موسمِ باراں میں لگی آگ

بے داغ نہیں دامنِ فانوس بھی چنداں
اے شمع اگر تیرے گریباں میں لگی آگ

بَن پھونک دیا قیس ترے نالے نے تب تو
کوسوں نظر آئے ہے بیاباں میں لگی آگ

دامن کی کناری سے کسی کے دمِ رفتار
برقِ شرر افشاں کے گریباں میں لگی آگ

1۔ طالع : وہ برج جو ہنگامِ ولادت افقِ شرقی پر نمودار ہو

شب نالے کیے میں نے بھی گرم ایسے کہ جس سے ناقوسِ صنم خانۂ رہباں میں لگی آگ
اے عشق یہ اسبابِ طرب سب تو جلا دے آخر تو ہمارے سروساماں میں لگی آگ
لکھّی غزل اک اَور بھی میں مصحفی یہ گرم
جس سے نئے کلکِ گہرافشاں میں لگی آگ

224

جوں شعلہ نہ میرے تنِ عریاں میں لگی آگ یاں حسن کے ہر تارِ گریباں میں لگی آگ
جب پھیل گیا پان کا رنگ اس کے لبوں پر معلوم ہوا چشمۂ حیواں میں لگی آگ
مسّی کی سیاہی نے کیا داغ حبش کو سرخی سے ترے لب کی بدخشاں میں لگی آگ
یاقوت کا تکمہ جو گلے میں ترے دیکھا حسرت سے تنِ اخگرِ سوزاں میں لگی آگ
پرہیز ہے عاشق کو روا، پھر نہیں بچتا پتلے کے جو دامان و گریباں میں لگی آگ
گرمی نے مرے دل کی جلائے مرے اعضا آخر تپِ ضیغم سے نیستاں میں لگی آگ
ظالم یہ ترا رنگِ کفک طرفہ بلا تھا جس رنگ سے لالے کے خیاباں میں لگی آگ
دن رات اسیروں کی جو یہ نالہ کشی ہے تو دیکھیو تو خانۂ زنداں میں لگی آگ
اے مصحفی پہنا جو لباس اس نے بسنتی[1]
سمجھائیں یہی، روضۂ رضواں میں لگی آگ

ل

225

غرقِ خوں ہو مثلِ داغِ لالہ میرا داغِ دل ہے میانِ شعلۂ جوّالہ میرا داغِ دل
دانۂ الماس ہوں جوں گرد نیلم کے جڑے لب پہ لایا عاقبت تبخالہ میرا داغِ دل

1۔ اصل: کسنبی

صاحبِ طبل و علم دیکھ اس کو پا جاویں شکست
جلوہ فرما ہو جہاں با نالہ میرا داغِ دل

داغ کی اس کے تو رکھ تدبیر بر سالِ دگر
اے مسیحا، ابھی یک سالہ میرا داغِ دل

سرد مہری سے بتاں کی جب سیاہی دور کی
پھر تو خود گھلنے لگا جوں ژالہ میرا داغِ دل

مار کے پیچھے رواں مثلِ سیہ عقرب ہوا
دیکھ اس کی چشم کا دنبالہ میرا داغِ دل

آب سے خالی ہوا یاں تک کہ آخر رہ گیا
کھو کے قرصِ ماہ خط ہالہ میرا داغِ دل

جوں شفق میں سرخ سورج ہو کبھی وقتِ غروب
اس طرح آتش کا ہے پرکالہ میرا داغِ دل

عشق کی آتش ہے کجلائی ہوئی تو کیا ہوا
جوں سپند آخر کرے گا نالہ میرا داغِ دل

پھر نہ لانے میں درنگ اس کے کرے اے مصحفی
ایک شب دیکھے اگر دلّالہ میرا داغِ دل

226

مر ہی گیا قفس میں نہ دیکھی بہارِ گل
مرغِ اسیر نے نہ کیا انتظارِ گل

بلبل یہ رنگ دیکھ کر بھر آہ رہ گئی
جب خار سبز بخت ہوا ہمکنارِ گل

اللہ رے رسائیِ بختِ سبک سراں
موجِ نسیم جھاڑے ہے گرد و غبارِ گل

شاید ہوا چمن کی گئی ان دنوں بدل
جو زرد ہو گیا رخِ بلبل شکارِ گل

مرغِ کباب سیخ بناوے اسے بہار
بیٹھے جو عندلیب سرِ شاخسارِ گل

محوِ جمال اپنا نہ ہو کیوں وہ باغباں
ہے آب جو کا آئنہ ہر دم دو چارِ گل

ہم فصلِ گل اسیر رہے اور مصحفی
لوٹی صبا نے لذتِ بوس و کنارِ گل

227

وہ کھنڈ گیا ہی مقدر جو تھی تباہِ گل
صبا، تو کرتی رہی کتنی خیر خواہیِ گل

جلو میں رہتی تھی لالے کے سرخ پلٹن بھی
چمن کے تخت پہ تھی جب کہ بادشاہیِ گل

نہ سرکشانِ چمن سر اُٹھا سکیں گے کبھی
جو چند روز رہی یوں ہی کجکلاہیِ گل

فروغِ بخت سے کیا تیرگیِ بخت مٹے — نہ کھووے شمع کا شعلہ کبھی سیاہیِ گل
بہارِ باغ سے جانے پہ ہے نہ رہ غافل — کہ مغتنم ہے تماشاے صبح گاہیِ گل
شہیدِ ناز کا دیکھا جو اس نے محضرِ خوں — ہنسا بہت وہ جب آئی نظر گواہیِ گل
نہ لختِ دل ہیں مرے مصحفی بدیدۂ تر
میانِ حوض شناور ہے سرخ ماہیِ گل

228

خانۂ دہر کے باہر مجھے حرمت سے نکال — آخر اے چرخ، جنازہ مرا عزّت سے نکال
رحم بھی، اے ملک الموت، تجھے لازم ہے — جاں نکالے جو مری تُو تو محبت سے نکال
مجھ کو دیتا ہے یہ کافر بہ تصوّر ایذا — افعیِ زلفِ سیہ کو مری تربت سے نکال
ملک وحشت کا اجارے میں لیا مجنوں نے — اور غزالوں کو دیا وادیِ وحشت سے نکال
بندہ تیرا ہوں، میں تجھ سے یہ دعا مانگوں ہوں — کہ خدایا مجھے اس عشق کی ذلّت سے نکال
کوچۂ یار میں رہنے دے مجھے، اے طالع — بے گنہ آدمِ خاکی کو نہ جنّت سے نکال
سر مرے دوش پہ ہے بارِ گراں اے قاتل — کہیں اک وار لگا تُو اس کی اذیّت سے نکال
گردشِ چرخ کر اتنی تو مدد عاشق کی — نجمِ بخت اس کا سوادِ شبِ فرقت سے نکال
پاسبانی تو ہی نبّاش[1] سے کر، اے مرّیخ — تا نہ لے جائے کفن وہ مری تربت سے نکال
رزق در اپنے سے تو مصحفیِ زار کو دے
کس و ناکس کی خدایا اسے منّت سے نکال

229

کیوں کہ چھوٹے کمرِ نازکِ جاناں کا خیال — موے چینی ہے مرے دل میں رگِ جاں کا خیال
مجھ کو سرگشتہ رکھے کیوں نہ ترا عالمِ حسن — چھوٹتا ہے کوئی بلبل سے گلستاں کا خیال
عید کی رات جو دیکھا ترے ابرو کے بغیر — ماہِ نو کو میں کیا خنجرِ عریاں کا خیال

1۔ نبّاش: کفن چور

میں نہ سمجھا تھا کہ گلیوں کی مجھے آخر کار
خاک چھنواوے گا نظارۂ خوباں کا خیال

ذبح کے وقت نہ شہ رگ سے نکلنا تھا اسے
نہ رکھا خوں نہ مرے یار کے داماں کا خیال

ایک ساعت نہیں بن چاک کیے رہتا آہ
دستِ بے صبر کو ہے کتنا گریباں کا خیال

اس ادا سے یہ نکلتا ہے نہ چھوڑے گی صنم
تیری آشفتہ سری موے پریشاں کا خیال

کانپے ہے جاتے ہوئے شہر کی جانب مجنوں
اس کو جب آوے ہے ہنگامۂ طفلاں کا خیال

کبھی بوچھار سے گر قطرۂ باراں بھی لگا
میں اسے دل میں کیا یار کی پلکاں کا خیال

ماہ کو خاک میں دیکھوں کہ پڑا پھرتا ہے
میری نظروں کے تلے اس مہِ تاباں کا خیال

اسی باعث تو نہیں اخگرِ دل کجلاتے
بس کہ رہتا ہے تری جنبشِ داماں کا خیال

گر ترے لب سے نہ ہو اس کو سرِ ہم رنگی
اپنا دل خوں نہ کرے لعلِ بدخشاں کا خیال

مصحفی دولتِ وصل اس کی نہ ہاتھ آوے گی
تو ہے درویش، نہ کر ملکِ سلیماں کا خیال

230

بزم میں اے گل تو بیٹھا سونگھتا ہے کس کے پھول
راہ تیری تک رہے ہیں باغ میں نرگس کے پھول

خارِ مژگانِ بتاں نے نیشِ کژدم کی طرح
دل کی کیاری میں مری آخر کو بوئے بس کے پھول

دردِ سر کے واسطے یہ بھی مجرب ہے دوا
اپنی پیشانی کو مجکن کے لگا تو گھس کے پھول

دو نے بجھواتے ہیں عاشق اور تو نافہم ہے
اے صنم اچھا نہیں کچھ سونگھنا جس تس کے پھول

کیا فسوں وہ پڑھ کے دے ان پر تجھے کیا جانیے
ہاتھ میں لیتے نہیں، نادان، ہر مونس کے پھول

جب تری تیغِ ادا سے یک قلم بسمل ہوئے
اک طرف کچھ خوں میں تڑپا اک طرف کچھ سسکے پھول

تو بھی اے بلبل، لگا دے آشیاں کو اپنے آگ
فصلِ گل رخصت ہوئی اک اک چمن سے کھسکے پھول

شوق گجرے کا جو ہے خوبانِ نرم اندام کو
میں گندھے ہی دیکھتا ہوں ہاتھ میں جس تس کے پھول

کیا گلِ کشتی تہتن بھیجے اس سفاک کو
دیدۂ قربانیاں جس گل کی ہوں مجلس کے پھول

سینۂ عاشق پہ یوں مستی کے گل ہیں مصحفی
ہوویں جوں مفلس سپاہی کی سپر پر مس کے پھول

231

جوں گلِ حرماں چمن سے ہاتھ آئے کس کے پھول — تیرے کشتوں کے ہوئے وقفِ کفن نرگس کے پھول
یوں کیا فرسودہ حسنِ گل رخاں کو چرخ نے — گلشنِ تعمیر کے مٹ جاویں جیسے گھس کے پھول
بلبلِ بیتاب نے آخر پھڑک کر جان دی — اور نہ پھینکے اے صبا تو نے قفس میں اس کے پھول
بزمِ عیاشی میں اس کی قدر یہ خوباں کی ہے — ہر طرف پامال جوں شادی کی ہو مجلس کے پھول
عشق پیچے سے ہے لیلیٰ کے تئیں اک رفتگی — کیوں نہ بالے میں پروے اپنے وہ پھر اس کے پھول
دیکھیاں ہیں کس کی شب چشمِ خماری خواب میں — صبح ہونے آئی اور کھلتے نہیں نرگس کے پھول
تو سِیُم کے روز بھی ظالم نہ آیا حیف ہے — ہو گئے، کہتے ہیں تیرے عاشقِ مفلس کے پھول
فرشِ گل پر خواب تب آیا سمن بر کو مرے — ہو گئے کروٹ تلے بے رنگ و بو جب پس کے پھول
سرمگیں آنکھوں نے تیری جس کو مارا اے صنم — اس کی تربت سے اُگیں گے حشر تک نرگس کے پھول
شرم سے روے عرق افشاں کی تیرے باغ میں — ہو گئی کافور شبنم اور چمن سے کھسکے پھول

دیکھ کر گل پوش اس نخلِ جواں کو مصحفی
جی میں کہتا ہے جنوں میں بھر کے دامن اس کے پھول

232

دلفریب اس رنگ سے کب ہیں چمن میں اس کے پھول — صدقے ان بیمار آنکھوں کے گئے نرگس کے پھول
کیا ہوا میں بھی جو دو پتے چمن سے لے گیا — چھیننا گلچیں غضب ہے ہاتھ سے مفلس کے پھول
شاخِ گل سے گر وہ ساعد ہو ادھر گدکے میں چست — رنگ و بو پیدا کریں اس کی سپر میں مس کے پھول
دونے گڑوے سے نہ اب کچھ شوق کرنا ہے مجھے — بزم میں میری نہ لا اے باغباں جس تس کے پھول
کیا کہوں میں دل میں میرے سب کی گیندوں کے ہیں داغ — اس نے گلبازی میں کھائے ہاتھ سے کس کس کے پھول
جب چمن میں وہ مستی آلودہ لب یاد آ گئے — غنچۂ سوسن مرے حق میں ہوئے سب پس کے پھول

دے رہی تھی وہ صبا کو وصل کی شب کا پتا صبح تھے اس چاندنی پر ڈھیر جو مجلس کے پھول
جب گیا ہے باغ میں کھولے وہ گل بندِ قبا مٹ گئے ہیں اس کے سینے کی صفا پر پس کے پھول
لڑکے چورا ہے کے بھی اکثر اٹھالاتے ہیں ہار ہے ترا پنڈا اچھوتا مت پہن جس تس کے پھول
تھا سراپا وصل کی شب وہ صنم باغِ طلسم گر بڑھاتا ہاتھ بھی تو پھر میں چنتا کس کے پھول
عشق کا جن کب عزیمت خواں سے اُترا مصحفی
آگ پر ڈالے بدن سے میرے گو گھس گھس کے پھول

233

بینی و گوش تک ترے پہنچے شمیم و گل تو کیوں نہ ہووے روکشِ باغِ نعیم و گل
غم خوار گر اُنھوں کے نہ ہوویں نسیم و گل پہنچاوے کون تا بہ اسیراں شمیم و گل
مدت ہوئی کیا ہے میں ترکِ نسیم و گل ناساز ہے دماغ سے میرے شمیم و گل
دل بستگی نہیں ہے انھیں زر سے مطلقاً معنی کے بیچ ایک ہیں دستِ کریم و گل
کب لطفِ خانہ باغ کو دیتا ہے ہاتھ سے رہتا ہے خود وہ شوخ بہ سیرِ حریم و گل
بلبل رہے گی اپنا تو سر پیٹتی ہوئی شب گیر[1] جو چمن سے نسیم قدیم و گل
بادِ خزاں کے چلتے ہی برباد ہوگیا مرغِ چمن کا ہائے وہ ربطِ قدیم و گل
دیکھی ہے کس نے نورِ تجلی میں تیرگی یکجا نہ ہو سکیں کبھی شمعِ گلیم و گل
عارض پر اس کے موے پریشانِ زلف دیکھ بلبل نے یوں کہا یہ بلاے عظیم و گل
جب باغ میں کیا تھا تجھے ذبح عندلیب رنگت میں ایک تھا ترا حلقِ دو نیم و گل
کیا کام بوے خوش سے مریضِ فراق کو ہے کچھ بھی ربط بالشِ فرشِ سقیم و گل
دیکھیں دم عتاب جو رخسارہ اس کا سرخ اُڑ جائے رنگِ شعلۂ نارِ جحیم و گل
میں نے لیا گر اس کو اجارے تو مصحفی
رضواں رہے گا مالکِ باغِ نعیم و گل

1۔ شب گیر کرنا : نصف شب کے بعد سفر کرنا

234

ہے روح و جسمِ خاکیِ انساں نسیم و گل
ہوتے ہیں جیسے ظاہر و پنہاں نسیم و گل

کھلنے سے اس کے وقتِ تنفّس عیاں ہوا
رکھتا ہے خود وہ غنچۂ خنداں نسیم و گل

بلبل بھی آشیاں کو جلا کر چلی گئی
جس دم ہوئے چمن سے پُر افشاں نسیم و گل

جاتا تھا کب چمن کی طرف مجھ سا بے دماغ
ہوتے اگر نہ سلسلہ جنباں نسیم و گل

پھر اپنی آہ و لختِ جگر میں ہے اتفاق
یعنی ہوئے ہیں دست و گریباں نسیم و گل

پنکھا وہ جب ہلائے ہے آتی ہے بوئے خوش
گرما میں بس کہ اس کے ہیں چسپاں نسیم و گل

گھوڑے پہ باؤ کے وہ تو آتش میں اس کا نعل
کیونکر رہیں میانِ گلستاں نسیم و گل

اینک ہوائے باغ کی ٹک اور سیر کر
یعنی ہیں چند روز کے مہماں نسیم و گل

پہنچے ہے فیض ان سے نہاں و عیاں مدام
اے مصحفی ہے صحبتِ نیکاں نسیم و گل

235

اُس بن جو دیکھتا بھی ہوں گا ہے میں سوئے گل
نشتر سی کچھ دماغ میں لگتی ہے بوئے گل

بخلِ صبا یہی ہے تو مدفن میں اپنے ساتھ
لے جائیں گے اسیرِ قفس آرزوئے گل

جب شاخ پر کھلا وہ، لیا ووں ہی اس کو توڑ
گلچیں سوا کوئی میں نہ دیکھا عدوئے گل

ہے دلفریب نام خدا اس کی ہر ادا
چلنے میں وضعِ کبک ہے ہنسنے میں خوئے گل

اس گل کے پاشنے میں لگاتا ہے کفش دوز
پہنچی ہے کس مقام تلک، جستجوئے گل

چٹکا کیے وہ صبح تلک اور نہ ہو سکا
بلبل کے چہچہوں سے فشارِ گلوئے گل

افسوس غنچگی ہی میں پژمردہ ہم ہوئے
اک لحظہ آنکھ کھول کے دیکھا نہ روئے گل

اے مصحفی تو جان کا دشمن نہ اس کی ہو
مرغِ قفس کے آگے نہ کر گفت گوئے گل

236

ہرگز نہ تیرے رُو سا ہوا صاف روئے گل
شبنم نے کی اگرچہ بہت شست شوئے گل

مرغ اسیر کھینچ کر اک آہ رہ گیا
چاکِ قفس سے اس نے جو دیکھا بہ سوئے گل

اے گل فروش، ہار بنا اس کے واسطے
نکلے کسی طرح تو بھلا آرزوئے گل

آتش میں رنگ گل کی دیا آشیانہ پھونک
بلبل کے دل سے پر نہ گئی آرزوئے گل

شاید لگا کے عطر چمن میں گیا تھا یار
دیتی ہے اور بو مجھے کچھ آج بوئے گل

آیا تھا کون باغ میں سیر و شکار کو
مذبوحِ تیغ ناز ہیں لاکھوں گلوئے گل

اک پنکھڑی نہ اس کی چمن میں رہی دریغ
ہونا نہ تھا، صبا! تجھے اتنا عدوئے گل

ہم مصحفی چمن میں نہ جاویں گے اب کے سال
ناساز ہے دماغ سے کچھ اپنے بوئے گل

237

کان دھر کر ترے کوچے میں سنوں زاریِ دل
تا ہو معلوم مجھے دردِ گرفتاریِ دل

پیر ہو کر بھی نہ سمجھا میں بڑا قہر ہوا
رہی دن رات وہی مشقِ زیاں کاریِ دل

پاس سے اس کو شبِ غم نہ سرکنے دیتا
نہ ہوئی مجھ سے تو اتنی بھی نگہداریِ دل

دوڑ دوڑ اس کی گلی میں ہی یہ جاتا ہے مدام
کوئی تا چند کرے آہ، خبرداریِ دل

بھاڑ میں جاؤ، پڑو چولھے میں، کیا کام مجھے
ہونہیں سکتی ہے اب مجھ سے بھی غمخواریِ دل

صاحب اس رنج کا جیتا نہ سنا ہم نے کوئی
نہ ہو دشمن کی بھی قسمت میں یہ بیماریِ دل

مجھ سے اب وہ بھی لگی منھ کو پھرانے اپنے
زلفِ کج دار جو تھی سوہنِ [1] ہمواریِ دل

مصحفی جا کے میں گلزار سے ناشاد آیا
نہ ہوئی بادِ صبا سے بھی ہواداریِ دل

1۔ سوہن: ریتی

م

238

سستے تمھارے ہاتھ بکے اس قدر کو ہم
انصاف تو کرو کہ چکے اک نظر کو ہم

خط طاق پر رہیں گے لکھے سب پڑے ہوئے
یہ رنگ ہے تو بھیج چکے نامہ بر کو ہم

دریا میں بھی ہیں کشتۂ اندازِ دلبری
تیغِ کرشمہ سمجھے ہیں موجِ خطر کو ہم

شب چاندنی میں ہم سے رہِ راست گم ہوئی
منھ دیکھ اس کا بھول گئے اپنے گھر کو ہم

قاصد نہ کر مبالغہ چل اپنی راہ لے
خط دے چکے ہیں اپنا نسیمِ سحر کو ہم

آؤ نہ تم تو اپنا تصور ہی بھیج دو
مدت سے تک رہے ہیں صنم اپنے در کو ہم

دو چار دن تو دید اُڑا لیویں مصحفی
آخر تو یاں سے جاویں گے اک دن سفر کو ہم

239

اب حرفِ ''آہ'' آہ نکلتا ہے لب سے کم
کچھ ہو گیا ہے دردِ دلِ خستہ شب سے کم

میں گل چنے ہیں گلشنِ عیش و طرب سے کم
چسپاں ہوا ہے پان کا رنگ اپنے لب سے کم

حمالیاں میں کیوں کہ کروں بارِ عشق کی
بازو ہیں آشنا مرے رنج و تعب سے کم

چھوڑا اگر ایک کو تو ہوا دوسرے پہ غش
فرصت ملی مجھے دلِ آفت طلب سے کم

معلوم کچھ نہیں کہ تری چشمِ شوخ نے
نظارہ بام و در کا کیا کس سبب سے کم

ہیں آشنائے گوشۂ چشمِ تمام لطف
ہم کو پڑا ہے کام نگاہِ غضب سے کم

عنّابِ لعلِ یار خبر لے مری، نہیں
گرمی جنونِ عشق کی سوزندہ تب سے کم

برداشت تھی نہ شکوۂ عاشق کی اس لیے
ملنا کیا ہے اس بتِ کافر نے سب سے کم

کیا پوچھتے ہو حال پہ اس خاکسار کے
ہے اس کا التفاتِ دلی اب تو کب سے کم

تکلیف پائے خُم نہ کرو اس کو مے کشو! زاہد کو راہ رسم ہے بنت العنب سے کم
جانا کیا ہے میں نے بھی موقوف ہم نشیں اس بزم میں ہوئی ہے مری قدر جب سے کم
میں غش ہوں مصحفی متنبّی کی نظم پر
مجھ کو اگرچہ شوق ہے شعرِ عرب سے کم

240

گرچہ تھے دیر سے پرواز کے انداز میں ہم پر تو کھولے پہ نہ آئے پرِ پرواز میں ہم
پسِ پردہ سے صدا کس کی یہ نکلی ہے ہے بے اجل مر گئے جو ایک ہی آواز میں ہم
زلفِ درہم کا رہا قصہ ادھر، اے خطِ سبز ہو گئے درہم و برہم ترے آغاز میں ہم
مستی و رقص کا باعث ہے جو باقی ہیں مدام وصفِ طاؤسِ چمن اس بتِ طنّاز میں ہم
دست بردار نہیں ہوتی ہے عسرت[1] ہم سے یہی لائے تھے مگر طالعِ ناساز میں ہم
دیکھیں ہو پنجۂ مژگاں سے رہائی کیونکر بے طرح اب کے پھنسے چنگلِ شہباز میں ہم
سرو سے خوبرو دلچسپ، صنم! پاتے ہیں حرکت لاکھ ترے سروِ سرافراز میں ہم
مصحفی عالمِ قدسی سے تو آتا ہے چلا
فرق لا سکتے ہیں مُو بھر ترے اعزاز میں ہم

241

زاری سے میری کم نہیں کچھ زاریِ قلم ہم تیرہ روزی ان کو ہے نثّاریِ[2] قلم
سینہ وفورِ آہ سے جنگل بنا مرا جس طرح نیستاں میں ہو بسیاریِ قلم
بے تربیت درست نہیں ہوتے ہیں نے تراش ہووے قلم تراش سے تیّاریِ قلم
دعویٰ ہے اہلِ لاف کا بس اور کچھ نہیں میرے بُناں[3] سے موجبِ بیزاریِ قلم
لکھے وہ الجھے بالوں کا مضموں تو کیوں نہ ہو لیف[4] دوات دامِ گرفتاریِ قلم

1۔ اصل: عشرت 2۔ اصل: نساری 3۔ بُنان: انگلیوں کی پوریں 4۔ لیف: خرما کی چھال

جتنا زمانہ تجھ سے تراشے تو شاد رہ — موجب فلاح کا ہے زیاں کاریِ قلم
گر بڑھ چلے حریف تو سختی سے پیش آ — تیغ زباں ہے سوہنِ ہمواریِ قلم
شاید قریب آئے ہیں دن شب برات کے — جو شہر میں ہے جوشِ خریداریِ قلم
ابلاغ وحی چاہے ہے ثالث کو ہو سکے — کاتب سے کیا بغیر مددگاریِ قلم

یوں جاہلوں کے بیچ معطّل ہے مصحفی
جوں قومِ کم سواد میں بیکاریِ قلم

242

گلشن سے ترے حسن کے گلچیں نہ ہوئے ہم — جوں لالۂ جاں سوختہ رنگیں نہ ہوئے ہم
زخموں سے تری تیغ کے تزئیں نہ ہوئے ہم — رنگیں تو تھے اور بھی رنگیں نہ ہوئے ہم
صد شکر نہ آئے تری مژگاں کے مقابل — سیلی خورِ سر پنجۂ شاہیں نہ ہوئے ہم
جس رات نہ دیکھا تری خم کردہ جبیں کو — اس رات دوچارِ مہ و پرویں نہ ہوئے ہم
یہ حوصلۂ ضبط نہ ہر ایک نے پایا — غم دل پہ جو آیا بھی تو غمگیں نہ ہوئے ہم
نت وصل کی حسرت میں رہے چاک گریباں — اک رات کسی کے گلِ بالیں نہ ہوئے ہم
سو بار گلِ شمع صفت سر کو کٹایا — اس پر بھی کبھی قابلِ تحسیں نہ ہوئے ہم
سر رکھتے ہی دی جاں قدمِ یار پہ ہم نے — منّت کشِ خوانندۂ یٰسیں نہ ہوئے ہم
کیا چوک ہوئی ہم سے کہ اس بختِ رسا پر — بندے ترے اے کاکلِ مشکیں! نہ ہوئے ہم
رخسار و بنا گوش کو اس گل کی جو دیکھا — گلشن میں فدائے گل و نسریں نہ ہوئے ہم

اے مصحفی تلخی میں نہ یوں جان کو کھوتے
فرہاد صفت عاشقِ شیریں نہ ہوئے ہم

243

آتے ہی چوری چوری جی میں سما گئے تم — منھ سے تو کچھ نہ بولے پر جان کھا گئے تم

آ کر جو بام پر شب مکھڑا دکھا گئے تم ‌ ‌ ‌ ہم کیا کہیں جو اپنی صورت بنا گئے تم
اک گوشے میں پڑا تھا بستر پہ غم کے تنہا ‌ ‌ ‌ ٹھوکر لگا کے نا حق فتنہ جگا گئے تم
رستے میں منہ چھپائے جاتے تھے مثلِ وحشی ‌ ‌ ‌ دیکھا جو مجھ کو آتے آنکھیں چرا گئے تم
کب سوز دل کا اپنے مذکور میں کیا تھا ‌ ‌ ‌ وہ بات کی کہ جس سے جی ہی جلا گئے تم
وقتِ وداع آئے کرنے مجھے جو رخصت ‌ ‌ ‌ ٹک منہ پھرا کے مجھ سے منہ ہی چھپا گئے تم
خنجر، چھری، طمنچے سب کچھ چلیں گے ہم پر ‌ ‌ ‌ وادی[1] پہ بانک پن کی جس وقت آ گئے تم
اچھا ہوا نہ رکھا باقی سگاں کی خاطر ‌ ‌ ‌ لاشے کو میرے آ کر آپھی جلا گئے تم
مدت سے ڈھونڈتی تھیں تم کو ہماری آنکھیں ‌ ‌ ‌ گر خواب میں بھی آئے گویا جلا گئے تم
پایا پتا تمھارا، اے رفتگاں، نہ ہم نے ‌ ‌ ‌ کیا گرم اس چمن سے مثلِ صبا گئے تم
ملتے تھے بے تکلف عالم میں سادگی کے ‌ ‌ ‌ آنکھیں لگے چرانے جب دل کی پا گئے تم

دیواں تمھارے ساتوں ہیں ہفت خوانِ رستم
میاں مصحفی سخن کا دریا بہا گئے تم

244

دیتی تھی ہم کو نکہتِ گل کا پتا نسیم ‌ ‌ ‌ ہم سے بھی تھی چمن میں کبھی آشنا نسیم
اس گل تلک جو لے کے مرا خط نہیں گئی ‌ ‌ ‌ پانو کو کیا لگی ہے ترے بھی حنا نسیم
پہنچے ہے صدمہ بلبلِ شیدا کے دل کو آہ ‌ ‌ ‌ ہر لحظہ شاخِ گل کو تو یوں مت ہلا نسیم
تصدیع[2] دے نہ ناخنِ تدبیر کو عبث ‌ ‌ ‌ تصویر کی کلی کوئی ہوتی ہے وا نسیم
اٹکھیلیاں جو کرتی ہے کلیوں سے دمبدم ‌ ‌ ‌ تجھ کو بھی کیا لگی ہے چمن کی ہوا نسیم
جاتے تھے دوڑے پیچھے دمِ سرو بھی کئی ‌ ‌ ‌ کس کی گلی کا رات تجھے قصد تھا نسیم

1۔ وادی پر آنا: (میر نے بھی استعمال کیا ہے) :

وحشت میں ہوں بلا گر وادی پہ اپنی آؤں ‌ ‌ ‌ مجنوں کی محنتیں سب میں خاک میں ملاؤں

2۔ تصدیع: تکلیف

غنچوں کی پُور پُور ہوئیں جو گلابیاں بے ڈھب لگی انھوں کے تری پشتِ پا نسیم
گلگشتِ باغ سے مرا ٹھنڈا ہوا نہ دل تو نے تو اور دی مری چھاتی جلا نسیم
فتنہ چمن میں جاگے تو دے اس کو تھپکیاں مانندِ طفل غنچہ رکھے ہے سُلا نسیم
صدمے کو دل سے بلبلِ شیدا کے پوچھیے
نازک قبائے گل پہ جو لائی جفا نسیم

245

منھ پھرا مت قتل کو میرے ہے کافی پشتِ چشم تیغِ غمزہ کا میاں ہے یہ غلافی پشتِ چشم
قافلہ پھولوں کی پتی کا رواں ہو باغ سے ان کو لکھوا دے جو فرمانِ معافی پشتِ چشم
عکسِ خالِ مردمک اس کا نہ ہو خالِ سیاہ چشم سے افزوں رکھے ہے سینہ صافی پشتِ چشم
روزنِ بادام میں صندل کی اس پر بندکیاں رکھے ہے اس گل کی یہ وصف اضافی پشتِ چشم
کیوں نہ دب جاوے نگاہ ناتواں اس کے تلے سر اٹھانے دیتی ہے کب وہ غلافی پشتِ چشم
مہربانی کی حلاوت خاک میں سب مل گئی کی جو تازک[1] اس نے ہنگام تلافی پشتِ چشم
باغ تک وہ شرمگیں آتا تو بس اک آن میں نرگسِ بیمار کی ہوتی ہی شافی پشتِ چشم
قشر[2] کو بادام کے یہ مرتبہ حاصل نہیں
مصحفی اس کی کرے ہے پوچ بافی پشتِ چشم

246

تصدیع کھینچتے ہیں اب اس گلستاں میں ہم دیویں گے اک دن آگ لگا آشیاں میں ہم
چھالے پڑے ہیں گو تفِ دل سے زبان پر اس پر بھی کوتہی نہیں کرتے فغاں میں ہم
دن رات جھوٹے وعدے ہی بس درمیاں رہے اک دن کہا "نہ آویں گے تیرے مکاں میں ہم"
انجامِ کار دیدۂ دشمن کے واسطے دیکھا تو مشتِ خاک تھے اس خاکداں میں ہم

1۔ تازک ؟ 2۔قشر : چھال، چھلکا

اے شورِ حشر، پاس ہمارے نہ آئیو کچّی ہے نیند، ہیں ابھی خوابِ گراں میں ہم
تجھ بن شبِ فراق کی گھڑیوں کو تا سحر گن گن کے صرف کرتے ہیں آہ و فغاں میں ہم
اس دم اماں ملے ہمیں کینِ چراغ سے جب نیستی کی پہنچیں گے دار الاماں میں ہم
تیرِ جفا کا اس کے نشانہ رہے مدام شکرِ خدا نکل نہ گئے امتحاں میں ہم
اے آفتابِ حشر نہ اتنا ستائیو بیٹھے ہیں دُودِ دل کے ذرا سائباں میں ہم
کیوں پاس تیرے بیٹھنے دیویں رقیب کو یوں رشک چاہتا ہے کہ ہوں درمیاں میں ہم
باندھا کریں ہیں ہجر کی شب بیٹھے تا سحر کیا کیا خیال اپنے دلِ بدگماں میں ہم
ہر شب بہارِ شمع پہ کرتے ہیں جاں نثار پروانہ ساں نظر نہیں آتے خزاں میں ہم

مرزا و میر کا تو نہ کر ذکر مصحفی
اشعر ہیں اب تو کشورِ ہندستاں میں ہم

247

یہ تو کہاں کہ فرشِ مشجّر ہے اور ہم انجامِ کار خاک کا بستر ہے اور ہم
لے جا کے نامہ بیٹھ رہا اس گلی کے بیچ آوے گراب کے واں سے کبوتر ہے اور ہم
سودا سا ہو گیا ہے ہمیں اس کے عشق میں ہر شب خیالِ زلفِ معنبر ہے اور ہم
کنجِ قفس میں خوب سے کر لیویں چہچہے آخر تو ایک دن دمِ خنجر ہے اور ہم
اس مخمصے میں کٹتی ہیں راتیں فراق کی نت دست بر دعا دلِ مضطر ہے اور ہم
گراب کے میکدے میں ہمیں بخت لے گئے تو دیکھیو کہ شیشہ و ساغر ہے اور ہم
جا کر اسیرِ فتنہ ہوئے اس گلی کے بیچ ہنگامہ ایک حشر کا سر پر ہے اور ہم
ہے برخلاف سارا زمانہ تو کیا ہوا کی بخت نے مدد تو وہ دلبر ہے اور ہم
سوز و گدازِ عشق کی دولت شبِ فراق جوں شمع تا سحر مژۂ تر ہے اور ہم

دل نذر کر چکے ہیں پری وش کے ہو سو ہو
اے مصحفی اب آگے مقدر ہے اور ہم

248

آہ اک دن جو پڑا اس دلِ ناشاد سے کام
رات بھر مجھ کو رہا نالہ و فریاد سے کام

اس کی تصویر کے پائیں وہ لکھے کاش مجھے
نکلے کچھ اپنا بھی تو خامۂ بہزاد سے کام

رنج الفت سے قفس میں بھی نہ چھٹ کر چھوٹے
واں بھی ہم کو تو رہا الفتِ صیّاد سے کام

اب وہ سودائے جنوں کے نہ رہے دن ہم کو
تھا کبھی الفتِ طفلانِ پری زاد سے کام

روز زنجیر کی ٹوٹے ہے کڑی زنداں میں
روز رہتا ہے ترے قیدی کو حدّاد سے کام

ہاتھ سے اپنے ہمیں ذبح کرے کیوں نہ وہ شوخ
عیدِ قربانی میں لیتے نہیں جلاّد سے کام

آشنائی تو درست اس سے رکھیں آخرکار
کبھی جاوے گا نکل اپنا بھی جلاّد سے کام

اپنی مسکینی بھی رکھتی تھی اثر اب کے ولے
کچھ نہ سمٹا لبِ خاموش کی فریاد سے کام

غزل ایجاد کیا کرتے تھے ہر روز نئی
ہم بھی رکھتے تھے کبھی عالمِ ایجاد سے کام

یادگار اس کی زمانے میں رہے گا برسوں
یہ جو آخر کو ہوا تیشۂ فرہاد سے کام

کیا سرورُو پہ ہے موقوف کہ رگ رگ کو مری
دم بدم ہے خلشِ نشترِ فصّاد[1] سے کام

اس گھڑی دیکھیے تائید خدا کس کی کرے
جب پڑے مصحفی فولاد کو فولاد سے کام

ن

249

خوب رویاں جو مرے درد کا چارا نہ کریں
منع کا بھی تو طبیبوں کو اشارا نہ کریں

حسن سے اپنے نہ سیری ہو بتاں کو ہرگز
تا کہ آئینے میں سو بار نظارا نہ کریں

مصلحت ہے یہ بھگو کر کے سنگھاویں مٹی
غش میں آویں تو ہمیں یار پکارا نہ کریں

1۔ اصل: فستاد

یک طرف سنگ کہ اس کی بھی ہمیں تاب نہیں ‏ دیکھ کر ہم کو بتاں آنکھ بھی مارا نہ کریں
مہربانی ہے بڑی یہ کہ بتاں مجلس میں ‏ سامنے میرے رقیبوں کی مدارا نہ کریں
دمبدم سر پہ چڑھاویں جسے چاہیں خوباں ‏ حرف ہے اس میں ہمیں دل سے اتارا نہ کریں
مصحفی عشق سے مجبور ہیں ہم تو، ورنہ
شبِ ہجراں کی مصیبت کو گوارا نہ کریں

250

نالے ہزار مرغِ چمن کے دہن میں ہیں ‏ دو چار ڈالیاں ابھی رنگیں چمن میں ہیں
ہم اپنے ساتھ لے کے چلے ہیں یہ کارواں ‏ صد آرزوے کشتہ ہمارے کفن میں ہیں
شاید کچھ اس کے رو و بناگوش کا ہے ذکر ‏ باہم اشارتیں جو گل و یاسمن میں ہیں
سوے عدم چلی ہے وہ یہ لے کے ارمغاں ‏ سیلاب سے جو شمع کے آنسو لگن میں ہیں
یہ کہتے ہوں گے ان کو ملا ہے سفر میں چین ‏ ہم سے جدا جو یار ہمارے وطن میں ہیں
گزرے سلف تو خوب پر اب بھی جو دیکھیے ‏ کیا کیا عزیز مجلسِ اہلِ سخن میں ہیں
مژگاں نے تیری چین گلستاں کا کھو دیا ‏ کانٹے ہر ایک گل کے چبھے پیرہن میں ہیں
عالم وہ تیرے حسن کا جاتا رہا ولے ‏ اب بھی ہزاروں چاؤ دلِ مرد و زن میں ہیں
چیں میں تو چینِ زلف پہ مرتے ہیں چینیاں ‏ مشتاق چشمِ شوق کے آہو ختن میں ہیں
اے کاش ان سے روزِ جزا وہ دوچار ہو ‏ شیریں سی حسرتیں جو دلِ کوہ کن میں ہیں
گلبرگ لب میں اس کے نہ دیکھے میں مصحفی
جو جو مزے کہ یار کے سیب ذقن میں ہیں

251

نہ ترے حسن کے دن اور نہ بہاریں وہ رہیں ‏ نہ وہ جالی، نہ وہ محرم، نہ ازاریں وہ رہیں
منھ نہ کھولے مرے گھر آ کے کبھی حوریوں نے ‏ جب تلک بیٹھی رہیں زونٹ[1] ہی ماریں[2] وہ رہیں

1۔ زونٹ مارنا : گھونگھٹ نکالنا؟ ‏ 2۔ ماریں : مراد مارے

تیرے بن ہم نے نہ دیکھا کبھی پریوں کی طرف گو خط و خال کو نت اپنے سنواریں[1] وہ رہیں
اختلاط اس سے جو شب کا تھا سو برباد گیا نہ وہ چوسر ہے نہ جیتیں ہیں نہ ہاریں وہ رہیں
سائلِ حسن ترے رخ سے ہیں آنکھیں میری تب تو مژگاں سے سدا ہاتھ پساریں[2] وہ رہیں
دم شماری ہے اب انجام ریاکاریِ شیخ نہ وہ تسبیح کے دانے نہ شماریں وہ رہیں
مل گئے خاک میں کیا کیا نہ رقیبانِ بزرگ نہ وہ لوحیں، نہ مجر، نہ مزاریں وہ رہیں
مصحفی ہو گیا کیا عالمِ پیری میں تجھے
آنسوؤں کی ترے رخ پر نہ قطاریں وہ رہیں

252

مہ و خورشید گر اس رخ کا نظارا نہ کریں روز و شب سر در و دیوار سے مارا نہ کریں
سالکِ دشتِ تجرّد ہوں میں کہہ دو ان سے قیس و فرہاد طرف میری گزارا نہ کریں
دل میں کھب جائے جو تو مانی و بہزاد کے شوخ کیوں کہ تصویر تری بیٹھے اُتارا نہ کریں
سر بسر شکوہ ہے یاروں سے و لے نزع کے دم آسماں ہی کی طرف ہم تو اشارا نہ کریں
ہم ہیں خوگر وہ نزاکت کے تری دور ہے کیا خندۂ گل کو طبیعت پہ گوارا نہ کریں
اک نظر تجھ کو دکھادیں اسے لازم ہے طبیب اس سوا کچھ ترے بیمار کا چارا نہ کریں
ناتواں ہم سے نہ منزل کو کریں طے ہرگز قافلے والے جو پھر پھر کے پکارا نہ کریں
دوہرے صیاد غلاف اس پہ چڑھا رکھتا ہے تا اسیرانِ قفس گل کا نظارا نہ کریں
مصحفی قیمتِ دل نیم نگہ کہتے ہیں
کیا کریں ہم اگر اس سودے میں وارا نہ کریں

253

بسمل نے وقتِ ذبح اگر آنکھیں کھولیاں رخصت وہ تیرے خنجرِ مژگاں سے ہولیاں
عاشق پہ برچھیاں تری مژگاں نے تولیاں "یہ کُشتنی نہیں" وہ نگاہیں نہ بولیاں

1۔ سنواریں : یعنی سنوارے 2۔ پساریں: یعنی پسارے

از بس کہ ہو گئے ہیں نپٹ شوخ طفلِ اشک — باہر نکل کے گھر سے یہ کھیلیں ہیں گولیاں
محتاجِ عطر کب ہیں وہ پیراہنِ بتاں — جوشِ عرق سے جن کی مہکتی ہیں چولیاں
پھبتی جگت وہی ہے مرے ساتھ شوخ کی — ویسی ہی ہشت ہشت وہی ہیں ٹھٹھولیاں
محروم برگ گل سے نہ رکھ اب تو باغباں — گلبن سے گل اترتے ہیں بھر بھر کے جھولیاں

سودا نہ مصحفی سے گیا، گو طبیب نے
جلاب بھی دیے، کئی فصدیں بھی کھولیاں

254

نرگس نے گل کی دید کو آنکھیں جو کھولیاں — کچھ جی میں جو سمجھ گئیں کلیاں نہ بولیاں
کیا قیس کوہِ نجد سے آیا بہ سوے حی — لڑکے بھرے پھریں ہیں جو پتھروں سے جھولیاں
آنسو نہیں یہ، عشق سے جو مجھ کو جنگ ہے — سانچوں سے وہ تو چشم کے ڈھلتی ہیں گولیاں
دل میکدے سے جانے کو کرتا نہیں مرا — آتی ہیں صورتیں جو نظر بھولی بھولیاں
وحشت نے حیلہ جو ہی رکھا نت مسیح کو — آخر نہ پٹیاں مرے زخموں کی کھولیاں
مقتل میں جا کے دانۂ تسبیح کی طرح — نیزے کی تیرے نوک نے جانیں پرولیاں
سج دھج، ادا، فصاحت و تقریر کیا کہوں — دیکھا تو لکھنؤ کی قیامت ہیں بولیاں
خوبانِ سبز رنگ کی پورب میں کیا ہو قدر — جب دو دو پیسے بکتی ہوں پانو کی ڈھولیاں

نوچندیِ پنجشنبہ ہے چل تو بھی مصحفی
جاتی ہیں کربلا کو حسینوں کی ڈولیاں

255

اس نے لٹیں جو جعد معنبر کی کھولیاں — خدمت کو ناگنیں بھی کئی ساتھ ہولیاں
شاید کہ شہرِ عشق کی بگڑی ہے پھر ہوا — ہر کوچہ دیکھتا ہوں مریضوں کی ڈولیاں
مقتل سے چلتے چلتے یہ کیسا ستم ہوا — خوباں نے موجِ خوں میں سنجافیں ڈبولیاں

دل ٹکڑے ٹکڑے ہو کے جو آیا ہے حلق پر — آئیں ہیں یاد مجھ کو چُسی کن کی چولیاں
ہم کو گل شگفتہ ہی کافی ہے اے نسیم! — گلچیں گلوں سے گو کہ بھریں اپنی جھولیاں
ہے کس کو خوب یاد نگمود کا نہان — شکلیں پڑی ہیں کچھ تو نظر بھولی بھولیاں
تجھ بن چمن مجھے نظر آتا ہے حرب گاہ — غنچوں کی ساری رات چٹکتی ہیں گولیاں
خوباں کا کوچہ ٹولا چڑی مار کا ہے کیا — سنتے ہیں بھانت بھانت کی دن رات بولیاں

ان سے کسی کا دل نہ لگے ہائے مصحفی
چھوڑیں ہیں پیچھا جان ہی لے کر یہ لولیاں[1]

256

کبھی بہار کبھی ہے خزاں زمانے میں — ہمیشہ کون رہا ہے جواں زمانے میں
ہُما کی ہمتِ عالی کا میں تو بندہ ہوں — رکھا نہ جس نے کہیں آشیاں زمانے میں
گدا و شاہ کو دار الامان قبر سِوا — مِلا نہ چین کا کوئی مکاں زمانے میں
چھپا سکا نہ رخِ مہر و مہ کو صانعِ چرخ — رہے ہے حسن بھی کوئی نہاں زمانے میں
رکھے ہے دوست ہر اک حکم قلب روکش کا — میں کر چکا ہوں بہت امتحاں زمانے میں
متاعِ دل کو کوئی مفت بھی نہیں لیتا — سبک ہوئی ہے یہ جنسِ گراں زمانے میں
تجھے تلاشِ وفا ہو تو اب بھی ملتی ہے — یہ چیز کچھ نہیں عنقا میاں زمانے میں
گِلا تو یہ ہے فلک سے کہ ہائے وہ نہ رہے — ہمارے دوست جو تھے مہرباں زمانے میں

یہ مصحفی ہے نصیبوں کی کھوٹ، شکوہ نہ کر
کوئی نہیں جو ترا قدرداں زمانے میں

257

دست تجرید میں مجنوں سے فزوں کوش ہوں میں — خانہ بردوش ہے وہ، خانہ فراموش ہوں میں

1۔ لولی: رقاصہ

کچھ تو ملتا ہے مزہ سا شبِ تنہائی میں — پر یہ معلوم نہیں کس سے ہم آغوش ہوں میں
خُم کی خیرات بھی دیتا نہیں مجھ کو ساقی — آرزو مند بیک جرعۂ سرجوش ہوں میں
مستیِ چشم نے یہ کس کی چھکایا مجھ کو — آج رستے میں پڑا دیر سے مدہوش ہوں میں
نہیں بلبل کہ رخِ گل پہ کروں شور و فغاں — شعلۂ شمع کا پروانۂ خاموش ہوں میں
جب سے آویزے پہننے تو لگا ہے اے شوخ — مشتری کو یہ تمنا ہے دُرِ گوش ہوں میں
عیب بینوں سے تو ہے منھ کا چھپانا ہی بھلا — اے اجل تیری مدد ہووے تو روپوش ہوں میں
شکوہ رہ جائے گا، اے تیغ تغافل! تجھ سے — بارِ ہستی سے کسی دن تو سبک دوش ہوں میں

نشہ میرا وہ نہیں ہے کہ سرور اس کا مٹے
مصحفی میکدۂ عشق کا مے نوش ہوں میں

258

الماس سے بھرے ہوئے اُس گل کے کان ہیں — یا یہ وہ باغِ حسن میں ہیرے کی کان ہیں
یا یہ کہ دونوں ہاتھ میں کف الخضیب[1] کے — پرویں کے خوشہ چیں بصد عز و شان ہیں
یا یہ کہ ہیں وہ تاجِ مکلّل[2] بہ گوہراں — ہر فرق ہر عذار کہ سلطاں نشان ہیں
یا ہیں گلوں پہ اوس کے قطرے پڑے ہوئے — خورشید رخ سے لیک بہ حفظ و امان ہیں
میزاں میں آکے یا یہ ستارے ہوئے ہیں جمع — اور ماہ و مشتری سے بہم ہم قِران ہیں
یا موتیا کھلا ہے یہ گلزارِ حسن میں — یا کثرتِ نجوم سے خود آسمان ہیں

فرمائشِ وزیر کو فی الفور مصحفی
لاویں وہی بجا جو مرصّع زبان ہیں

259

دل جا کے رہا سایۂ مژگاں میں تو کے دن — آرام کیا ہے سایۂ مژگاں میں تو کے دن

1۔ کف الخضیب: اصل میں اس کے نیچے لکھا ہے "ستارہ"۔ لغت میں اس کے معنی دیے ہیں دستِ حنا بستہ

2۔ مکلّل: موتیوں جڑا

کس طرح سے رہ جائے نہ حسرت کہ صبا نے شانہ جو کیا زلفِ پریشاں میں تو کے دن
کوتاہیِ طالع پہ بھلا قیس نہ رو دے لیلیٰ رہی نشستہ دبستاں میں تو کے دن
کیا موسمِ گل آہ وہی ہو گیا آخر نالے کیے بلبل نے گلستاں میں تو کے دن
کم فرصتیِ عالمِ امکاں پہ نظر کر سَو سال جیے آن کے دوراں میں تو کے دن
وحشت بھی تو مجنوں کو ذرا راس نہ آئی آوارہ پھرا کوہ و بیاباں میں تو کے دن
برباد گیا مصحفی وہ تخت ہی آخر
اک چین رہا ملکِ سلیماں میں تو کے دن

260

سَو بلا عشق کے آغاز میں ہیں اس پہ بھی ہم اسی انداز میں ہیں
زلف بدنام ہوئی ہے ناحق دل گرفتار ترے ناز میں ہیں
بزم میں کون یہ گل رُو آیا رنگ خوباں کے جو پرواز میں ہیں
کھنچ چکی گو کہ شبیہ اس کی ولے سو دقیقے ابھی پرواز میں ہیں
کب وہ حصے میں وہ ہمارے آویں ناز جو اس بت طنّاز میں ہیں
اس ادا پر جو موے جی ان کے تیری ہی نرگسِ غمّاز میں ہیں
وصل اس مہ سے نہ ہوگا کہ ابھی حسن بیں طالعِ ناساز میں ہیں
اس کی مژگاں کو ہے کب خواہشِ صید آپ ہم چنگلِ شہباز میں ہیں
مصحفی تجھ سا مغنّی ہے کہاں
لاکھ شعبے[1] تری آواز میں ہیں

261

آنکھیں نہ کیوں کہ گوشۂ داماں سے دور ہوں دستِ خیال جب کہ گریباں سے دور ہوں
مجروحِ تیغِ ناز ہوئے پر یہ حیف ہے اس وقت اس کی سوزنِ مژگاں سے دور ہوں

1۔ شعبے: آواز کا نشیب و فراز (انیس: شعبے صدا میں پنکھڑیاں جیسے پھول میں)

قاتل نے بعد قتل بھی آنکھیں نہ بند کیں
ہم لوگ تا نہ حسرت و حرماں سے دور ہوں

چاہے ہے ضعفِ پا نہ چلیں قافلے کے ساتھ
تلوے ہمارے خارِ مغیلاں سے دور ہوں

ہے دور باش ساز کی قدغن کہ اس گھڑی
امیدوار سب درِ سلطاں سے دور ہوں

مستی نے اس کی اب یہ قنات آ کے روک دی
الیاس و خضر چشمۂ حیواں سے دور ہوں

گرمی میں تیرے چہرے سے ہے ریزشِ عرق
ڈر ہے نہ خالِ مشک زنخداں سے دور ہوں

پڑ جائے میرے زخم کی خواہش پہ گر نظر
خوباں کی چلبلیاں نہ نمکداں سے دور ہوں

موے کمر جو لیوے مرا درد دکھ بٹا
یہ پیچ تاب میری رگِ جاں سے دور ہوں

مجنوں سے لیلیٰ کہتی ہے، کرلوں میں کچھ تو بات
لڑکے ابھی ذرا جو دبستاں سے دور ہوں

افسوس کی ہے جا تو کرے اپنا واں بناؤ
ہم فصلِ گل میں ایسے گلستاں سے دور ہوں

کچھ غم نہیں کہ اس کا تصور تو پاس ہے
گو ہم شبِ فراق میں جاناں سے دور ہوں

ہاں کوئی قدر داں نہیں افسوس! مصحفی
ہم اس زباں پہ اہلِ صفاہاں سے دور ہوں

262

اس تیغ سے سب بچ گئے خوں میں نہایا ایک میں
کیا عاشقوں میں اس کے تھا مجرم خدایا ایک میں

خوش چشمی اس کی دیکھ کر مجنوں نے دل کو خوش کیا
آہو کسی صحرا سے جا کر گھیر لایا ایک میں

سو داغ ہیں دل میں مرے، لیکن بحکمِ ضبطِ غم
ہرگز کسی کو بھی نہیں ان سے دکھایا ایک میں

کوچے سے تیرے ہو خجل کس طرح میں جاتا بروں
پکڑا ز میں نے دوسرا گر پانو اٹھایا ایک میں

سوز و گداز غم میں ہیں سب چاہنے والے ترے
مانندِ شمعِ انجمن کیا سر جلایا ایک میں

سو زخم ہیں تن پر مرے کیا فائدہ اس سے ہوا
گر سوزنِ تدبیر سے مر بچ سلایا ایک میں

گو قطرۂ خوں تن میں نہیں لیکن یقیں یہ جانیو
رونے پہ جس دم آ گیا دریا بہایا ایک میں

لیلیٰ کو غمگیں دیکھ کر دایہ نے یہ اس سے کہا
کاغذ کا تیرے واسطے مجنوں بنایا ایک میں

تڑپیں تھے جو شب بزم میں پروانے بر گردِ لگن ان میں سے جیتا صبحدم ہرگز نہ پایا ایک میں
کہتا تھا مشاطہ سے وہ زینت سے میری درگزر سو خونِ ناحق ہوئیں گے گر پان کھایا ایک میں
مجلس تھی بزمِ بسملاں شب اس بتِ سفاک کی کیا دل کی تڑپوں کو دکھا واں رنگ لایا ایک میں
ہر اک کو کوئی عشق میں ہوتا ہے ایسا حوصلہ ہم ظرف تھا میرا ہی جو رسوا کہایا ایک میں
عیسیٰ کے تھا دیکھا اسے، ہے مجھ میں اس میں فرق یہ اس نے تو مارے سیکڑوں، مردہ جلایا ایک میں

رنگینیِ عشقِ بتاں آخر کھلی اے مصحفی
سو باندھنو[1] مجھ پر بندھے آنسو گرایا ایک میں

263

کیوں تڑپتے ترے بسمل ہیں یہ مر جائیں کہیں سر دمِ تیغ تلے رکھ کے گزر جائیں کہیں
ہم بھی دل شاد ہوں اور یار کے گھر جائیں کہیں دن جدائی کے کسی طرح گزر جائیں کہیں
زیرِ دیوارِ چمن ذبح مجھے کر صیاد شاید اڑتے ہوئے یاں سے مرے پر جائیں کہیں
یہ بھی آبِ دمِ شمشیر کا بوسہ لے گی ساغرِ عمر عزیزوں کے تو بھر جائیں کہیں
اک جھلک اپنی دکھا دے، مہ و خورشید صنم پھر میں ضامن ہوں ترے در سے یہ گر جائیں کہیں
آخرِ شب ہے عزیزوں کو اگر رخصت ہو ہم بھی اس بزم میں جوں شمع اگر جائیں کہیں
بال زلفوں کے پریشان نہ کر، مان کہا جی عزیزوں کے، مری جاں، نہ بکھر جائیں کہیں
وہ ملے یا نہ ملے مجھ سے، نہیں اس کا گلہ طور بگڑے ہوئے پر اس کے سنور جائیں کہیں

مصحفی، بھیجیو قاصد کو شتابی کیا ہے
دن ہیں برسات کے نالے تو اتر جائیں کہیں

264

ہم گرفتارِ بلا جی سے گزر جائیں کہیں اس سے بہتر ہے ترے غم میں جو مر[2] جائیں کہیں

1۔ باندھنو بندھنا: الزام لگنا 2۔ اصل : گزر

یوں تو مقتل سے شہیدوں کے خراماں نہ گزر
پاٹ دامن کے نہ خوں سے ترے بھر جائیں کہیں

خوے نازک کا تری ہم کو ہے اندیشہ بہت
نہیں مقدور ہے بے خوف و خطر جائیں کہیں

کیوں کہ دیکھوں میں رقیبوں کی یہ سرسبزی آہ
گُل کہیں ہدیہ ہوں شب کو تو ثمر جائیں کہیں

لگ چلا ان سے جو باتوں میں تو بولے وہ بہ طیش
سر پھراویں نہ مرا آپ بھی گھر جائیں کہیں

کیوں دلاتے ہیں مجھے یادِ کفِ پا اس کی
سامنے سے مرے یہ شمس و قمر جائیں کہیں

ہر جگہ تیرگیِ بخت ہے ہمراہ ان کے
غرب تک شرق سے لے اہلِ ہنر جائیں کہیں

آڑے ہاتھوں میں انھیں دیکھ تو کیا لیتا ہوں
دل تو اک دن وہ مرا لے کر مکر جائیں کہیں

رہ اجل اس کی دمِ تیغ کے کھالوں کئی زخم
گھونٹ کڑوے یہ گلے سے تو اتر جائیں کہیں

مل رہے گا دلِ گم گشتۂ عاشق کا[1] پتا
قاصدِ اشک تو لینے کو خبر جائیں کہیں

ہو کے مایوس پھر آویں بدی قسمت دیکھ
مصحفی ہم جو بہ امیدِ نظر جائیں کہیں

265

بہت سا ابتداے عشق میں غم کو چھپایا میں
گئی جب ضبط کی طاقت تو کچھ کچھ منھ پہ لایا میں

چمن میں دیکھیو پھر اس کو بھی کیا کیا جلایا میں
جو داغِ سینہ اپنا جا کے لالے کو دکھایا میں

نہ ہو مغرور اتنا زندگی پر سوچ اے غافل
قضا کا وقت ٹلتا ہی نہیں، کہتا ہے آیا میں

نسیمِ صبح بن ہرگز وہ مجھ سے وا نہیں ہوتا
چمن میں چٹکیاں لے لے کے غنچے کو ہنسایا میں

وونہی آئی قضا بس پھر گئی اک آن میں میری
تلے شمشیرِ قاتل کے جو ٹک سر بھی ہلایا میں

کبھی نالہ، کبھی زاری، کبھی ہا اور کبھی ہُو ہے
ہوا تھا خلق کیا یہ درد دکھ سہنے خدایا میں

نہ مژگاں سے کبھی مژگاں ملے اس شوخ کے ہرگز
جسے افسانہ اپنے دردِ ہجراں کا سنایا میں

وہاں صحبت رچی مہندی سے جب اس آفتِ جاں کی
تو یاں دیوانہ بن کر اور ہی کچھ رنگ لایا میں

1۔ اصل: کو

کہے ہے مصحفی یوں کلکِ صنعِ صانعِ عالم
مرقّع آسماں کا دیکھ تو کیسا بنایا میں

266

آتے ہی قفس میں جو یہ گھر بھول گئے ہیں — پروازِ چمن کو مرے پر بھول گئے ہیں
ایذائے قفس کو مرے پر بھول گئے ہیں — کیا باغ میں صیّاد کے ڈر بھول گئے ہیں
خط بھیج کے جو پاس نہیں اپنے بلاتے — یارانِ عدم ہم کو مگر بھول گئے ہیں
کیا لطفِ چراغانِ کو اب ہو کہ صنّاع — ترپولیے[1] میں چرخ کے در بھول گئے ہیں
دیکھے ہیں جو اس گل کے کبھی عارضِ تاباں — بس اپنے تئیں شمس و قمر بھول گئے ہیں
نیند آئے گی کس طرح ہمیں کنجِ لحد میں — آرام یہاں بالشِ سر بھول گئے ہیں
اس شوخ کا کوچہ ہے مگر بھول بھلیّاں — آتے ہی جو یاں اہلِ نظر بھول گئے ہیں
مکھڑے پہ بھٹکتے ہیں ترے موے پریشاں — مسکیں رہِ باریک کمر بھول گئے ہیں
نظروں سے گرا کس کی ہوں میں جو مرے نالے — کرنا دلِ خارا میں اثر بھول گئے ہیں

جس وقت کہ دیکھا ہے کھلا یار کا سینہ
اے مصحفی ہم لطف سحر بھول گئے ہیں

267

تیغِ زباں کو اپنی اگر میں علم کروں — دو باتوں میں دونہی سرِ اعدا قلم کروں
گر بھول کر کے اس پہ مری جا پڑے نگاہ — ادنیٰ سفالِ بنگ کے تئیں جامِ جم کروں
تیغ اس کی جو کمر پہ بندھی ہے کہے ہے یہ — چاہوں جسے روانۂ ملکِ عدم کروں
واں سے تو ایک خط کا بھی آیا نہیں جواب — مکتوب شوق اس کو کہاں تک رقم کروں
نفرت ہو مجھ سے جن کی طبیعت کو بیشتر — مجھ کو بھی چاہیے کہ یہ ربط ان سے کم کروں

1۔ ترپولیہ: تین دروں کی عمارت

تابِ نگہ سے گرم نہیں ہوتی یہ کماں	کس طرح دور میں تری ابرو کا خم کروں
لے جاؤں بہرِ نذرِ اسیراں بنا کے گل	اب کے جگر کے ٹکڑے جو اپنے مبہم کروں
تصویر کا بھی اس کی تو ملتا نہیں دماغ	گو پڑھ کر اس پہ سورۂ اخلاص دم کروں
کچھ میں فسانہ گو ہوں نہ نقالِ مصحفی
کس کس کا ذکرِ شوکتِ جاہ و حشم کروں

268

مجھ پر تو ملتفت ہی نہیں یار کیا کروں	تدبیر تیری، اے دلِ بیمار، کیا کروں
جب جا چکی ہو باغ سے کوسوں بہارِ گل	اُڑ کر قفس سے پھر میں گرفتار کیا کروں
کاسہ ہو سر کا جب کہ مرے مغز پر گراں	میں اور اس پہ باندھ کے دستار کیا کروں
آخر پھڑک پھڑک کے قفس میں مُوا میں آہ	نکلی نہ دل سے حسرتِ گلزار کیا کروں
مارِ سیاہ بن کے مجھے کاٹنے لگا	اب اس پری کا سایۂ دیوار کیا کروں
صبحِ مراد منھ کو چھپا کر رہی ہے بیٹھ	پوچھوں ہوں تجھ سے، کہہ میں شبِ تار کیا کروں
گر ہو سکے نہ مجھ سے جدائی میں تیری صبر	تُو ہی بتا کہ پھر میں، ستم گار! کیا کروں
مرنا پڑا ہے مجھ کو بھی کس کس کے رشک سے	لاکھوں ہیں اس کے طالبِ دیدار کیا کروں
انکارِ کفرِ عشق حمیّت سے دور ہے	اب تو گلے پڑا مرے زنّار کیا کروں
جنسِ نفیس تھا دلِ صد پارہ مصحفی
سمجھے ہے ناقص اس کو خریدار کیا کروں

269

ہو گیا ہے نقش خوں سے تیشۂ فرہاد میں	حسرتیں کیا کیا رہیں میرے دلِ ناشاد میں
جوشِ خوں نے اپنے فرصت فصد لینے کی نہ دی	مر گئی آخر تڑپ کر حسرتِ فصّاد میں
نالۂ زنجیرِ مجنوں یک طرف محمل کی گرد	خاک صحرائے جنوں آنے لگی فریاد میں

زیرِ خنجر آ گئے لاکھوں گرفتار قفس مشق خوں ریزی کے جوہر تھے دلِ صیاد میں
دیکھ مستی کی دھڑی اس کی زبس نالے کیے پڑ گئے چھالے زبانِ سوسنِ آزاد میں
آسماں ہے گردباد اور اس کے ہم ہیں خار و خس خاک پھر آرام ہو اس قصرِ بے بنیاد میں
دیکھیے مقتل میں ہم کو کس گھڑی لاوے قضا آبداری ہی نہ تھی جب خنجرِ جلاد میں
پردۂ گوشِ فلک شق ہو گیا سن کر ہمیں کوٹ کوٹ اتنا اثر بھرنا نہ تھا فریاد میں
ایک ہم بولیں تو قہر آتا ہے ورنہ مصحفی
سیکڑوں ہوتی ہیں باتیں عالمِ ایجاد میں

270

بن چھیڑے واں ہے رخ پر توفیرِ[1] اشک جاناں رسوائی ہے جو کیجے تقریرِ اشک جاناں
موتی صدف سے ایسے کب آبدار نکلے کرنی روا ہے ہم کو توقیرِ اشک جاناں
واں آنکھیں ڈبڈبائیں، یاں جانیں لب پہ آئیں یہ ہم نے زور دیکھی تاثیرِ اشک جاناں
شبنم کے قطرے گل پر بلبل کا دل نہ کھینچیں ہاتھ آئی ہے اُنھوں کے تسخیرِ اشک جاناں
دریا جب چڑھے ہے ساحل سے کب رکے ہے عاشق سے خاک ہووے تدبیرِ اشک جاناں
میں نام لوں سفر کا کیونکر کہ پانو میں ہے عشقِ گریز پا کے زنجیرِ اشک جاناں
اک اور بھی غزل کی ہے فکر مصحفی کو
کرتا ہے پھر زیادہ تعمیرِ اشک جاناں

271

عارض کا گل کدہ ہے جاگیرِ اشک جاناں اس پر رواں نہ کیوں ہو تحریرِ اشک جاناں
مجرم کو عاشقی کے قاضی سے کام کیا ہے کافی ہے اس کے حق میں تعذیرِ اشک جاناں
شام و سحر کرے ہے ناحق یہ مشقِ گریہ شبنم سے کھنچ سکے ہے تصویرِ اشک جاناں

1۔ توفیر : فراوانی

قبضے میں لال ڈورے کیا رکھ سکیں کہ ناحق
اگلی پڑے ہے ہر دم شمشیرِ اشک جاناں

جلتوں پہ ایک قطرہ پانی کا جو نہ چھڑکا
کیا کچھ انھوں نے کی ہے تقصیرِ اشک جاناں

ہم بوسہ بازیوں سے کب چوکتے ہیں، ہم نے
دیکھی بہت ہیں ایسی تدویرِ اشک جاناں

عاشق نہ پیار سے کیوں آنکھوں کو اس کی پونچھے
لازم ہے دوستی میں توقیرِ اشک جاناں

اخگر فشانیاں تھیں بستر پہ رات میرے
دیکھی یہ وصل کی شب تاثیرِ اشک جاناں

سینے پہ تو بناتا اک موتیا کا مالا
نقاش کھینچتا یوں تصویرِ اشک جاناں

غربال کر دکھایا تربت پہ میرا سینہ
دل کے ہدف میں آیا جو تیرِ اشک جاناں

گریے کا کچھ سبب ہو تو مصحفی بتاؤں
ناحق ہے میرا قاتل شمشیرِ اشک جاناں

272

مِسّی سے ہو گیا ہے بلائے سیہ دہن
مر جاوے وونہی جس کو دکھاوے وہ مہ دہن

اُڑ جائے ہوشِ زہرہ وہیں اس ادا کو دیکھ
خمیازہ کرتے کھولے جو وہ رشکِ مہ دہن

سن سن کے اس گلی میں ملامت گروں کے حرف
تا چند بند رکھے یہ ترا بے گنہ دہن

اتنا وہ گم ہوا ہے کہ نقاشِ صنع کی
چہرے میں تیرے پا نہیں سکتی نگہ دہن

بانکے سے میرے برسرِ رہ بات کر سکے
رکھتا ہے کب ہنر صنمِ کج کُلہ دہن

زلفِ سیہ کو بس کہ نہیں ایک جا قرار
چومے ہے گہ ذقن تری یہ مار گہ دہن

مسّی کی تو دھڑی نہ دکھا اس کو رحم کر
سوسن ہے اس چمن میں بحالِ تبہ دہن

الفت میں ضبطِ رازِ محبت ضرور ہے ق
جو کچھ کہ گزرے مجھ پہ کسی سے نہ کہہ دہن

گویا ہے رنگِ چہرہ اگر اس کا غم نہیں
تو تو خدا کے واسطے خاموش رہ دہن

رنگیں بساطِ حسن پہ حورِ بہشت کا
کیا دور ہے جو رخ سے ترے گاوے وہ دہن

باتوں میں وا ہوئی جو زباں اس کی مصحفی
کر دے گا داستان کو غنچے کی یہ دہن

273

نہ مصاحبت مری گرم ہے نہ میں شہ کا یار و ندیم ہوں
یہی مرتبہ مجھے ہے بہت کہ فدائی اس کا قدیم ہوں

جو گرد ہیں شفقتِ خاص کے تری وہ ہی جی میں مگن رہیں
مجھے ہے اس کی بڑی خوشی کی رہینِ لطف عمیم[1] ہوں

مجھے کیا جحیم جلائے گا مرے سامنے بھی نہ آئے گا
کہ طفیلِ نالۂ آتشیں تپِ دل سے خود میں جحیم ہوں

کبھی اس کے پھولوں کے بوسے لوں کبھی ہر شجر کے گلے لگوں
یہی آرزو ہے مری صنم ترے باغ کی میں نسیم ہوں

شبِ تیرہ مجھ کو نظر پڑی وہ تجلی اس میں کہ کیا کہوں
مرا طور ہے مرا داغِ دل اسی طور کا میں کلیم ہوں

مری کوچکی کو تو دیکھیے کہ ہوں مورچے سے بھی بلکہ نیم
جو بزرگی پر تو نظر کرے تو میں عکسِ عرشِ عظیم ہوں

ترے دانت گو کہ ہیں گوہری ترے ہونٹ گو کہ ہیں لعلِ تر
مجھے قدر لعل و گہر کی کیا نہ میں جوہری نہ مقیم[2] ہوں

تیرے عشقِ جعد میں جائے ہے وہ اٹھائے سر کو چمن سے پھر
میں اسی سراغ میں کب سے تھا کہ قضائے موجِ شمیم ہوں

میں چڑھوں ہوں قاتلِ دہر کے جو ہر ایک لحظہ منھ ان دنوں
یہی ڈر رہے ہے کہ مصحفی نہ بہ تیغ غمزہ دو نیم ہوں

274

خواہشِ روے رنکو دل سے تو جانے کی نہیں تا اجل نقشۂ ہستی کو مٹانے کی نہیں

1۔ عمیم : عام 2۔ مقیم : دلال، بیوپاری

وعدۂ وصل وہ محشر پہ کرے گا کہ کبھی صبحِ محشر میں منھ اپنا وہ دکھانے کی نہیں
لوگ سب روتے ہی لاشوں پہ ترے کشتوں کی کیوں کہ کہیے کہ یہ جا اشک بہانے کی نہیں
اس کے بالوں کا اگر ہو گیا ٹک وا جوڑا نام کو پھر شبِ یلدا نظر آنے کی نہیں
اے خوشا حال انھوں کا جو تصور میں ہیں غرق کچھ خبر ایسے ہی لوگوں کو زمانے کی نہیں
اس کی چتون کی شرارت سے عیاں ہوتا ہے تیری تصویر مجھے پاس بلانے کی نہیں
خفتہ بختانِ چمن حشر کے قابل کب ہیں صور بھی ان کو پس از مرگ جگانے کی نہیں
یوں ہی گر خوں رگِ مجنوں سے رواں ہووے گا لیلیٰ پھر بارِ دگر فصد کھلانے کی نہیں
سخت جانی کا اثر اس میں اگر باقی ہے موجِ دریا مرے لاشے کو بہانے کی نہیں
ناصحو! فصل جنوں میں نہ مجھے ایذا دو مثلِ گل رُت یہ گریبان سلانے کی نہیں

مصحفی سینۂ پُر داغ چمن ہے اپنا
دلِ شیدا کو ہوس باغ میں جانے کی نہیں

275

صفائے سینہ صفائے گلو سے بھی افزوں بہارِ سیبِ ذقن رنگِ رو سے بھی افزوں
سمجھ کے بولیو اس سے کہ خوئے عاشقِ زار ہے نازکی میں صنم تیری خو سے بھی افزوں
ملاپ چاہے ہے دل گھر میں یار کے ہووے قدم رکھے ہے جدا آرزو سے بھی افزوں
الائچی کی جو تیرے دہن سے آتی ہے بو قسم خدا کی وہ ہے گل کی بو سے بھی افزوں
کہیں جو مُو اسے شاعر، یہ نقص ہے ان کا ہے نازکی میں کمر اس کی مُو سے بھی افزوں
ہوا نہ شستہ جب اس گل کے دل کا ان سے غبار بلا سے آنکھیں ہوئیں آب جو سے بھی افزوں

لگاوٹوں میں نہ تو اس کی مصحفی آنا
کہ ہے وہ طفلِ مفتّن عدو سے بھی افزوں

276

قابل علاج کے مرا دردِ نہاں نہیں عیسیٰ کو میری زیست کا مطلق گماں نہیں

خوباں کی کارگاہ کی جا کر میں سیر کی　اس کے کمر نہیں ہے تو اس کے دہاں نہیں
نکلا ہے جب سے اُس رخِ رنگیں پہ خطِ سبز　کہتا ہے خضر دیکھ یہ وہ گلستاں نہیں
اے برق! تو ہی کہہ میں تری نذر کیا کروں　لائق یہ تیرے خار و خسِ آشیاں نہیں
مہلت پہ چند روز کی، ناداں نہ کر گھمنڈ　ہفتہ سوا بہارِ گل و گلستاں نہیں
اس بال سی کمر کی نزاکت پہ یہ غرور　تو مومیاں ہے اور کوئی مومیاں نہیں
فوجِ شبِ فراق کو دیتا رہا شکست　نالہ مرا کم از علمِ کاویاں[1] نہیں
لیلٰی نے کیا فریب دیا آج قیس کو　ناقہ سبک چلے ہے وہ محمل گراں نہیں
ہے پھوٹ بد بلا ترے غمزے کے تیر کی　شکر خدا کہ ہاتھ میں اس کے نشاں نہیں
رزقِ ہمائے غم وہ ہوئے ہیں جوان دنوں　ڈھونڈے کوئی تو تن میں مرے استخواں نہیں

جنسِ سخن کا آج میں دیکھا جو مصحفی
مہدی[2] سوا تو اَور کوئی قدرداں نہیں

277

پھر رُت آئی ہولی کی ہر کوچہ دفیں رنگین بجیں
پیر و جواں سب مست ہوئے مزماریں[3] ان کی قرین بجیں
ہم نے اس کی عشرت کا عیش دوبالا نام رکھا
جب دو دو گائک جٹ بیٹھے اور وہ دو دو بین بجیں
مطرب نے کیا پردہ بجایا اور لوگوں نے ساکا[4] گایا
ہڈیاں جس سے لڑلڑ کر مُردوں کی بہ زیرِ زمین بجیں
ہجر کی شب تھی روز قیامت بھول گیا گھڑیالی بھی
چار پہر کی گھڑیاں تو عاشق کے پئے تسکین بجیں

1۔ علمِ کاویاں: پرچمِ فریدوں　2۔مہدی: مہدی علی خاں　3۔ مزمار: بانسری
4۔ ساکا: ہندو سورماؤں کی کہانیاں، نظموں اور گیتوں کی شکل میں

وعدہ کر کے یار نہ آیا بام پہ بہرِ جلبِ کمند
فائدہ کیا، چل گھر کو دلا، اب تین پہر پر تین بجیں
عاقل کب دنیا کی خاطر اتنی کوشش کرتے ہیں
تلواریں یارانِ نبی کی بہرِ عزاے دین بجیں
نقشِ قالیں کی تصویریں زندہ ہوئیں سن قُم کی صدا
پائلیں اس رقاصہ کی جس دم کہ سرِ قالین بجیں
یوں تو بڑا صاحب ہر اک ہے جو لندن سے آتا ہے
نوبتیں گھر گھر شادی کی پر آیا تب ہستین[1] بجیں
جس کے سرھانے تو آکر بیٹھا شادیِ مرگ ہوا وہ مریض
تارِ نفس کی منجنیکیں[2] خوب اس کے دم یٰسین بجیں
مصحفی صوتِ سرودی سے میرا تو گیا شب دم ہی نکل
اس کے سازِ طلاقت سے بیتیں جو کئی رنگین بجیں

278

بزمِ سرودِ خوباں میں گو مردنگیں شاہین بجیں
ساتھ فقیر کی ڈھولک کے پر ڈھم ڈھمیاں رنگین بجیں
نالہ کشی سے رات جو گلشن رشکِ بزمِ عشرت تھا
منقاریں مرغانِ چمن کی صبح تلک جوں بین بجیں
تجھ سے نہ کہتا تھا میں زاہد میخانے کی راہ نہ چل
آخر تجھ پر رستے ہی میں تالیاں او بے دین! بجیں
میں جو نشے میں رات ہو فلٹپٹ اس معشوق کی چھاتی ساتھ
پازیبیں پانو کی اس کے کیا ہی بصد تمکین بجیں
شمع رہی شب جب تک جلتی مجھ کو نہ آئی نیند ذرا
جھانجھیں پروانے کے پروں کی بس کہ سرِ بالین بجیں
بل بے مزاجِ نازک تیرا نیند اُچٹ گئی اس گل کی
بالیاں پتّوں سے جو الجھ کر رات سرِ بالین بجیں
وعدہ کر کے جب وہ نہ آیا سیرِ چمن کو دل نے کہا
رات گئی چل باغ سے اب گھڑیاں تو کئی غمگین بجیں

1۔ ہستین: ہسنگز؟ 2۔ منجنیکیں: غالباً منجنیق مراد ہے (وہ مشین جو گولے برسا کر قلعے کی دیوار میں شگاف ڈال دیتی تھی

جی کا کڑھانا میرے تھا منظور مگر گھڑیالوں کی
وصل کی شب جو تا بہ سحر گھڑیالیں بے آئین بجیں

ڈیڑھ پہر ٹھہروں گا یہ کہہ کہ یار مرے گھر آیا تھا
پر گھبرا کے جانے کو (اٹھا) جونہی پہر پر تین بجیں

بانگِ حمیر[1] سے کم وہ نہ سمجھا بس کہ نفیس مزاج تھا یار
ناقوسیں بت خانوں میں ہر چند بصد تزئین بجیں

آئے بختری ہو کے ملائک مر جو گیا عاشق تیرا
نوبتیں کیا کیا شادی کی مرقد میں دمِ تلقین بجیں

وصل کی شب آخر ہونے کا مصحفی دھڑکا کیا میں کہوں
جی ہی گیا بس تن سے نکل جب تین پہر پر تین بجیں

279

رنگِ رخ چمکا ہے پھر یار کا مے نوشی میں
ان دنوں خرقۂ خورشید ہے روپوشی میں

کیوں نہ سمجھوں میں شبِ ہجر کو بھی وصل کی شب
لطفِ معشوق ہے زانو کی ہم آغوشی میں

شانۂ زلف نے بوسے ترے عارض کے لیے
ایک ہم تھے کہ موئے حسرتِ سرگوشی میں

ہم صفیرانِ چمن کی انھیں حاجت کیا ہے
زمزمے کرتے ہیں جو پردۂ خاموشی میں

برخلاف اتنا بھی رہتا ہے کسی سے کوئی
مر گئے ہم تو تری وعدہ فراموشی میں

تھا تو طفلی ہی میں از بس کہ مئے حسن سے مست
بات بہکی تھی تری عالمِ بے ہوشی میں

مصحفی مجھ کو ادا ساقی کی بھائی یہ رات
جام چھلکا جو دیا ہاتھ سے مدہوشی میں

280

گوش بن جاتے ہیں مجلس میں دہن جتنے ہیں
جی سے سنتے ہیں مجھے اہلِ سخن جتنے ہیں

تیرے کشتے کے سزاوار کوئی تو ہوگا
ٹک منگا کر تو انھیں دیکھ کفن جتنے ہیں

آہوے چشم ترا سب کے ہے منظورِ نظر
گھات میں اس کی ہیں یاں صید فگن جتنے ہیں

تو وہ خوش چشم ہے لیلیٰ کہ ترے قدموں پر
ہیں سری ٹیک[2] میں آہوے ختن جتنے ہیں

1۔ حمیر: حمار (گدھا) کی جمع 2۔ سری ٹیک: سر جھکائے

بزمِ قاتل نہیں کچھ مسلخِ قصّاب سے کم
خوں سے لبریز ہیں یاں طشت ولگن جتنے ہیں

رہتے ہیں منتظرِ ناقۂ لیلیٰ شب و روز
وادیِ نجد میں خوش چشم ہرن جتنے ہیں

شعلۂ شمع کے مانند ہوں میں چرب زباں
میری تسخیر میں ہیں سیم بدن جتنے ہیں

سائباں ان کے مزاروں پر نہ ہوں لازم ہے
تیرے مارے ہوئے اے چرخ کہن جتنے ہیں

جب کہ استاد نے شاگرد کیا میرے تئیں
کان میں پھونک دیے عشق کے فن جتنے ہیں

نغمہ سنجی کا مری شور ہوا ہے جب سے
لال ہیں [1] زمزمہ سنجان چمن جتنے ہیں

اس گلِ تر کے جو رخسار سے اٹھتا ہے نقاب
اپنا منہ دیکھیں ہیں گلہائے چمن جتنے ہیں

وحشت و عشق و جنوں پیشِ نظر رکھتا ہوں
میرے روندے ہوئے ہیں سارے چمن جتنے ہیں

مصحفی حال سے ایک ایک کے ہے مجھ کو خبر
میری نظروں میں ہیں سب عہد شکن جتنے ہیں

281

سخت جاں سوزیِ دشمن ہے گدازِ آہن
سچ ہے نا مرد پر کھلتا نہیں رازِ آہن

تیغ جب صورتِ محراب بنی قاتل کی
سر گزاروں پہ ہوئی فرض نمازِ آہن

میں اسی روز کہ تلوار تو سج کر نکلا
کر چکا تھا دلِ خوں گشتہ نیازِ آہن

چار آئینے سے لے کر زرہ و خود تلک
اوپچی پر مرے تب سجتا ہے سازِ آہن

حلقہ در حلقہ تری زلفِ مسلسل سے صنم
منفعل ہو گئی زنجیرِ درازِ آہن

مصحفی گو کہ کڑی ہے یہ زمیں لیک تو کر
دوسری بار بھی سامانِ گدازِ آہن

282

جز سکندر نہ ہوا آینۂ سازِ آہن
ایسی صورت سے کیا کس نے گدازِ آہن

1۔ لال ہیں : خاموش ہیں

پائے مجنوں کے تئیں میری بناوے زنجیر	سوے حدّاد یہ تھی کب سے نیازِ آہن
اور بھی چمکے تری تیغ کے جوہر قاتل	خونِ بسمل جو ہوا نقش طرازِ آہن
پھر گئی تیغ تری آکے سر عاشق پر	آج معلوم ہوئے معنیِ نازِ آہن
تیغ چلتی ہیں کبھی، تیر کبھی چھوٹتے ہیں	تیرے کوچے میں سدا ہے تگ وتازِ آہن
مصحفی اصل کا کب نقل سے نکلے ہے کام
پنجہ انداز نہ ہو صید پہ بازِ آہن

283

آہستہ رکھ قدم کہ تہِ خاک لوگ ہیں	پھیلائے پانو سوتے ہیں جو پاک لوگ ہیں
لالے کے گل اُگیں ہیں، انھیں کے مزار سے	مدفوں زمیں میں وہ جو جگر چاک لوگ ہیں
سرگوشیوں میں لیتے ہیں بوسے ترے رقیب	کہتا ہوں میں کہ کتنے یہ بیباک لوگ ہیں
زن بازی، خانہ جنگی کا عالم ہے ایک سا	کب چوکتے ہیں اس سے جو چالاک لوگ ہیں
شعلے سے تیرے حسن کی ہر رہ گزر کے بیچ	آتش رسیدہ جوں خس وخاشاک لوگ ہیں
دریاے عاشقی سے گزرنا نہ سہل جان	کرتے ہیں وہ عبور جو پیراک لوگ ہیں
بزمِ نشاط سے ہمیں کیا کام مصحفی
رہتے ہیں عزلتی ہی جو غم ناک لوگ ہیں

284

اک دم گلے سے لگ کر بوس وکنار کرلیں	آئے ہو بعد مدت ہم تم کو پیار کرلیں
جو رفتنی عدم کے رستے کے سر کھڑے ہیں	جاویں و لیک میرا ٹک انتظار کرلیں
منزل یہ نجد کی ہے یارو ٹھہر کے چلنا	یک لحظہ قیس کا ہم طوفِ مزار کرلیں
اے باغبان ظالم! اتنی تو دے تو رخصت	تا پائے گل ٹھہر کر سیرِ بہار کر لیں
ہیں جیسے باز و بحری ہندی بتوں کی آنکھیں	یہ لوگ جس کو چاہیں پل میں شکار کرلیں

میں وصل کی شب ان کو دیتا ہوں کوئی جانے　　آنے کا پھر نہ جب تک قول وقرار کرلیں
اپنی بہار بھی تو دیکھیں کبھی یہ مے کش　　کاش آئینے سے اک دن آنکھیں دوچار کرلیں
ایسی ہے کیا شتابی شہرِ عدم کو یاں سے　　جاویں گے کچھ علاج جانِ فگار کر لیں
آخر تو مصحفی ہم جاویں ہی گے عدم کو
دیدِ جہاں تو اک دم آینہ وار کرلیں

285

اس کا پیچھا چھوڑتا ہے یہ دلِ بسمل کہاں　　ہاتھ سے جاتا ہے اپنے دامنِ قاتل کہاں
میرے رہنے کی جگہ یہ ہستیِ فانی نہ تھی　　پھینک تو مجھ کو گئی، اے ہستیِ باطل کہاں
اس کی بیتابی پہ عرصہ شش جہت کا تنگ ہے　　دست و پا مارے نگاہِ ناز کا بسمل کہاں
ہاتھ میں مجنوں کے اک دم سارباں تو دے مہار　　دیکھ تو خوش خوش لیے جاتا ہے یہ محمل کہاں
ہاے دریاے محبت کا نہ پایا ہم نے گھاٹ　　جس میں پانو کے نشاں ہوں یاں ہے وہ ساحل کہاں
تیغ برکف جس نے دیکھا اس کو جی میں یہ کہا　　اوپچی بن کر چلا ہے آج یہ قاتل کہاں
لامکاں سیری کا دعویٰ آدمِ خاکی کو ہے　　دیکھیو پہنچی ہے رتبے میں یہ مشت گل کہاں
گھات میں مجنوں کی جو وہ وقفہ کرتے آئے تھے　　ہاے اس کم بخت کا سمجھے تھا ناداں دل کہاں
قافلے والے ٹھہرتے آئے یہ کہتے ہوئے　　دیکھیو لیلیٰ کا پیچھے رہ گیا محمل کہاں
رنگ چہرے کا ترے تغئیر ہے اے مصحفی
سچ بتا مجھ کو ہوا تو اِن دنوں مائل کہاں

286

حلت ہے مے کی ماہِ صیامِ خیال میں　　بھرتا ہوں لائے بادہ[1] میں جامِ خیال میں
تھی پیشِ دیدہ کس کی کمر جس کے عکس سے　　بال آگیا ہے چینیِ نامِ خیال میں

1۔ لاے بادہ : دُردِ مے

دن کو ہمارے وصل نہ آیا نظر تو کیا
شب کو تو یاں اسیر تھے دامِ خیال میں

مجرے کا اور سلام کا واں نام ہی نہیں
میں دل کو خوش کروں ہوں سلامِ خیال میں

راتیں وہ خوب گزریں کہ جن میں کسی کے ساتھ
لاکھوں لگاوٹیں تھیں پیامِ خیال میں

سمجھے تھے دور وصل کی منزل کو ہم تو واہ
طے ہو گئی یہ رہ دو سہ گامِ خیال میں

گر ہے شبیہ کش کے قلم کی یہ چال ڈھال
دل سیکڑوں پسیں گے خیالِ خرام میں

خورشید کا طلوع ہوا جب شبِ فراق
بس آگ لگ اٹھی در و بامِ خیال میں

رنگِ سپید و زرد ہی آتا رہا نظر
شب تا بہ صبح بیضۂ خامِ خیال میں

کیسی ہی شب دراز ہو، ہوتی ہے پل میں صبح
آتا ہے کس کو خواب مقامِ خیال میں

بنگ و شراب سے انھیں کیا کام مصحفی
رہتے ہیں وہ جو مست مدام[1] خیال میں

287

نہ یہ طاقت کہ بزم اس کی سے اٹھ کر اپنے گھر جاؤں
نہ مقدور اس قدر مجھ کو کہ ہو قربان مر جاؤں

مجھے یہ گفتگو درباں سے کرنی خوش نہیں آتی
مزہ تب ہے کہ میں اس بزم میں بے دردِ سر جاؤں

کہاں تک روز کا یہ آنا جانا، جی میں آتا ہے
گلا رکھ کر دمِ شمشیر پر اک دن گزر جاؤں

کبھی انجام بھی ہووے گا یارب اس شد[2] آمد کا
کہاں تک کوچۂ دلدار میں شام و سحر جاؤں

چڑھا ہوں بام پر اپنے پئے نظارہ، ڈرتا ہوں
کہیں ایسا نہ ہو جو میں ترے جی سے گزر جاؤں

وہ ہو گر خشمگیں دشمن پہ ترسِ عشق چاہے ہے
کہ میں چیں بر جبیں دیکھوں اسے اور جی میں ڈر جاؤں

الٰہی پہنچے منزل کارواں کا کارواں اپنا
نہیں جی چاہتا میں ساتھیوں سے پیشتر جاؤں

ترحّم ہے ضرور، اے باغباں احوال پر میرے
بھلا اڑ کر کہاں گلشن سے میں بے بال و پر جاؤں

اٹھیں سو مو پریشاں کرنے ماتم حضرتِ دل کا
بہ آہ و اشک جس مجلس میں میں شوریدہ سر جاؤں

نہیں ہوتی تسلی دیکھے بن، یہ جی میں آتا ہے
لکھوں خط اس کو آپھی، آپھی بن کر نامہ بر جاؤں

1۔ مدام : شراب 2۔ شد آمد : یعنی آمد و شد

نہ ہو گر بیٹھنے کا حکم، اس کا غم نہیں صاحب بھلا اتنی تو رخصت دو کہ مجرا آ کے کر جاؤں

نہیں طاقت بدن میں مصحفی دو گام چلنے کی
بغیر از راحلہ[1] میں خستہ پھر کیونکر سفر جاؤں

288

قہر آفت ہوتے ہیں سچ ہے یہ بالا پن کے دن
مر گیا وہ جس نے دیکھا اس کو بل گوندھن[2] کے دن

اس میں وہ خورشید رو جھانکے ہے ہر دم آن کر
اِن دنوں شاید پھرے ہیں دیدۂ روزن کے دن

تیری روزی اہلِ گریہ کے تئیں لازم ہے سچ
راتیں بھادوں کی سیہ ہوتی ہیں اور ساون کے دن

خار و گل دونوں سے ہم عریاں بدن آزاد ہیں
نے گریباں کا سماں، نے رہ گئے دامن کے دن

ایک دو ساعت ٹھہر کر ہوگئی تنہا بہار
ہم نہ پہنچے حیف گل تک خوبیِ گلشن کے دن

طائرانِ سدرہ سے جا کر صبا کہہ دیجیو
ہیں جوانی کے قریب اس طفلِ تیر افگن کے دن

مصحفی عشرہ محرم کا بھی آخر ہو گیا
ہاتھ سے جاتے رہے یکبار کیا شیون کے دن

289

میں ہی جانوں ہوں جو کچھ مجھ سے ادائیں کی ہیں
تیری آنکھوں نے حیائیں سی حیائیں کی ہیں

سرکشی خوب نہیں مجھ سے تو اے زلفِ دراز
میں ترے واسطے راتوں کو دعائیں کی ہیں

دوکھتا[3]، تجھ کو نہیں میں، مرے آگے آویں
بے وفا، تجھ سے میں جیسی کہ وفائیں کی ہیں

جعد کا بال تری ایک سے ہے ایک بلا
جمع کس کے لیے اس نے یہ بلائیں کی ہیں

اتنا مغرور تو آبادیِ دنیا پہ نہ ہو
گردشِ چرخ نے مسمار بنائیں کی ہیں

تیرا بیمار تو لاتا ہی نہیں رو بہ شفا
اس کی عیسیٰ نے بھی اک عمر دوائیں کی ہیں

گوشۂ چشمِ تغافل کے میں صدقے جاؤں
جس نے دزدیدہ نظر میں بھی ادائیں کی ہیں

1۔ راحلہ: سواری کا جانور 2۔ بَل (بال)، گوندھن (گوندھنا): چوٹی بنانا = ایک رسم

2۔ دوکھنا: (دوش: الزام) الزام دینا

بازیٔ چرخِ دغاباز سے ہے ایمن کون سب نے کھائیں ہیں دغا سب سے دغائیں کی ہیں
یار نے سنگ پہ پھینکا ہے اگر شیشۂ مے اس نے مستانہ شکستن میں صدائیں کی ہیں
ایمنی خصم سے کیا اہلِ دول کو ہی نہیں خوابِ شب کی جو مقرر کئی جائیں کی ہیں
مصحفی ہو تری تقصیر بھلا کیونکہ معاف
تو نے کم بخت خطائیں سی خطائیں کی ہیں

290

کسی سے ہم نے جو آنکھیں ملائیاں ہوتیں تو یار دیکھتے پھر کیا لڑائیاں ہوتیں
جو عاشقوں کی امیدیں بر آئیاں ہوتیں مرے گلے میں بھی اس کی کلائیاں ہوتیں
دیا میں اپنی خوشی دل تمھیں، مزہ تب تھا کہ لیتے وقت میں زور آزمائیاں ہوتیں
جو بے سروں کو خدا پھر بھی سر نئے دیتا ترے ہی در پہ صنم جبہہ سائیاں ہوتیں
میں زخمِ دل کا کیا بخیہ آپ سمجھا خوب وگرنہ جگ میں مری جگ ہنسائیاں ہوتیں
مزے[1] کو آنکھ لڑانے کے تب سمجھتا وہ جو آرسی سے بھی آنکھیں لڑائیاں ہوتیں
غرور نرگسِ شہلا کو اپنی چشم کا ہے کسی طرح اسے آنکھیں دکھائیاں ہوتیں
یہ عاشقوں پہ ستم کیا کِیا خداوندا! ذرا تو ہجر کی راتیں گھٹائیاں ہوتیں
کہاں چھپے کوئی کھترانیوں سے ہائے خدا یہ گوری گوری نہ شکلیں بنائیاں ہوتیں
میں کیوں اسیر بلائے جمال کا ہوتا جو پہلے ہی مری آنکھیں سلائیاں[2] ہوتیں
نہ نکلی تیغ ستم اس کی رک گیا قاتل عدم کو ورنہ رواں چارپائیاں ہوتیں
ٹھہرتی صیدِ دلِ مصحفی کی قیمت بھی
نگاہیں اس کی جو خاطر میں لائیاں ہوتیں

291

زباں بریدہ سے اے ہمصفیر، ہم بھی ہیں قفس میں اور ہیں جوں، اک اسیر ہم بھی ہیں

1۔ اصل: مزید 2۔ آنکھیں سلائیاں ہونا: اندھا کیا جانا۔ سلانا بھی پڑھا جاسکتا ہے

وہ بت ہے مائلِ آئینہ کس زباں سے کہیں — نگاہ ناز کے منّت پذیر ہم بھی ہیں
فلک کی خو نہیں ایسوں کی پرورش ورنہ — شکستہ حال و غریب و فقیر ہم بھی ہیں
یہ درمیاں جو مہینوں بگاڑ رہتا ہے — وہی شریر نہیں، کچھ شریر ہم بھی ہیں
لبوں سے اس کے جو دلوا دے تو کوئی بوسہ — امیدوار تو ربِّ قدیر، ہم بھی ہیں
انھوں[1] کے ہاتھ لگے کیا جو پیشِ قاسمِ چرخ — کہیں یہ جا کے بوقتِ اخیر ہم بھی ہیں
نشانے لالہ و گل ہی نہیں نگہ کے تری — جگر پہ کھائے ہوئے زخمِ تیر ہم بھی ہیں

حسد کی جا نہیں اے مصحفی کلام ان کا
کہ اپنے وقت کے مرزا و میر ہم بھی ہیں

292

شبِ ہجراں کہوں کیا مجھ پہ کیا کیا آفتیں پڑیاں — بٹیروں کی طرح دیتا رہا آہوں کو میں بھڑیاں[2]
نہ پائی مخلصی سخت استخوانوں نے ترے، ان پر — ہزاروں جم طمانچے ٹوٹے لاکھوں لگتیاں چھڑیاں
لیا تھا بوسہ زلفوں نے کہیں چوری سے اس رخ کا — وہ جب پکڑی گئیں اس جرم سے پانو پہ گر پڑیاں
رہی تاثیرِ رشک ان پر یہاں تک بعدِ مردن بھی — کہ لاشے کشتگاں کے تیرے آپس سے جدا کڑیاں
نہ کھاؤں رشک کیونکر ایسی صحبت پر کہ وہ کافر — جہاں اک پل نہ ٹھہرے تھا وہاں لگنے لگیں گھڑیاں
انھوں نے شب ترے آنے کی مانی تھی کہیں منّت — بہ یک پا چیں کے بت خانے کی تصویریں رہیں کھڑیاں
گیا تا اوجِ گردوں شور و شر نالوں کا عاشق کے — کہاں "شبرات" میں چھٹتی ہیں ایسے زور سے نڑیاں

سیہ بختی مری اے مصحفی سو رنگ لاتی ہے
لبِ خوباں پہ آتی ہیں نظر مسّی کی جب دھڑیاں

293

اک پل میں چشمِ تر نے دریا بہا دیے ہیں — پانی میں کوہ و صحرا سارے ڈبا دیے ہیں

1۔ اصل : انھیں   2۔ بھڑیاں : اشتعال۔ جو جانور لڑائے جاتے ہیں، انھیں لڑنے کے لیے بڑھاوا دینے کو بھڑیاں دینا کہتے ہیں۔

تیغ ادا بتاں کی کیا راہ سے چلے ہے ڈالے ہیں مار کتنے، کتنے بچا دیے ہیں
جب موے جعد اس کے آئے ہیں کوتہی پر پریوں کے چٹلے ان میں اس نے ملا دیے ہیں
نالہ کیا ہے ہم نے جب دم شب جدائی گوشِ نہ آسماں کے پردے جگا دیے ہیں
طرزِ خرام تیری کیا آفتِ چمن تھی پھولوں کے تختے جس نے یکسر بچھا دیے ہیں
ان سے ہی کوئی پوچھے جا کر کے حاصلِ عشق اس کام میں جنھوں نے جی ہی کھپا دیے ہیں
خط اپنا بھیجتے ہم کرتے ہیں سوچ اب تک اوروں کو گرچہ نامے اکثر لکھا دیے ہیں
کوئی غزال ان میں تا آ پھنسے میں اے دل آنکھوں کے اپنی رو رو حلقے بنا دیے ہیں
کچھ بے دماغ ہم سے وہ تُرک ہی نہیں ہے گھوڑے نے بھی تو اس کے نتھنے پُھلا دیے ہیں
سرمے کی بھی سلائی کوئی غضب تھی جس نے خاکِ سیہ میں ہم سے لاکھوں ملا دیے ہیں

اے مصحفی میں ان کو پھر کس طرح نہ باندھوں
رنگِ حنا نے رنگیں مضموں سجھا دیے ہیں

294

ہم جو تنہائی میں فریاد کیا کرتے ہیں وصل کی شب کے مزے یاد کیا کرتے ہیں
ایک دن شاخِ غزالاں سے عوض لینا ہے خاکِ مجنوں کو یہ برباد کیا کرتے ہیں
تو جو ہوتا نہیں پیارے تو ترے ہجر میں ہم تیری باتوں ہی سے دل شاد کیا کرتے ہیں
چھوڑتے جاتے ہیں کر تجھ پہ سے صدقے صیاد یوں گرفتاروں کو آزاد کیا کرتے ہیں
تیری تصویر جو ہے کھینچنی دشوار اس میں سوچ ہی مانی و بہزاد کیا کرتے ہیں
شغل یہ ہاتھ اسیروں کے عجب آیا ہے ذکرِ بے رحمیِ صیاد کیا کرتے ہیں
تیری تصویر سے بہلاتے ہیں ہم دل اپنا دلِ ناشاد کو یوں شاد کیا کرتے ہیں

مصحفی نظم غزل میں ہے یہ کس کا مقدور
جو جو طرزیں کہ ہم ایجاد کیا کرتے ہیں

295

گرمیاں عشق کی ایامِ حقیری میں کہاں سوجھتی ہے جو جوانی میں وہ پیری میں کہاں
مر کے زنداں میں ہمیں بدنام کیا زنداں کو مجھ کو تقدیر لے آئی تھی اسیری میں کہاں
مجھ سے گلگشت کی اب ہم نفساں مت پوچھو لطفِ گلزار رہا یاد اسیری میں کہاں
مشق نالے کی رسا طوطی نے مجھ سے کی ہے ورنہ استاد تھی وہ تازہ صفیری میں کہاں
آستانے کا ترے سنگ ہے اپنا تکیہ جاویں اب چھوڑ کر اس در کو فقیری میں کہاں
مو سے نازک ہے ہر اک شعر غزل کا میری ہیں یہ تشبیہہ ''مقاماتِ حریری'' میں کہاں
ضعفِ پیری نے جوانی سے کیا ہے معزول
مصحفی جایئے ایامِ تغیری میں کہاں

296

رکھوں ہوں منھ تو ولے قابل کلام نہیں دہن میں ماہی کے جیسے زباں کا نام نہیں
کرے ہے مجھ سے جو قاصد ترا کڑی باتیں میں سوچتا ہوں اجل کا تو یہ پیام نہیں
قدم قدم پہ ترے خونِ خلق ہوتے ہیں بلائے جانِ دو عالم ہے یہ خرام نہیں
یہ بے کسی سے ترے کشتے کی نکلتا ہے کہ بعدِ دفن بھی یاروں کو اذنِ عام نہیں
نہ اس کے پینے سے عاشق کو منع کر قاضی شرابِ خونِ جگر تو بھلا حرام نہیں
نہ ہو تُو زندگیِ مستعار پر نازاں فروغِ عمر بجز آفتابِ بام نہیں
تو لحظہ لحظہ زباں ناز سے بدلتا ہے قسم نہ کھا کہ تری بات کو قیام نہیں
ستم تو یہ ہے کہ اب تک بھی تجھ کو اے صیاد نگاہِ لطف بہ حالِ اسیرِ دام نہیں
دل ایک قطرۂ خوں، کوہِ عشق بارِ گراں تحمل اس کا کرے، آدمی کا کام نہیں
عیاں ہوا یہ شبِ کور کی سیاہی سے یہ شب ہے وہ کہ کہیں جس کی صبح و شام نہیں
صفائے دل میں بھی کیا کیا نظر نہیں آتا جو دیکھو جامِ جہاں بیں سے کم یہ جام نہیں

دلا، تو کیا مزۂ زندگی پہ مرتا ہے — کچھ اتنی چاشنیِ عمر خوش قوام نہیں
گلی میں اس کی میں جا کر رہا تو غیرتِ عشق — یہ بولی اُٹھ ترے رہنے کا یہ مقام نہیں
پڑی ہیں اس صفِ مژگاں میں سیکڑوں لاشیں — یہ کیا ہے، مجھ کو بتا دو، جو قتلِ عام نہیں
ہے برگِ گل کا تو کیا منھ جو ہو دوچار اس سے — مقابل اس کفِ پا کے مہِ تمام نہیں
خط اس نے غیر کو بھیجا ہے پر فراست دیکھ — کہ پشتِ خط پہ بھی مجھ کو لکھا سلام نہیں
ہر ایک لحظہ ہے رنگ اس کا مصحفی کچھ اور
زمانہ ایک روش پر علی الدوام نہیں

297

دستِ زندہ ہی کے زیبا ہے بدن میں آستیں — مردہ کے ہوتی نہیں قطعِ کفن میں آستیں
جھولیاں بھرتے ہیں گل چیں کیا گنہ اے باغباں — ہم نے بھی پھولوں سے پُر کی گر چمن میں آستیں
ہم گریباں چاک تھے اس کی ادا پر ان دنوں — جب وہ طفلی میں چباتا تھا دہن میں آستیں
دست بردِ شعلۂ آتش کہاں تک وقتِ صبح — شمع کی کھپ جائے ہے آخر لگن میں آستیں
رنجِ غربت نے ہمیں بیمار و لاغر کر دیا — ورنہ تھی بازو پہ تنگ اپنے وطن میں آستیں
اٹھ گیا خاطر سے جب چاکِ گریباں کا خیال — پرزے پرزے ہم نے کی دیوانہ پن میں آستیں
سینۂ بکشادہ ہے وحشت میں دامانِ نگار — خاطرِ آزردہ ہے چین و شکن میں آستیں
مصحفی کا یار رنگیں ہے وہی پہچان لو
پیک سے جس کی بھری ہو انجمن میں آستیں

298

کس طرح اپنے دلبرِ جانی سے مَیں ملوں — اے آہ کیا کروں جو فلانی سے مَیں ملوں
جاتا ہے اس کے پاس تو ظالم نہ پُوچھیو — قاصد جو تیری شیوا زبانی سے مَیں ملوں
پردے میں ہے وہ رشکِ پری، مجھ کو چاہیے — اک راہ و رسمِ قاعدہ دانی سے مَیں ملوں

کیسی مِلائی خاک میں اس نے بہارِ گل شکوہ کروں جو بادِ خزانی سے میں ملوں
ان کے زبان و دل تو موافق نہیں بہم کیا خاک دوستانِ زبانی سے میں ملوں
خاکے پر اس کے نقشۂ یوسف نہ کھینچیو اتنا کہوں ضرور جو مانی سے میں ملوں
لے جاؤں گور پر نہ زلیخا کی شمع و گل جس رات اپنے یوسفِ ثانی سے میں ملوں
عشرت کے دن جو تھے سو گئے مصحفی گزر
پیری میں آہ کیوں کہ جوانی سے میں ملوں

299

کھاتا ہوا زمین پہ چکّر پھرا ہوں میں گردش میں آسماں کے برابر پھرا ہوں میں
بانکا ہوں اس چمک کا کہ دلّی سے شہر میں زنجیرِ برق باندھ کے سر پر پھرا ہوں میں
کہتا ہے اس کا سرمۂ دنبالہ دارِ چشم لاکھوں گلے پہ جوں دمِ خنجر پھرا ہوں میں
تو پھر گیا ہے مجھ سے طرح روزگار کی کس دن بتا تو تجھ سے ستمگر، پھرا ہوں میں
سیماب سفلہ دیدہ رہا ہے وہ سال ہا گلیوں میں جس کے واسطے مضطر پھرا ہوں میں
صحرا و کوہ و دشت کو آفت کی جا سمجھ مانند ابر تا مژۂ تر پھرا ہوں میں
نشتر رسیدہ ہیں مرے پانو کے آبلے صحرا میں نوکِ خار پہ اکثر پھرا ہوں میں
لا مذہبی میں میری بھلا کس کو شک رہا مذہب ہیں جتنے ان سے مقرر پھرا ہوں میں
پھر کی صفت جو مجھ کو پھرایا ہے یار نے تا دیر اپنے گرد مقرر پھرا ہوں میں
گر مجھ کو بختِ بد نے گرایا ہے خاک پر ''غلطاں'' ہر ایک دانۂ گوہر پھرا ہوں میں
آرام اک جگہ نہیں پایا تہِ فلک سرگشتہ کوہ و دشت میں اکثر پھرا ہوں میں
کرنے کو سیر غافل و بیدار خواب کی محمود وار راتوں کو اکثر پھرا ہوں میں
شرمندگی یہی ہے کہ مقتل سے عشق کے قاتل کی اپنے آنکھ بچا کر پھرا ہوں میں
ہے جائے رحم مجھ پہ کہ اڑ کر ہوا کہ بیچ سرگشتہ جوں تباہ کبوتر پھرا ہوں میں

ہوں گرچہ ایک در کا گدا ہائے رے طمع　　اس بوجھ اور سمجھ پہ بھی در در پھرا ہوں میں
مجھ سا بھی بے شعور کوئی ہوگا مصحفی
بہرِ تلاشِ رزقِ مقدر پھرا ہوں میں

300

اس کا سبب یہ ہے جو میں گرمِ فغاں نہیں　　میرا تو اس چمن میں کوئی ہم زباں نہیں
عاشق ہوں لیک صحبتِ معشوق سے نفور　　بلبل ہوں پر چمن میں مرا آشیاں نہیں
اپنی طرف سے ہی جو دو باتیں بنا کہے　　ایسا تو بت بنا مرے کوئی درمیاں نہیں
اٹھنے میں روزِ حشر کے مردوں کو ہے درنگ　　پھر کیا ہے یہ جو مستیِ خوابِ گراں نہیں
خوابِ وصال دیکھ کے مت بدشگوں کرو　　یہ جائے گریہ، اے مژۂ خوں چکاں، نہیں
اٹھتے ہیں آج ناقۂ لیلیٰ کے جلد پانو　　وامانده کیا کوئی بہ پسِ کارواں نہیں
بلبل تو اس قماش سے آہ و فغاں نہ کر　　ہے فصلِ گل ابھی تو چمن میں خزاں نہیں
میں چاہتا ہوں یہ کہ ملے مجھ سے دل ترا　　پر چاہتا ترا دلِ نا مہرباں نہیں
عاشق کو تیرہ بختیِ لازم سے ہو نہ رنج　　موے سر اپنے سر پہ کسی کے گراں نہیں
اے دیک[1] صبحِ وصل کی شب بول سوچ کر　　بے وقت دے نہ بانگ کہ وقتِ اذاں نہیں
اب گردبادِ دشت بھی بھولا ہمیں دریغ　　وہ بھی ہماری خاک پہ دامن فشاں نہیں
اے مصحفی شکایتِ طالع میں کیا کروں
جو قدرداں مرے ہیں وہی قدرداں نہیں

301

جائے بروں شدِ نفسِ پر دخاں نہیں　　رکتا ہے دم کہ گھر میں مرے تابداں نہیں
ہے یہ بھی جائے شکر کہ اس مستِ ناز کو　　جو غیر پر گماں ہے وہ مجھ پر گماں نہیں

1۔ دیک: مرغ کی ایک قسم

ازبس کہ اشکِ سرخ سے رنگیں ہیں پتلیاں
اپنا قفس بھی ہم کو کم از گلستاں نہیں
پہنچے گا مجھ سے رنج نہ حمالِ روح کو
دوشِ ہوا پہ نکہت گل کچھ گراں نہیں
سوز و گدازِ دل سے تو رکھتا ہوں راہ و رسم
مانندِ شمع گو مرے آنسو رواں نہیں
ہر گل کے رنگ سرخ میں زردی کی تہ سی ہے
بھولا چمن کو صدمہ بادِ خزاں نہیں
عمرِ شرر فروغ کی فرصت پہ کر نہ لاف
کیا تو چراغِ راہِ نسیمِ وزاں[1] نہیں
کیا کام ہم کو روے مخطط کے عشق سے
قرآنِ دل میں سورۂ نور و دخاں نہیں
وابستگانِ گردشِ فانوسِ آسماں
گو پیش و پس رواں ہیں ولیکن رواں نہیں
طولِ بساطِ عمر کی فرصت ہے کس قدر
جو ہے یہاں سو شب کے سوا میہماں نہیں
دیتے ہیں اور یار بھی دادِ سخن وری
پر مصحفی سا شعر میں جادو بیاں نہیں

302

کیا غم ہے گر جراحت عاشق کے کم رفو ہیں
دو چار ٹانکے اب بھی زخموں کے پس لگو ہیں
سنسان سا ہے تجھ بن ساقی شراب خانہ
خُم خشک ہو رہے ہیں، خالی پڑے سبو ہیں
اپنے وہ دن نہیں ہیں، اب چاہ کے مزے کو
تم ان کے دل سے پوچھو جو صاحب آرزو ہیں
خالق کی نعمتوں کا واجب ہے وصف اتنا
انسان کے بدن میں جتنے روئیں میں مو ہیں
دیکھا جو غور کر کے صاحب کی دوستی میں
جاں ہے ہماری دشمن ہم جان کے عدو ہیں
زلفوں سے اس کی اک شب سوئے تھے ہم لپٹ کر
اپنے تمام اعضا اس شب سے مشک بو ہیں
غائب میں بھی تصور ٹلتا نہیں ہے از بس
شبہاے ہجر گویا ہم اس کے روبرو ہیں
جو جو کیے ہیں تم نے اعمال زندگی میں
گر چشمِ ہوش وا ہو تو سب وہ روبرو ہیں
آوازِ لولیاں کی کیا نرمیاں کہوں میں
ان کافروں کے گویا بے استخواں گلو ہیں
مجلس میں زہرہ سیما اپنی ہیں جتنے بیٹھے
جتنے ہیں خوبصورت وِتنے ہی خوش گلو ہیں

1۔ نسیم وزاں: چلنے والی ہوا (ورزیدن= ہوا کا چلنا)

آؤ کبھی چمن میں ان کو بھی منھ دکھاؤ — مدت سے گل تمھارے مشتاقِ رنگ و بو ہیں
تلوار سے ہوئے ہیں جو اس کی پور زخمی — عریاں تنی کے جامے ان کشتوں کے اُٹو[1] ہیں
دیکھی تھی روزِ اوّل اس مہ کی اک جھلک سی — چرخ و ستارے اب تک سرگرمِ جستجو ہیں
ہم کو تیمّمِ خاک کافی ہے بہرِ سجدہ — ہم کاغذیں بدن تو کب قابلِ وضو ہیں

اک مصحفی سا رسوا ہوتا ہے دیر پیدا
یوں عاشقوں کے چرچے دنیا میں چار سو ہیں

303

کشتنی ہوں میں مرا لیجو ثوابِ گردن — تیغِ جلّاد دکھانا نہ عذابِ گردن
موشگافوں پہ بھی کھلتا نہیں کچھ اس کا حال — بس کہ دن رات ہے جعد اس کی نقابِ گردن
موج گر بحرِ صفا کی ہے وہ گردن تو ہیں — موتی مالا کے وہ موتی بھی حبابِ گردن
بالشِ نرم کا رکھنا تجھے تب آئے گا یاد — ہوگی جب خشتِ لحد سنگِ عذابِ گردن
کٹ گئے سیکڑوں بکرے سے ترے مقتل میں — نہ سروں کا ہے شمار اور نہ حسابِ گردن
آئینہ دیکھ اسے کیوں کہ نہ حیران رہے — جس گلو کی ہو صفا لبِّ لبابِ گردن
جام بھی چشم کو چاہے ہے مرے میکش کے — نہ صراحی ہے فقط مست و خرابِ گردن

مصحفی قافیے بے رخ ہیں غزل کے تیری
کیوں نہ دشوار ہو قائل کو جوابِ گردن

304

مردمِ چشمِ پری بھی ہو جو خالِ گردن — سمجھے اس کو وہ سپش[2] وار وبالِ گردن
باندھوں ایسے کا میں پھر کیوں کہ خیالِ گردن — جس کے ہوں دستِ تصور بھی وبالِ گردن
شخصِ سرکش سے نہیں حق کی عبادت ہوتی — سجدے میں سر کو جھکانا ہے کمالِ گردن

1۔ اُٹو : نقش بنانا، سجانا، چھٹیں ڈالنا 2۔ سپش وار : جوں کی مانند

ہوگا تلوار سے گر ہاتھ مرا سو ٹکڑے
تو بھی چھٹنے کا نہیں اس سے خیالِ گردن

قلزمِ حسن نے اس ماہ کے جب مارا جوش
گئی چوٹی سے گزر موجِ زلالِ گردن

میرے زانو پہ نہ رکھ کے کبھی سویا یار
حصّے تکیے کے گیا اس کا وصالِ گردن

سرکشی بزمِ نکویاں میں بری ہے شعلے
اس لیے شمع کا چاہے ہے زوالِ گردن

اے خوشا عالمِ ارواح کہ جن کی ہرگز
زندگی کا نہ ہوا طوقِ وبالِ گردن

گورے پنڈے کی ترے مجھ کو صفا یاد آئی
شمعِ کافور میں دیکھی جو مثالِ گردن

خوبرو جتنے ہیں عشاق سے دل مانگتے ہیں
کفچۂ جعد بھی ہے دستِ سوالِ گردن

جیسے بڑھتی ہے گناہوں سے سویدا[1] دل کی
سرکشی سے نہ مسا[2] ہووے وہ خالِ گردن

مصحفی یار کے چہرے سے عیاں ہوتا ہے
بار لایا گلِ خورشید نہالِ گردن

305

بیٹھا ہے منھ پُھلائے آتا نہیں سخن میں
کیا گھنگنیاں پڑی ہیں اس شوخ کے دہن میں

چٹکی جو رات لی میں اس شوخ کے بدن میں
اک برق سی گئی کوند بل کھا کے پیرہن میں

پیپل کا پتا ہم کو خشکی نے کر دیا ہے
لگتے ہوا کہ رعشہ پڑ جائے ہے بدن میں

کیا جانے منتظر تھا آنے کا کس کے میں جو
تھیں بعدِ مرگ میری آنکھیں کھلی کفن میں

گالی سوا کبھی وہ کچھ بولتا نہیں اب
کتنی زباں کھلی ہے اس کی رذال پن میں

دانتوں سے گوشت اپنا کیونکر کوئی نہ کاٹے
بوسے کی جا نہیں ہے اس شوخ کے دہن میں

کب تیغِ اژدہائے گیسو کا ہم کو ڈر ہے
جیتے ہی جی ہیں بیٹھے ہم موت کے دہن میں

دنبالہ دار سرمہ سولی وونہی لے آیا
فتنے کے ہاتھ باندھے جب زلف نے رسن میں

ہے ایک چاہ نخشب اور ایک ماہ نخشب
چنداں نہیں تفاوت اس غبغب و ذقن میں

شمشیرِ شعلۂ شمع ہے گرمِ سر فشانی
ستھراؤ پڑ نہ جاویں پروانوں کے لگن میں

1۔ سویدا: دل کی سیاہی 2۔ مسا: مسّا

اے مصحفی مرے ساتھ از راہ حیلہ جوئی ق ظاہر کرے ہے گو وہ چاہ اپنی انجمن میں

کھاتا ہے جھوٹی قسمیں باور کروں میں کیونکر

تنکا زباں تلے ہے اس شوخ کے دہن میں

306

اب تک ہے روح اپنی مسّی لگے دہن میں سوسن کے پھول رکھنا یارو، مرے کفن میں

نکلے تھے ہو کے اک دن لالے کے ہم چمن میں اک آگ پھنک رہی ہے اس دن سے تن بدن میں

تصویرِ چیں کو تیری چینِ جبیں کا ہے دھیان مشتاق مشک نافے جوڑے کے ہیں ختن میں

دکھلا رہا ہے ہم کو کنجِ قفس بہاریں ہم جا کے کیا کریں گے، بادِ صبا، چمن میں

حُبِّ وطن نہ چھوٹی، نورِ نظر صفت ہم باہر گئے وطن سے تو بھی رہے وطن میں

تھوڑی سی قید بھی ہے نازک بدن کو زنداں فریاد کر رہا ہے حسن اس کا پیرہن میں

تربت پہ ان کی دیکھی ہرگز نہ دوب جمتی جن سادوں کو کہ اس نے مارا تھا سادہ پن میں

خط آتے ہی تمھاری کیا ہو گئی وہ صورت کتنے بھلے لگتے تم ہارے سادہ پن میں

شوق کمر میں اس کے باریک ہو گئے ہم ڈھونڈا کیے ملائک بعد از فنا کفن میں

از بہرِ رزق اتنا تو مصحفی نہ غم کھا ق اور دل کو رکھ نہ اپنے تو رنج اور محن میں

پتھر کے کیڑے کو بھی دیتا ہے رزق رزاق

ہوتا ہے سبز پتا اک اس کے بھی دہن میں

307

دوزخ میں جل رہا ہوں فردوس کے چمن میں گم ہو گئی ہے میری آسودگی وطن میں

انکارِ جرمِ پنہاں تو کس طرح کرے گا محشر میں تیرے اعضا آویں گے جب سخن میں

دیتے ہیں جان مردم شاید کہ آ کے نکلے آبِ حیات کی سوت اس کے چہ ذقن میں

شیریں سے کوئی کہہ دو گر دیکھنے کو آوے سدِّ رمق سی باقی اب تک ہے کوہ کن میں

کیا خال کیا خط اس کا، کیا چشم کیا وہ ابرو
ہیں آفتِ زمانہ سب اپنے اپنے فن میں

بابنی میں مَیں نے جاتے مار سیاہ دیکھا
موباف جعد اس نے جب دم رکھی دہن میں

ڈرتا ہوں میں نہ اس کے بازو سے کھول لیوے
دزدِ حنا کا ہر شب ہے دھیان نو رتن میں

تیشہ جو سر پہ مارا اس دم ہوئی وہ ظاہر
قوّت خدا نے دی تھی جو دستِ کوہ کن میں

صیاد کی شرارت یہ اور تم نے دیکھی
کر ذبح کتنے بلبل مدفوں کیے چمن میں

باقی جو رہ گیا تھا مضمونِ نامۂ شوق
انگلی قلم بنا کر ہم نے لکھا کفن میں

ہنگامِ خط ہے لازم اس سے سوالِ بوسہ
مانگیں ہیں بھیک سائل چاند آوے جب گہن میں

ان کافروں کے گر یہ جوڑوں کی بندشیں ہیں
بکنے کو مشک نافے جاویں گے پھر ختن میں

کاش آنکھیں پھوٹ جاویں یہ رشک کی جگہ ہے
اس تن کو اور میں دیکھوں نینوں کے پیرہن میں

معشوق میرا گویا اے مصحفی، ہے قِلیاں
ہرگز جو بن بلائے آتا نہیں سخن میں

308

طوطی کے لب ہوئے بند، آیا جو وہ سخن میں
منہ سے نقاب الٹا، پھیلی خزاں چمن میں

اک رات شہد لب کا اس کے لیا تھا بوسہ
چٹکارے بھر رہی ہے اب تک زباں دہن میں

ہم زندگی سے اپنی پہلی ہی ہاتھ دھوویں
آخر تو ڈوبنا ہے اک دن چہِ ذقن میں

بادل کو رقت آئی، برقِ جہندہ تڑپی
منہ کھولنا ہمارا اچھا نہ تھا کفن میں

جس وقت پان کھا کر خنداں ہوا وہ گل رو
چمکے جو دانت، گویا بجلی گری چمن میں

تیرے رخ و جبیں کا شاید کہ تذکرہ تھا
باتیں تو کچھ ہوئی تھیں شب گل میں اور سمن میں

مارِ سیہ سے کر لے، اے زلفِ یار، دعویٰ
ایسا نہ ہو کہ تیری رہ جائے من کی من میں

دیکھ اس کی سرخ پوشش یہ شمعِ سرخ روئی
جو صبح ہوتے آخر خوں بھر گیا لگن میں

ہے سلطنت پہ بے جا عجب و غرورِ شاہاں
کیا کیا کلاہ گوشہ [1] یاں آ گئے شکن میں

1۔ کلاہ گوشہ : کج کلاہ، مغرور؟

اے مصحفی اگر ہیں ہم طرح سنگِ خارا
فولاد کی رکھیں ہیں ہم بھی زباں دہن میں

309

نامے کو اب کے میں جو خطِ کہکشاں کروں / قاصد بنا کے اپنا فلک کو رواں کروں
بے نجم ہے جو رو بہ بسر آسماں کروں / میں کیا شبِ فراق کا عالم بیاں کروں
غم خوار ہے تو تُو ہی وگر یار ہے تو تُو / کس سے کہوں جو تجھ سے غمِ دل نہاں کروں
غربت پہ میری رحم اسے آیا تو یوں کہا / کیا ایسے آدمی کا بھلا امتحاں کروں
گدّی سے عرض حال پہ نکلے ہے واں زباں / تب کچھ کہوں جو حال کا اپنے زباں کروں
واماندگی نے مجھ کو رکھا سب سے دور ہائے / تا چند یاد ہمرہیِ دوستاں کروں
مجنوں کی آہ سے کبھی تنکا ہلا نہ تھا / کانپ اٹھیں نہ فلک جو ابھی میں فغاں کروں
فصلِ بہار میں ہے مری لوح پر بہار / میں وہ نہیں جو سیرِ گل و گلستاں کروں

اے مصحفی تو میری مصیبت کو کچھ نہ پوچھ
ناگفتنی کا یار بھلا کیا بیاں کروں

310

بیگانہ خو کو اپنے جو آشنا بناؤں / ایسا کبھی نہ ہوں خوش گر کیمیا بناؤں
دنیا میں کس کو اپنا حاجت روا بناؤں / حیراں ہوں میں کہ یارب کیا کیمیا بناؤں
مدِّ نفس ہے میرے سرمایۂ سعادت / گر چغد آوے دم میں اس کو ہما بناؤں
خوں لاکھ آرزو کے دل میں مرے ہوئے ہیں / ''اکٹھا'' کروں گر ان کو اک مقبرا بناؤں
میں فنِ عاشقی کے کس مرتبے میں کم ہوں / مجنوں اگر ملے تو اس کو چچا بناؤں
رشکِ پری کا اپنی گر ذکر لے چلوں کچھ / دیوانہ تجھ کو دم میں بادِ صبا، بناؤں
تعلیمِ عشق بازاں مشاطہ کو کب آئی / تجھ کو جو میں بھی پاؤں کافر بلا بناؤں

خجلت سے عشق کی میں روپوش ہو رہا ہوں اب سامنے جو جاؤں تو بات کیا بناؤں
اتنی بھی دست قدرت مجھ کو نہ دی فلک نے دریا ہی کے کنارے اک "چونترا[1]" بناؤں
اے مصحفی گر آؤں معجز طرازیوں پر
موسیٰ صفت عصا کو میں اژدہا بناؤں

311

شستہ و صاف تر از آب گہر ہے وہ بدن سببِ روشنیِ نورِ نظر ہے وہ بدن
سینہ شیر رکھے ہے بت باریک کمر اس لیے دیکھنے میں زیبِ کمر ہے وہ بدن
گل نزاکت میں نہیں چاندنی کے لگتے اسے ہے صباحت کا یہ پتلا کہ قمر ہے وہ بدن
چاہیے شیر و شکر کیا اسے از بہر لباس خوش قماشی میں تو خود شیر و شکر ہے وہ بدن
عضو عضو اس کے سے ہوتی ہے صباحت پیدا صاف بلّور کا گویا کہ شجر ہے وہ بدن
آوے سہراب بھی گر از پئے کُشتی گیری نہیں اندیشہ کہ با زور و نبر[2] ہے وہ بدن
مصحفی جب سے اسے شوق ہوا ورزش کا
آگے آنکھوں کے مری شام و سحر ہے وہ بدن

312

بہرِ صفِ جنگ احمق میدان پکڑتے ہیں استاد مرے آگے سب کان پکڑتے ہیں
ہاتھوں میں بتاں کے ہے یہ حال مرے دل کا کنجشک کو جوں لڑکے نادان پکڑتے ہیں
صحبت کا اثر ہرگز حیواں کو نہیں ہوتا انسان کا رنگ و بو انسان پکڑتے ہیں
گردوں کی طبیعت میں جو سفلہ نوازی ہے بیکار غریبوں کو حیوان پکڑتے ہیں
اک روٹی کے ٹکڑے پر کھاتے ہیں فریب ان کا کیا گھونس کو بازاری آسان پکڑتے ہیں
میں وادی مجنوں کا ہوں ننگ تو جانے دیں کس واسطے پھر کانٹے دامان پکڑتے ہیں

1۔ چونترا : چبوترا   2۔ زور و نبر : (نبر: اونچا اٹھانا)

اے مصحفی مفلس کا غم خوار نہیں کوئی
کب ہاتھ فتادہ کا ذی شان پکڑتے ہیں

313

نالے ہزار مرغِ چمن کے دہن میں ہیں — دو چار ڈالیاں ابھی رنگیں چمن میں ہیں
ہم آپھی ساتھ لے کے چلے ہیں یہ کارواں — صد آرزوے کشتہ ہمارے کفن میں ہیں
شاید کچھ اس کے رو و بنا گوش کا ہے ذکر — باہم اشارتیں جو گل و یاسمن میں ہیں
سوے عدم چلے ہیں وہ یہ لے کے ارمغاں — سیلاب سے جو شمع کے آنسو لگن میں ہیں
یہ کہتے ہوں گے اس کو ملا ہے سفر میں چین — ہم سے جدا جو یار ہمارے وطن میں ہیں
تھے ہی سلف تو خوب پر اب بھی جو دیکھیے — کیا کیا عزیز مجلسِ اہلِ سخن میں ہیں
مژگاں نے تیرے چین گلستاں کا کھو دیا — کانٹے ہر ایک گل کے چبھے پیرہن میں ہیں
عالم وہ تیرے حسن کا جاتا رہا ولے — اب بھی ہزاروں چاؤ دلِ مرد و زن میں ہیں
اے کاش! ان سے روز جزا وہ دوچار ہو — شیریں سی حسرتیں جو دلِ کوہ کن میں ہیں

گلبرگ لب میں اس کے نہ دیکھے میں مصحفی
جو جو مزے کہ بوسۂ سیبِ ذقن میں ہیں

314

میں کس کے پاس جاؤں مرا آشنا ہے کون — ہم شکل بے وفا ہیں سبھی، با وفا ہے کون
پرچھائیں اپنی آپ میں کاٹوں ہوں چرخ سے — امیدوارِ سایۂ بالِ ہما ہے کون
قصہ جو ہے تو ہے گل و بلبل میں باغباں — کیوں بولتی ہے بیچ میں، بادِ صبا ہے کون
ہے اپنے خال و خط کے بنانے سے تجھ کو کام — کیا جانتا ہے تو کہ اسیرِ بلا ہے کون
سیتے کفن کو دیکھ مرے شوخ نے کہا — اس گھر میں کیسا شور ہے یہ یاں موا ہے کون
مال اس کا ہے جو اپنا رگ و ریشہ ہے تمام — ہے سچ تو یہ کہ ملکِ خدا سے جدا ہے کون

پھولوں پہ پڑ گئی ہے جو یکبار اوس سی کیا جانے صبح جا کے چمن میں ہنسا ہے کون
دیکھے نہ پھر تو آئینہ سمجھے اگر، صنم یہ آئینے میں تیری طرف دیکھتا ہے کون
آتی ہے شب کو مصحفی فریاد کی صدا
کیا جانے اس کا بستۂ زلفِ دوتا ہے کون

315

بلائیں لینے کے مائل ہیں ہاتھ پاس نہ آؤں گلے لگانے کو چاہے ہے جی گلے نہ لگاؤں
نہ اتنی تاب کہ تابِ فراقِ یار میں لاؤں نہ اتنا صبر کہ یک چند اس گلی میں نہ جاؤں
تمھاری اور مری باتیں ہوئی ہیں جو ان کو نہ تم کسی کو سناؤ نہ میں کسی کو سناؤں
ضرور کیا مجھے دیر و حرم کا طوف کروں
میں ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کہیں مجدی نہ بناؤں

316

چشمِ بد دور وہ کافر ہے طرحداروں میں جس کے ہنسنے سے گڑھے پڑتے ہیں رخساروں میں
گاہ گاہ آنے سے اس کوچے میں ہے شکر کی جا ہم بھی کہلاتے ہیں یوسف کے خریداروں میں
مذہبِ عشق کا عالم ہی جدا ہے، ہم کو کافروں میں کوئی گنتا ہے نہ دینداروں میں
دل نہ سنبھلا مرا، یہ سچ ہے وہ بچتا کم ہے آدمی جب کبھی گھِر جائے ہے آزاروں میں
لے چلو دارِ شفا میں کہ ہیں اب زیست سے تنگ ہم بھی واں اونگھ رہیں گے کہیں بیماروں میں
سامنا اس صفِ مژگاں کا کیا ہے کس نے وہ ہمیں ہیں کہ گھسے جاتے ہیں تلواروں میں
دیکھیو عشرتِ مرغانِ چمن کا عالم برگِ گل کیسے لیے پھرتے ہیں منقاروں میں
بات کرتا نہیں وہ شوخ کبھی بھولے سے جان کر ہم کو محبت کے گنہگاروں میں
اپنے پانو کو ہوا آہنِ زنجیر نصیب یا وہ دن تھے کہ کبھی پھرتے تھے گلزاروں میں
یا الٰہی یہ اثر کس نگہِ مست کا ہے بے ہوشی سی جو چلی آتی ہے ہشیاروں میں

کاوِ کاوِ نگہِ شوخِ بتاں گر یہ ہے رخنے پڑ جاویں گے ہمسایوں کی دیواروں میں
رتبۂ عشق کو پاوے ہے ہر اہلِ ہوس یوں تو بڑھیا بھی ہے یوسف کے خریداروں میں
ہے ذرا خانۂ صیاد کی رونق ہم سے
ایک ہم رہ گئے ہیں اس کے گرفتاروں میں

317

ہے لطفِ سیرِ شبِ ماہ ان حسینوں میں جنھوں کے رہتی ہے افشاں چنی جبینوں میں
نظر پڑی ہے جو سینے کی اربسی اس کی پھڑک رہے ہیں دلِ اہلِ دردسینوں میں
جنھوں سے عقدہ کشائیِ خلق ہوتی ہے وہ ہاتھ ہوویں گے یارب کس آستینوں میں
کرا ے فلک تو ہی انصاف یہ روا کب ہے وہ بگڑے پل میں جو پتلا بنے مہینوں میں
کسی کی ہم نے چڑھی ناک بھوں نہیں دیکھی ہوئی ہے عمر بسر اپنی نازنینوں میں
دو چار آئینہ ہونا ابھی وہ کیا جانے جھکی ہوئی ہے نظر اس کی شرم گینوں میں
نہ کوہیوں نے کیا کوہ کن کا لاشہ دفن خراب موت ہو اشراف کی کمینوں میں
انھوں کو صاحبِ خرمن سبھی سمجھتے ہیں
جو مصحفی کے کہاتے ہیں خوشہ چینوں میں

318

انھیں تو شوق ہے چٹکی کا ہم نشینوں میں ملے ہے کوئی پڑا یاں دلوں کے سینوں میں
حنائے عیش کی رنگت کے کام آوے گا ہمارے خوں کو تو پھر رکھیو آبگینوں میں
شفق نہیں ہے یہ افلاک نے تری شبِ وصل بھرا ہے شادی کا تنبول[1] آبگینوں میں
گلے پہ تیغ کسی کے اگر چلے چل جائے بتاں نے پٹھے لگائے ہیں آستینوں میں
فراقِ موسمِ گل کے بھی دن ہوئے آخر رکھا تھا زندہ مجھے کیوں قفس نشینوں میں

1۔ تنبول : عرقِ پان۔ تنبول بھرنا = شادی کی ایک رسم

گلے ملیں ہیں گل و غنچہ شب ہوئی آخر — وداعِ صبح کا عالم ہے نازنینوں میں
پھریں ہیں مرغِ چمن مست جب سے دیکھی ہے — شرابِ سرخ بھری گل کے ساتگینوں[1] میں
رہوں ہوں وادیِ وحشت میں میں جہاں تنہا — اُدھر سے کوئی کبھی گزرے ہے مہینوں میں
عیاں ہے خون کے دھبوں سے کس طرح عشاق — چھپاویں ساعدِ گل خوردہ آستینوں میں
اُڑا گئے وہ وونہی ہاتھوں ہاتھ دل میرا — مگر کہ تھے ترے سینے کے چھلتے مینوں میں
خیال شعر کے کہنے کا مصحفی کو نہیں
وگر کہے ہے تو وہ ایسی ہی زمینوں میں

319

وہ سمجھے شعر مرے جو کہ ہو ذہینوں میں — کلام اپنا میں پڑھتا نہیں کمینوں میں
نہ کیوں کہ سیر کرے شب دووں[2] کے سینوں میں — جو خالِ چشم کہ برسوں رہا ہو مینوں میں
شروعِ سال ہے وحشت کے دن پھر آپہنچے — اداسیاں نظر آتی ہیں ان مہینوں میں
کلاہِ ناز جہاں تیری قطع ہوتی ہے — ہلالِ عید ہے واں کے تراش چینوں میں
ترے شہید میں محشر کے روز پہچانے — ملے ہوئے تھے کبھی مشت خوں جبینوں میں
بتاں نہا کے جو نکلے تو برہمن سے کہا — لگادے چھاپے تو صندل کے اب جبینوں میں
نہ قمقموں سے کبھی اپنی ہو تسلیِ دل — شرابِ سرخ بھریں تا نہ آبگینوں میں
ترے خرام کی آفت سے وہ نہیں ایمن — رہے ہے مشورہ زیرِ زمیں دفینوں میں
وہ دل سے دور ہوئے ہو کے چشم سے غائب — نظر پڑیں تھے جو نزدیک دور بینوں میں
یہ گومتی میں جو بجرے جہاں پناہ کے ہیں — پری و حور کا عالم ہے ان سفینوں میں
بلند عرش سے رتبہ ہے مصحفی ان کا
جو لوگ رازِ الٰہی کے ہیں امینوں میں

1۔ ساتگین: پیالہ 2۔ شب دو :شب رو(چور)؟

320

قطرے عرق کے چہرۂ جاناں سے گرتے ہیں یا تارے آفتابِ درخشاں سے گرتے ہیں
دیکھا ہے کس کو پہنے ہوئے ہار پوتھ کا آنسو سفید پوتھ سے مژگاں سے گرتے ہیں
کرنوں پہ آفتاب کی ہوتے ہیں خندہ زن ذرے جو تیرے ماتھے کی افشاں سے گرتے ہیں
کھل جائے ہے جو ہجر کی شب آنکھ تا سحر انگارے ہم پہ گنبدِ گرداں سے گرتے ہیں
سرسبز کیا ہو، سچ ہے مری کشتِ آرزو ایسے ہی پتھر ابرِ بہاراں سے گرتے ہیں
خلعت دیا ہے اس کو مگر شاہِ حسن نے تار زری جو خور کے گریباں سے گرتے ہیں
بیہودہ چشمِ ناقۂ لیلیٰ کا ہے گھمنڈ قیس اس گلی میں چشمِ غزالاں سے گرتے ہیں
اے مصحفی ملا ہے چمن یاس کا مجھے
حسرت کے پھول کب مرے داماں سے گرتے ہیں

321

دل عاشقِ بیاضِ رخسارِ ماہ رویاں جاں محرمِ سوادِ گیسوے مشکبویاں
تم شاخ گل نہ جانو، نکلے زمیں سے باہر فصلِ بہار میں ہیں دست پیالہ جویاں
کرتے ہیں پھر دلوں میں مردہ ہوس کو زندہ کیا پوچھتے ہو حزنِ آوازِ خوش گلویاں
بلقیس کا فسانہ کس کس طرف نہ پہنچا رہتا ہے کوئی پنہاں آوازۂ مکویاں[1]
رہتے ہیں جستجو سے کب روے خوش کی غافل جن لوگوں کو دیے ہیں پاے بخواب پویاں[2]
وہ عشق و عاشقی کے کیا جانے پھر مزے کو کھائی نہ ہووے جس نے دشنام تندخویاں
اشعار مصحفی کو اک شب سنیں جو دل سے
پھر ہوں نہ گوشِ سامع مشتاقِ تازہ گویاں

322

خاصۂ علمِ الٰہی ترا مفہوم نہیں مرگ کا روز کسی شخص کو معلوم نہیں

1۔ مکویاں رمکنون (پوشیدہ)؟ 2۔ پاے بخواب تویاں: سوتے میں چلنے والے؟

دھیان میں اپنے کچھ اس زیست کا مفہوم نہیں　　کیوں جلاتا ہے خدا مجھ کو یہ معلوم نہیں
گوشت کشتے کا ترے خاص ہما کھاتے ہیں　　اس میں کچھ حصۂ زاغ و زغنِ شوم نہیں
دیکھو جو عضوِ لطافت سے وہ ہے نامحسوس　　کچھ دہان و کمرِ یار ہی معدوم نہیں
مر گئے کیا سبھی زنداں میں ترے دیوانے　　آج کل نالۂ زنجیر کی وہ دھوم نہیں
چشم اعمیٰ [1] بھی تصور میں ترے لوٹے تھی　　دولتِ دید سے تیری کوئی محروم نہیں
ہم بھی کس واسطے پھر اتنی کریں جانکاہی　　وصلِ خوبانِ جہاں اپنا جو مقسوم نہیں
بخلِ ساقی نے یہ میخانے میں باندھی ہے ہوا　　کون سا شیشۂ مے ہے کہ وہ مختوم [2] نہیں
کوچۂ یار تلک جائے تو ٹک پیک صبا　　عذر بے جا ہے ترا شام نہیں روم نہیں
کیوں کہ رکھوں نہ عزیز اپنے دُرِ اشک کو میں　　اس سے بہتر تو مرے پاس کوئی ٹوم [3] نہیں
کر گزر کوچۂ حی میں بھی کبھی، اے مجنوں　　کون ہے وہ کہ ترے واسطے مغموم نہیں
افعیِ جعدِ سیہ نے اسے شاید کاٹا　　شاخِ سنبل کو کہوں کیوں کہ وہ مسموم نہیں

سرمہ عبش [4] مردم ہے وہ آنکھوں سے لگا
مصحفی خاکِ درِ یار کو تو چوم نہیں

323

سرگرمِ نالہ مرغِ خوش الحاں ہے ان دنوں　　پھر آمدِ بہار کی طغیاں ہے ان دنوں
تا چند ضبطِ عشق ہوا تنگ حوصلہ　　اپنا تو خصمِ جاں غمِ پنہاں ہے ان دنوں
شاید ملے ہمیں بھی تہِ تیغ ہی نجات　　شکرِ خدا کہ وا درِ زنداں ہے ان دنوں

صحرائے عشق سے بھی گیا ہوں پرے نکل
درپیش مجھ کو اور ہی میداں ہے ان دنوں

اپنا مقامِ گورِ غریباں ہے ایک دن　　آخر وداعِ عالمِ امکاں ہے ایک دن

1۔ اعمیٰ : نابینا　　2۔ مختوم : مہر لگا ہوا　　3۔ ٹوم : زیور، موتی　　4۔ عبش : ضعفِ بصر

انساں کو چلتے پھرتے تو تم دیکھتے ہو آہ
گنجِ رواں یہ خاک میں پنہاں ہے ایک دن

دل دیا جس کو اسے وصل سے کچھ کام نہیں
اور مجھے وصل بن اس کے کہیں آرام نہیں
بس بس اتنا بھی نہ بڑھ چلیے، زباں کو تھامو
اہلِ عزت ہوں مجھے طاقتِ دشنام نہیں
اپنے مرنے کا نہیں غم یہی رونا ہے کہ ہائے
سفرِ مرگ کا ہم پاس سرانجام نہیں

و

324

رکھ نہ دینا تھا پس از مرگ کفن میں مجھ کو
باندھ رکھنا تھا نگاہوں کی رسن میں مجھ کو
رفت و آمد سے جو اس کوچے کے ہے کام مجھے
رنجِ غربت نظر آتا ہے وطن میں مجھ کو
شمع کی طرح اگر ہے یہی سوزِ دلِ زار
صبح تک پاؤ گے اک ڈھیر لگن میں مجھ کو
برقِ خاطف [1] سے نہیں کم بھی یہ ہستی کی چمک
محو کر دیتی ہے اک چشم زدن میں مجھ کو
کیا ہے منظور جو ساتھ اپنے لیے پھرتی ہے
نکہتِ زلف تری چین وختن میں مجھ کو
کام از بس کہ شکایت سے رہا ہے تیری
زہر لگتی ہے زباں اپنے دہن میں مجھ کو
کس نے بوسے لیے اس کے کہ نظر آئے ہے اب
رنگ کچھ اور ترے سیبِ ذقن میں مجھ کو
باغ میں جاؤں تو پھر دہشتِ دل کہتی ہے
باغباں جانے نہ دیوے گا چمن میں مجھ کو
مصحفی سمجھیں ہیں استاد سبھی خورد و بزرگ
اتنی توقیر تو ہے بزمِ سخن میں مجھ کو

1۔ خاطف : لے جانے والی۔ لغاتِ سعیدی میں لکھا ہے کہ بجلی آنکھوں کی روشنی لے جاتی ہے اس لیے اس کو برقِ خاطف کہتے ہیں۔

325

نام اب عشق کا لیویں گے نہ یاراں ہم تو
دے کے دل اس کو ہوئے سخت پشیماں ہم تو

فوجِ غم ہم پہ چڑھا لائی ہے آخرِ شبِ ہجر
اوّلِ شب ہی سے تھے جی میں ہراساں ہم تو

ضعف دیتا ہی نہیں رخصتِ گلگشتِ چمن
گھر میں بو رکھیں گے اب سنبل و ریحاں ہم تو

چھوڑ دیتے ہیں خدا پر ہی اسے آخرِ کار
اپنے بیمار کا کرتے نہیں درماں ہم تو

شبِ مہتاب کا اندیشہ نہ کر غیرتِ ماہ
اپنے گھر لاویں گے سب سے تجھے پنہاں ہم تو

جی نہ ہاریں گے جو مجنوں سے بھی آجائے گی بحث
مار رکھیں گے ترے عشق کا میداں ہم تو

باغباں، اس میں تو آزردہ جو ہوتا ہے تو ہو
گل سے ہونے کے نہیں دست و گریباں ہم تو

مر ہی جاویں گے ترے ہجر میں جاناں ہم تو
سچ تو یہ ہے نہیں ان صدموں کے شایاں ہم تو

گر خریدار ملے کوئی متاعِ دل کا
بیچ ڈالیں اسے ارزاں سے بھی ارزاں ہم تو

گر لگے ہاتھ یہ کہتے ہیں وہ دست رنگیں
پھونک دیں گے تجھے، اے آتشِ سوزاں، ہم تو

بارِ الٰہا تہِ دل سے ہے تُو سب کے آگاہ
موت مانگیں ہیں، نہیں زیست کے خواہاں ہم تو

اب کے گر فصلِ گل آئی تو پئے نذرِ جنوں
گل سے مانگیں گے نیا چاکِ گریباں ہم تو

کشتۂ دست حنائی کی ترے تربت پر
جاے گل آئے ہیں رکھ پنجۂ مرجاں ہم تو

ہیں نظر بازِ محبت، نہیں رکھتے دل میں
سرِ تاراجِ گل و غنچۂ خنداں ہم تو

باغباں، ہم سے تو آزردہ عبث ہوتا ہے
کرنے آئے ہیں فقط سیرِ گلستاں ہم تو

دامِ الفت میں ان آنکھوں نے پھنسایا ہم کو
ورنہ گرویدہ نہ تھے یار کے چنداں ہم تو

مصحفی جو ہو ترے دل میں وہ تو کر بھائی
شکلِ کافر پہ ہوئے اس کی مسلماں ہم تو

326

ٹوک ہر لحظہ نہ اے ابرِ بہاری، مجھ کو
زیب دیتی ہے مری گریہ و زاری مجھ کو

منزلِ عشق میں جی ہار گیا میں ایسا
کہ بہر گام ہوئی جان بھی بھاری مجھ کو

کہہ دیا ایک نظر تو بھی بہ حسرت کر لے
جس نے سکھلائی تری آئنہ داری مجھ کو

اس میں کرنا ہے غبارِ دلِ شوریدہ رقم
چاہیے کاغذ اُفسانِ غباری مجھ کو

خاکِ مجنوں سے بگولا جو کبھی اُٹھتا ہے
یاد آجاتی ہے لیلیٰ کی عماری مجھ کو

وعدۂ وصل پہ وہ سیم بدن گر آجائے
میں یہ جانوں کہ مِلا سیم قراری مجھ کو

جاؤں میں بزمِ امیراں میں روادار نہیں
دوست رکھتی ہے مری ذلت وخواری مجھ کو

برق آنکھوں کے تلے تا بہ سحر کوندا کی
کس نے دکھلائی تھی شب اپنی کٹاری مجھ کو

تو مرے قتل کو تلوار عبث سجتا ہے
تیری مژگاں ہی کی کافی ہے کٹاری مجھ کو

میں وہ تھا جو نہ کبھی طعنِ رقیباں سنتا
یوں جو چپ ہوں تو یہ خاطر ہے تمھاری مجھ کو

جوں صبا گردِ در و بام پھراتی ہے مدام
مصحفی الفتِ خوبانِ حصاری مجھ کو

327

سحر ہے کوچ، اسبابِ سفر تیار کر رکھو
سوارو پرتوں کو اپنے تم پُر بار کر رکھو

تمھاری بزم میں اک خار تھے بس ہم سو جاتے ہیں
جسے چاہو اسے اپنے گلے کا ہار کر رکھو

شبِ ہجراں میں آنکلے جو وہ تو آفریں بولے
کچھ ایسا کام تم، اے دیدۂ بیدار کر رکھو

کوئی عیار ہو تم بھی جو چاہو سامنے سب کے
نظر بازوں سے زلفوں میں نہاں رخسار کر رکھو

سحر نکلے گا سورج جھانکتا تم کو میں کہتا ہوں
ابھی سے بند اپنے رخنۂ دیوار کر رکھو

جہاں سے ایک دن آخر تو جانا ہے، خردمندو!
دل اپنا زندگی سے پہلے ہی بیزار کر رکھو

غریبوں پر تمھاری بھپکیاں چلتی ہیں، تب جانوں
اگر تم مجھ سے صیدی کا کبوتر مار کر رکھو

کرو میاں مصحفی شکوہ نہ چرخِ سفلہ پرور کا
کبھی اس کی تم اپنی طبع پر ہموار کر رکھو

328

کبھی کام آئیں گے، اپنا ہمیں تم یار کر رکھو مطیع و بندہ و منقاد و منّت بار کر رکھو
سراسر خوں میں ڈوبی ہے کہا تھا میں نے کب تم کو یہ رنگِ آستیں، اے دیدۂ خونبار، کر رکھو
کرو گے وعدہ وقتِ مرگ عاشق سے وفا شاید بھلا یوں ہی سہی پر آج کل اقرار کر رکھو
اسیرو، فصلِ گل آنے کی گلشن میں خبر پھر ہے رہا ہونے سے پہلے بال و پر تیّار کر رکھو
سر مذبوح عاشق کو نہ پاس آنے دو پانو کے قرینے سے اسے ٹک دور ٹھوکر مار کر رکھو
جو جاؤ سامنے غیروں کے بن ٹھن غم نہیں اس کا پر اپنی وضع میرے واسطے خونخوار کر رکھو
تمھاری اوٹ کا پردہ دم اپنا ناک میں لایا کہا تھا کس نے اس کو بیچ میں دیوار کر رکھو
بتاں سب قدر کرتے ہیں مرے گل خوردہ ہاتھوں کی شبِ وصل ان کو تم بھی تو گلے کا ہار کر رکھو
دکھانا ہے اسے کل داورِ محشر کو نقّاشو ورق اس شوخ کی تصویر کا تیّار کر رکھو

تامّل شرط ہے میاں مصحفی چوسر میں انساں کو
نہیں کچھ لطف جو تم داؤ بازی ہار کر رکھو

329

یاں جب کہ بن چکا مری تصویر کا گلو ظالم نے واں درست کیا تیر کا گلو
مجنوں کی طرح مجھ کو بھی کر قید پیر زن مشتاق ہے مرا بھی تو زنجیر کا گلو
گو جوئے شہد و شیر کے طالب ہوں تندرست اپنا تو تشنہ ہے تری شمشیر کا گلو
کشتہ ترا کہے ہے یہ مانی سے بعدِ قتل خاکے میں سرخ ہو مری تصویر کا گلو
اللہ رے نازکی کہ نہ ہرگز چھپا سکا یہ رنگِ پاں بھی اس بتِ بے پیر کا گلو
تیغِ رضائے حق پہ سبھی سر نہادہ ہیں ہے یاں بریدہ ماہیِ تقدیر کا گلو

کیا مصحفی میں سعی کروں روزگار میں
تقدیر گھونٹے ڈالے ہے تدبیر کا گلو

330

دو دن سے وہ شکل اپنی دکھاتا نہیں مجھ کو
اُس بن کسے دیکھوں، کوئی بھاتا نہیں مجھ کو

کیا جانیے کس کس کو میں یاں دی ہے اذیّت
مردہ بھی جو پہلو میں سلاتا نہیں مجھ کو

میں طالع خوابیدہ ہوں کس شخص کا یارب
جو آج تلک کوئی جگاتا نہیں مجھ کو

عاشق سے بھی ہوتا ہے کہیں صبر و تحمّل
وہ کام تُو کہتا ہے جو آتا نہیں مجھ کو

جنت کا میں بھولے سے کہیں نام لیا تھا
اِس ننگ سے دوزخ بھی جلاتا نہیں مجھ کو

کچھ صحبتِ لیلیٰ ہی کا مردود نہیں ہوں
مجنوں بھی تو پاس اپنے بٹھاتا نہیں مجھ کو

گردش میں مرا دورِ فلک ساتھ تو دیتا
پر کیا کرے بیچارہ کہ پاتا نہیں مجھ کو

یا زیست میں رہتا تھا ہم آغوشِ عزیزاں
یا ہاتھ بھی اب کوئی لگاتا نہیں مجھ کو

اے مصحفی اک طرفہ خطا مجھ سے ہوئی ہے
روٹھا ہوں میں جس سے وہ مناتا نہیں مجھ کو

331

اتنا تو صنم کوئی ستاتا نہیں مجھ کو
ہر دم کا ترا ناز خوش آتا نہیں مجھ کو

کیوں بزم میں اس شوخ کی جانے سے ڈروں میں
ایسا تو کوئی کھائے بھی جاتا نہیں مجھ کو

پروانے کو ہر شب ہے شبِ وصل میسّر
کب شمع پہ جل کر وہ جلاتا نہیں مجھ کو

وہ کون پری چہرہ ہے مجلس میں بتاں کی
جو تہمتِ نظارہ لگاتا نہیں مجھ کو

پرہیز ہے عاشق سے اسے اتنا کہ ہرگز
پردے میں بھی آواز سناتا نہیں مجھ کو

ہے شور قیامت کو بھی جاں دینے کا خطرہ
جو فتنہ سمجھ کر وہ جگاتا نہیں مجھ کو

تصویر کا میں کس کی ورق ہوں جو فلک سے
مانگے ہے سکندر تو دکھاتا نہیں مجھ کو

مجھ زار کے ہوتا ہے وہ جس وقت مقابل
آئینے میں جز مو نظر آتا نہیں مجھ کو

اے مصحفی دم ناک میں ہے اس کی ہٹوں سے
کب دن میں وہ سو بار رلاتا نہیں مجھ کو

332

پیار سے دیکھ رہے ہے جو رخِ قاتل کو
کچھ تو ملتا ہے مزہ تیغ تلے بسمل کو

کاتکی[1] کا وہ نہان اب کے ہے حیرت افزا
جس نے آینہ بنایا ہے رخِ ساحل کو

وقت بے وقت نہ یوں سامنے آیا کیجے
تم نے دیکھا نہیں، انے جان، کسی مائل کو

سارباں ساتھ نہ ہووے تو ابھی لیلیٰ کے
ناقہ جاتا ہے سوے نجد لیے محمل کو

ایک بھی آبلہ پانو میں تو ان کے نہ پڑا
کیوں کہ طے کر گئے یاران عدم منزل کو

آوَ غماز کے کہنے میں تم اتنا نہ چلو
کہ ستانا نہیں کچھ خوب کسی کے دل کو

دل بیتاب میں بجلی کی تڑپ ہے یارو
تم مری قبر پہ رکھنا کسی بھاری سل کو

مصحفی چین جو پایا ہے لحد میں پسِ مرگ
استخواں بھی مرے دیتے ہیں دعا قاتل کو

333

خون ناحق ہوں میں کیوں کہ وہ کھووے مجھ کو
رہوں گردن پہ میں دامن سے جو دھووے مجھ کو

اتنا بے کس ہوں کہ مانندِ چراغِ سرِ راہ
مر بھی جاؤں تو کوئی پیٹے نہ روے مجھ کو

روزِ مرگ اپنے وفات اس کی میں مانگوں ہوں کہ تا
ساتھ لے کنج لحد میں وہی سووے مجھ کو

اس قدر چشمِ خلائق میں سبک ہوں کہ اگر
ڈوبنے جاؤں تو پانی نہ ڈبووے مجھ کو

جو کلی شاخ پہ مرجھائے ہے پیٹے ہے صبا
دل کے مرجانے کا غم کیوں کہ نہ ہووے مجھ کو

نخل ہوں لالۂ خودرو کا میں اس صحرا میں
نہ کوئی سینچے کبھی، نے کوئی بووے مجھ کو

مصحفی نام کا تیرے ہے عقیقِ کندہ
ہے قسم تجھ کو جو تو ہاتھ سے کھووے مجھ کو

334

جو مجھ پہ ہو سو ہو پہ زیاں یار کا نہ ہو
نقصاں کسی طرح مرے دلدار کا نہ ہو

1۔ کاتکی کا نہان: کاتک (ساتواں ہندی مہینہ کارتک) پورن ماشی کا نہانا

آتی ہے کنج باغ سے آواز دل خراش — نالہ یہ مرغ تازہ گرفتار کا نہ ہو
گردش میں جس کی خاک رہے مثل گرد باد — شاکی وہ کیوں کہ چرخ جفا کار کا نہ ہو
آوے نہ بعد مرگ بھی مجھ کو لحد میں خواب — سایہ جو سر پہ یار کی دیوار کا نہ ہو
اس جنگجو کی ناوکِ مژگاں کے سامنے — ٹھہرے نہ ایک دم بھی جو مجھ سارکا[1] نہ ہو
سر زیرِ تیغ ہم کو بھی رکھنا نہیں دریغ — گو ہاتھ بند چرخ جفا کار کا نہ ہو
ہر برگِ گل ہے شعلۂ آتش سے ہم زباں — ڈرتا ہوں میں زیاں مری منقار کا نہ ہو
میری دوا میں ہاتھ بھی ڈالے نہ وہ طبیب — جس سے معالجہ مرے آزار کا نہ ہو
اے کشتہ، ضبط کیجیو اتنا بہ وقتِ ذبح — خنجر تو خوں میں تر مرے خونخوار کا نہ ہو

وہ کس مخر[2] متاع ہے یہ دل کہ مصحفی
سودے میں جس کے سود خریدار کا نہ ہو

335

نہ برقِ گل نے جلایا مکانِ بلبل کو — ہوا سے آگ لگی آشیانِ بلبل کو
وصیت اس کی زباں پر تھی رات کچھ دمِ نزع — سو باغباں بھی نہ سمجھا زبانِ بلبل کو
غضب تو یہ ہے کہ نازک دماغیِ گل سے — خروش کی نہیں رخصت فغانِ بلبل کو
تمام رات وہ مسکیں ترانہ سنج رہا — نہ گوشِ گل نے سنا داستانِ بلبل کو
شرار طور سے کم بھی نہیں یہ آتشِ عشق — جلا کے سرمہ کیا استخوانِ بلبل کو
کیا ہے دفن چمن میں تو یہ ثواب بھی لو — گلوں سے حاشیہ دو سائبانِ بلبل کو
یہ سحر چہرہ فروزی نے کیا کیا گل کی — کہ سی دیا لب معجز بیانِ بلبل کو
جو گل کو دیکھے مرے اور نہ دیکھے تو ہونٹھ ہال — ہر اک طرح کی مصیبت ہے جانِ بلبل کو

چمن میں چل کے کرائے مصحفی تو نالہ و آہ
جو جی چلا ہے ترا امتحانِ بلبل کو

1۔ مجھ سارکا : مجھ جیسا 2۔ کس مخر : جسے کوئی نہ خریدے

336

ہزار رنج سفر ہیں میانِ راہ ابھی تو
پڑی ہے منزلِ مقصود دور آہ ابھی تو

یہ کیا ہوا کہ لگا مجھ پہ پھر عذاب سا ہونے
خدا نے عفو کیے تھے مرے گناہ ابھی تو

نہ سمجھو نامۂ اعمال لکھ گیا ہوں میں سارا
مجھے ورق کے ورق کرنے ہیں سیاہ ابھی تو

نہ بے دماغ کو فرماؤ کام سمجھو تو صاحب
برونِ در بھی ہیں استادہ دادخواہ ابھی تو

جو دل کو چین ملے گا تو اس سے پوچھیں گے اب کے
تری تلاش میں پھرتے ہیں مہر و ماہ ابھی تو

میں مصحفی غزل اس انجمن میں اور پڑھوں کیا
کہ کم ہوا ہی نہیں شور واہ واہ ابھی تو

337

ساتھ لے جائے کہاں عشق کی رسوائی کو
گور بھی تنگ ملی ہے ترے سودائی کو

دل پر اک رنج سا ہے یہ نہیں معلوم مجھے
لے گیا کون مری تاب و توانائی کو

دیوے مجنوں کو کبھی ناقۂ لیلیٰ کا پتا
کوئی اتنا تو کہے آہوے صحرائی کو

رہ گیا دیکھ میں منہ زلفِ سیہ کا اس کی
اس نے جب باندھ لیا دستِ شکیبائی کو

مشق کرتا ہے بہت لیک بہاراں میں کبھی
مرغِ بستاں نہیں پاتا مری گویائی کو

دیکھنا خوب نہیں شعلہ عذاروں کا جمال
تابِ خورشید زیاں رکھّے ہیں بینائی کو

اپنے کوچے سے قدم پھر نہیں بڑھنے دیتی
حیرتِ حسن ترے پاے تماشائی کو

کیوں نہ اب خوار پھریں ہم سے ہی یہ چوک ہوئی
دل نہ دینا تھا ہمیں اس بتِ ہرجائی کو

مصحفی مجھ سے کچھ احوال تو اب اس کا نہ پوچھ
میں نے جس ظلم سے کاٹا شبِ تنہائی کو

338

بس اس قدر بھی دشمنِ شعر و سخن نہ ہو
اے خامُشی، سرک مری مُہرِ دہن نہ ہو

صیاد گر قفس کو مرے رکھ دے گُل کے پاس غیرت سے گرمِ زمزمہ مرغِ چمن نہ ہو
مانگوں ہوں یہ دعا کہ لگے دل سفر کے بیچ نکلوں اگر وطن سے تو شوقِ وطن نہ ہو
آجاویں اپنی شعبدہ بازی پہ گر کبھی ہم وہ کریں جو تجھ سے بھی چرخِ کہن، نہ ہو
خسرو کو قتلِ عاشقِ مسکیں کا قصد ہے چاہے ہے درمیاں میں مرے کوہ کن نہ ہو
کیا قہر ہے کہ اس کو سکھایا ہے نازِ حسن تم چال وہ چلو جو کسی کا چلن نہ ہو
ہر لحظہ آ کے طیش میں کوسے ہے اس طرح غصہ کبھی کسی پہ وہ شیریں دہن نہ ہو
زاغ و زغن ہوں لاشۂ عاشق سے طعمہ خور مر جائے یہ وہاں کہ جہاں گورکن نہ ہو

اے مصحفی تو اپنے مقدر پہ شاد رہ
آزاد کو یہ چاہیے فکر کفن نہ ہو

339

معشوق جس سے وصل کی شب ہم سخن نہ ہو کیونکر سپیدۂ سحر اس کا کفن نہ ہو
وہ زخم مانگتا ہوں تری تیغِ تیز کا جو روز حشر منھ پہ مرے خندہ زن نہ ہو
دیکھ آیینے میں عکس کو اپنے تو شوق سے پر دھیان رکھ دہن کے مقابل دہن نہ ہو
جاویں چبوترے میں وہ کیوں صبح دادخواہ ہمسائگاں پہ نالہ گر آتش فگن نہ ہو
کشتوں کو اس کے یوں ہی تہِ خاک سونپ دو کیا عیب ہے جو بہر شہیداں کفن نہ ہو
نومید ہم نشینیِ یاراں سے کیوں ہوا جا تو سہی، زمیں کے تلے انجمن نہ ہو
مُردے جو یاں سے جاتے ہیں ہو کر سپید پوش کچھ عیش کی زمیں کے تلے انجمن نہ ہو
بیخود ہے آج موجِ ہوا بوے خوش سے ہاے جُوڑے میں اس کے نافۂ مشکِ ختن نہ ہو
اتنا تو ہو کہ خواب میں آوے وہ شرمگیں تدبیر وصل تجھ سے جو چرخِ کہن نہ ہو
کچھ تو نشانِ عشق و جنوں چاہیے، دلا! ہو دھجیاں ہی تن پہ اگر پیرہن نہ ہو
تربت پہ میری پاے حنائی نہ رکھ میاں! کر رحم اب تو قبر میں آتش فگن نہ ہو

کیا مصحفی میں شعر و سخن پر لگاؤں جی
اس عہد میں جب اپنا کوئی ہم سخن نہ ہو

340

یا دن کو مرا تم غمِ جاں کاہ نکالو — یا رات کے رہنے ہی کی کچھ راہ نکالو
تو کون ہے چل دور، میں واقف نہیں تجھ سے — تم منھ سے نہ یہ بات تو ہر گاہ نکالو
کیا خاک مری زیست ہو، تم غصے میں آ کر — شمشیر مرے قتل کو ہر گاہ نکالو
ہو بادلہ[1] پوش آؤ سرِ بام چمک کر — تم اور ہی روپ اپنا شب ماہ نکالو
کیا قتل میں کچھ میرے تأمل ہے جو ہر دم — گہ میان میں تلوار کرو، گاہ نکالو
تب جانوں کہ نکلے گا مرے پانو کا کانٹا — تم دل سے مرے اپنی، اگر چاہ نکالو

ہجر اس کے میں تم پر جو گزر جائے گزر جائے
میاں مصحفی پر لب سے نہ تم آہ نکالو

341

سُوہا پہن آئے وہ جلانے مرے دل کو — اس رنگ لگے آگ لگانے مرے دل کو
نومید ہو گر ان سے میں گھر بیٹھ رہوں ہوں — تو خواب میں آتے ہیں ستانے مرے دل کو
پیری میں بھی جاتی ہی نہیں الفتِ خوباں — اک روگ دیا ہے یہ خدا نے مرے دل کو
چوری سے دبے پانو جو آ نکلے صنم تم — شاید کہ شب آئے تھے چرانے مرے دل کو
گر یوں ہی بتانے کے نہیں اپنا ٹھکانا — اک روز لگا دو گے ٹھکانے مرے دل کو
کتنے ہی ضماد اور طلا اس پہ لگائے — چنگا نہ کیا ایک دوا نے مرے دل کو
جوں غنچۂ گل پھاڑے ہے اپنا یہ گریباں — کیا کر دیا گلشن کی ہوا نے مرے دل کو
کیا لطف تھا آنے میں جو منظور تھا جانا — آتے ہی لگے تم تو کڑھانے مرے دل کو

1۔ بادلہ : سنہری کپڑا

تم آگ کو آئے تھے صنم میں نہ یہ سمجھا لے جاؤ گے آتش کے بہانے مرے دل کو
نزدیک ہیں ایامِ جنوں موسمِ گل ہے دو اب تو ذرا دھوم، مچانے مرے دل کو
نیک و بد عالم سے اسے کچھ نہیں مطلب آئینہ بنایا ہے صفا نے مرے دل کو
سو غنچۂ گل اس نے گلستاں میں کھلائے اور وا نہ کیا بادِ صبا نے مرے دل کو
اے مصحفی دُکھتا ہے یہ پھوڑے کی طرح ہائے
ہر لحظہ تو مت چھیڑ دِوانے مرے دل کو

342

جب تجھ سا ماہ چہرہ کسی کے دوچار ہو کیونکر نہ اس کا غارتِ صبر و قرار ہو
وہ آنکھ آرسی سے الٰہی دوچار ہو اس دم کہ اس میں آمدِ رنگِ خمار ہو
لیلیٰ کے قافلے میں، یہ ڈھونڈے ہے چشمِ قیس شاید کہ ملتفت کوئی محمل سوار ہو
ہر نجم شعلہ رنگ ہے خنجر لیے ہوئے بچنے کی کیا امید شبِ انتظار ہو
آیا ہے آج قبر پہ عاشق کی وہ صنم کیا حشر دیکھیے تہِ سنگِ مزار ہو
آہستہ پانو رکھ گلِ آدم ہے سب زمیں زیرِ قدم ترے نہ کسی کا مزار ہو
کرتا ہے آ کے خواب میں پھر تازہ وہ اسے کچھ کم جو حسرتِ دلِ امیدوار ہو
گر استخواں مرے نہ بنیں شمعِ بزمِ عیش بارے یہ داغِ دل تو چراغِ مزار ہو
ہم خاک ہو گئے ہیں تیری رہ میں کیا عجب چشمِ پری کا سرمہ ہمارا غبار ہو
بعد از فنا بھی ہم سے نہ جاوے گی سرکشی جاویں گے آسماں کی طرف ہم غبار ہو
وعدہ کیا جو اس نے نہ رکھتا تھا کچھ وہ اصل معشوق اس طرح کا نہ بے اعتبار ہو
خاکِ تنِ فسردۂ مجنوں کا شوق دیکھ دنبالِ ناقہ جاتی ہے دوڑی غبار ہو
اک شب کا واقعہ جو مرا وہ رقم کرے سرگرمِ نالہ کلکِ وقائع نگار ہو
چتون وہ چاہتی ہے مری چشمِ شوق کی تصویرِ حسن سے بھی نہ صحبت برار ہو

ہے حکمِ نازکیِ کمر باغباں سے یوں پھولوں کا جاہی جوہی کے تیّار ہار ہو
پیری میں کر رہا ہوں میں یہ نوجوانیاں کیا خاک امتیازِ خزان و بہار ہو
اوسان کھو دیے ہیں ترے حسنِ شوخ نے بے دست و پا نہ آئینۂ دستہ دار ہو
ہرگز وہ آنکھ مجھ کو نہ یا رب دکھائیو گردش میں جس کی گردشِ لیل و نہار ہو
رنگِ حنا کے کشتوں سے کہہ دیجو باغباں گل مہندی کی چمن میں جواب کے بہار ہو
باندھی ہے سرکشی پہ کمر قدِ یار نے
اے مصحفی نہ تجھ سے قیامت دو چار ہو

343

اے فلک! تو نہ ستا مجھ سے غضب مارے کو اور آوارہ نہ کر عشق کے آوارے کو
نہ لگا اس سے تو منہنال دمِ حقّہ کشی دوکھ[1] لگ جائے گا ورنہ ترے رخسارے کو
جو مسافر ہیں وہ سرکی میں بسر کرتے ہیں گھرِ گل وخشت کا کیا چاہیے بنجارے کو
صابروں کے تئیں اترے ہے بلا کی نعمت زکریا نے ہے کیا تن پہ قبول آرے کو
دل نہ سمجھو دلِ سوزاں کو کوئی، صانع نے رکھ دیا ہے مرے پہلو میں اک انگارے کو
کر کے جاسوسی خبر یار کی لا ہی دے گا میں نے چھوڑا تو ہے ادراک کے ہرکارے کو
کبک و طاؤس کی جب تجھ سے نہیں جاتی پیش چلنے لگتے ہیں تری چال ہی وہ ہارے کو
حسن بھی طرفہ مفتّن ہے کہ بازار سے روز ساتھ اک اپنے لگا لائے ہے لنگارے[2] کو
بے قراری سببِ حیرت مشتاقاں ہے پشتِ آئینہ پہ دیتے ہیں لگا پارے کو
وہ زمیندار کا لڑکا بھی بلا ہے کوئی سر پہ لایا ہے چڑھا میرے زمیندارے کو
دن جو ساون کے ہیں کوچے میں ترے پھرتے ہیں باغباں مہندی کے لادے ہوئے پشتارے کو
ہر کہیں رزق فریبندہ کا مت کھا تو فریب مچھلی وہ صید ہوئی آ جو لگی چارے کو
جس میں چشمک کا تری نکلے ہے انداز صنم میں شبِ ہجر میں تکتا ہوں اسی تارے کو

1۔ دوکھ : دوش، بہتان 2۔ لنگارا، لنگار : قطار

ایک دم باز انا الحق سے نہ منصور آیا　　دار پر چڑھ کے بھی لگایا اسی کیدارے کو

مصحفی عشق کی سرکار سے خدمت تو نہ مانگ
کام دیتا نہیں ہرگز کوئی ناکارے کو

344

مستعد رہتے ہیں شب چرخ پہ نظارے کو　　سچ ہے، ہے راہ جدی تجھ سے ہر اک تارے کو
لے گیا ضعف مری چشم سے نظارے کو　　یہ بلا پیش نہ آوے کسی بے چارے کو
نہیں معلوم ہے مقصود فلک کیا اس سے　　چرخ بر روز چڑھاتا ہے اک انگارے کو
روز و شب چرخ کی گردش نہ سمجھ بے موجب　　خواب اطفال سے مقصود ہے گہوارے کو
جلوۂ حسن سے ہے نالۂ گرمِ عاشق　　جس طرح سینکتے ہیں آگ پہ نقارے کو
روز یہ محکمۂ داد میں کھینچے ہے ہمیں　　ٹال سکتے نہیں ہم عشق کے ہرکارے کو

مصحفی عشق میں ہے ساتھ ترے فوجِ سرشک
خوف کچھ راہ کا ہوتا نہیں بنجارے کو

345

نہ پیارے اوپر اوپر مال ہر صبح و مسا چکّھو　　ہمارے پاس بھی اک رات تو سو کر مزا چکّھو
ملا دو دل کو اپنے دل سے میرے ایک ہو جاؤ　　بدن کو وصل کر دو لذتِ مہر و وفا چکّھو
کباب لختِ دل میرے نمک سود محبت ہیں　　تمھارے واسطے لایا ہوں سینے پر ذرا چکّھو
رکھو نوکِ زباں پر بھر کے انگلی خون سے میرے　　یہ میٹھا ہے کہ کڑوا ٹک تو اس کا ذائقا چکّھو

سحر خورشید لادے گر تمھارے سامنے گردا[1]
سمجھ کر مصحفی تم اس کو اپنا ناشتا، چکّھو

1۔ گردا : قلب

ہ

346

الجھا ہے گیسوؤں کے ترے بل سے آینہ
لیتا ہے روز درس ''مطوّل'' سے آینہ

اک دم جدا نہ ہو جب اس اچپل سے آینہ
تم ہی کہو کہ کیوں کہ رہے کل سے آینہ

جو اس کے روے صاف کو کہتا ہے مہر و ماہ
وہ دیکھتا ہے دیدۂ احول سے آینہ

تیرے قماشِ حسن کی نازک تنی کو دیکھ
حسن تراش مانگے ہے ململ سے آینہ

یہ شوقِ حسن چاہے ہے اس کا جدا نہ ہو
اک لحظہ ناز بالش مخمل سے آینہ

اس حسن صندلی کے نہیں جذب سے عجب
آوے نکل جو خانۂ صندل سے آینہ

جوہر نہیں چمکتے عرق اس کے منھ کا دیکھ
افشاں چنے ہے ماتھے پہ بھوڈل[1] سے آینہ

شب اس نگاہِ تند نے ٹکڑے کیا ہی تھا
کہتے ہیں بچ گیا بڑی کلول[2] سے آینہ

دیکھیں گے ہم نمد تری شیخی بروزِ حشر
نکلے گا جب فقیر کا کمبل سے آینہ

کہتے ہیں سادہ اس کو کہ گلزارِ حسن میں
واقف ہوا نہ پھول سے نے پھل سے آینہ

آئی نہ دل پہ مجلسِ احباب میں شکست
صد شکر بچ کے آیا یہ دنگل سے آینہ

ابروے یار دل شکنِ سادہ کا ہے یوں
توڑیں ہیں جیسے برف کا منجل[3] سے آینہ

پہلو میں جب سے یار کے اس کی جگہ ہوئی
خمیازہ کش ہے پہلوے ہیکل سے آینہ

اس رنگ خط منڈانے سے نکلا ہے روے یار
جس طرح صاف ہو کبھی صیقل سے آینہ

ہے جن مسافروں کا دلِ صاف نکتہ چیں
لاتے ہیں (گویا) شہر میں جنگل سے آینہ

گر دیکھنے گیا ترے کشتوں کی نعش کو
تو سرخ ہو کے آوے گا مقتل سے آینہ

اس بختِ تیرہ سے مرے دل کا ہے اضطراب
شعلہ بنے ہے برق کا بادل سے آینہ

1۔ بھوڈل : ابرک 2۔کلول : بدنصیبی 3۔منجل : درانتی

ہے کس کا انتظار اسے آج مصحفی
حیراں لگا کھڑا ہے جو سردل[1] سے آینہ

347

لپا ہو جو سب زنگ سے آینہ | تو تُو پاک کر سنگ سے آینہ
زہے نیم رنگی ابھی ہو گیا | گلابی ترے رنگ سے آینہ
دل اس کا تڑق کر جو ٹکڑے ہوا | رکا خانۂ تنگ سے آینہ
لڑاؤ گے تم عکس سے اپنی آنکھ | نہ واقف تھا اس جنگ سے آینہ

بتِ سادہ رو نے مرے مصحفی
نہ دیکھا کبھو ننگ سے آینہ

348

کیوں اطلسِ شفق کا نہ ہو جاوے تھان تہ | موباف میں جب اس کے ہوئسو ہامیان تہ
نالے نے میرے صور[2] جو پھونکی تو ہووے گا | مکتوب کی طرح سے زمین آسمان تہ
اس کا عجب نہیں ہے کہ جامے کا تیرے گھیر | یوسف کے پیرہن کی کرے عز و شان تہ
منہ اشک و آہ کا صفِ مژگاں سے پھر گیا | جوں فوج کا ہو وقتِ ہزیمت نشان تہ
آزادی چاہتا ہے تو کر ترک قیل و قال | چھُٹّی کے وقت کرتے ہیں لڑکے قران تہ
مقصود ہووے وصل وہ اک دل سے جلوہ گر | باور نہیں تو کر ورقِ توامان تہ
نوروز کا دن آنے دو، معلوم ہووے گی | بیضے کی آسماں کے دمِ امتحان تہ

بکواس سے تری مرا جی رک گیا، سرک
اے مصحفی کر اپنی کہیں داستان تہ

349

ڈھونڈنا دشوار ہے دریاے بے ساحل کی تہ | پائیں گے غوّاص[3] پھر کیونکر ہمارے دل کی تہ

1۔ سردل : چوکھٹ کی اوپر کی لکڑی 2۔اصل :سور 3۔اصل: غواس

اب جو کچھ آتا ہو تیرا مانگ لے پھر بعدِ مرگ
کھودنی ہووے گی مشکل قبرِ گل درگل کی تہ

تم ہی چوکے جو سنجافِ سرخ کا کھایا فریب
ٹک الٹ کر دیکھتی تھی دامنِ قاتل کی تہ

خونِ جوشاں ہے شہیدوں کے مزاروں سے جہاں
لالۂ بے داغ کا تختہ ہے واں ہر سل کی تہ

شست وشو نے فائدہ قاتل کو کچھ بخشا نہیں
اب تلک دامن پہ ہے خونِ سرِ بسمل کی تہ

شمع ساں جب جل بجھا تب مجھ پہ یہ روشن ہوا
تھی مرے پانو تلے جوں نقشِ پا منزل کی تہ

لب ہلے سو بار میرے گرچہ اس کے سامنے
تو بھی منعم نے نہ پائی مطلبِ سائل کی تہ

ہے نمایاں جامۂ شبنم سے صاف اس کا بدن
آبِ روشن میں نہیں چھپتی مہِ کامل کی تہ

قیس یہ چاہے تھا لیلیٰ پردگی بنتی و لے
اس قدر گاڑھی نہ ہوتی پردۂ محمل کی تہ

مصحفی اور اس زمیں میں وہ غزل لکھ سنگلاخ
حشر تک اکھڑے نہ جس کے معنیِ مشکل کی تہ

350

بسترِ خوں جس کا ہووے خنجرِ قاتل کی تہ
سچ تو یہ ہے سمجھے کیا وہ بے تہ اس بسمل کی تہ

پھاوڑے دو مار کے مجھ کو دبا دو زیرِ خاک
ہاتھ آوے گی نہ یارو دور ہے منزل کی تہ

صبح روشن ہے بیاضِ گردن اس کی زیرِ جعد
یا تہِ ابرِ سیہ ہے یہ مہِ کامل کی تہ

شاہد جی کو ہے کیا دل ہائے نالاں سے خبر
لاکھ زن گو لے رکھے ہے دامنِ محمل کی تہ

خامشی میں غنچۂ گل نے یہ کیا جادو کیا
جو صبا پر بھی نہیں کھلتی کچھ اس کے دل کی تہ

جب ترے کشتوں کی تربت سے اٹھایا روزِ حشر
خوں میں تھی ڈوبی ہوئی دو دو تسو[1] ہر سل کی تہ

پیکرِ انساں میں یہ پنہاں پری ہے یا ملک
کچھ تو کھولو ہم پہ تم اس پردۂ حائل کی تہ

ہم غریقوں ہی نے کچھ اس پر نہ ڈالا اپنا ہاتھ
ورنہ تھی ہر موج کے نیچے یہاں ساحل کی تہ

اس سے میں نوروز میں بیضے لڑائے مصحفی
اور وہ اس پر بھی نہ سمجھا عاشقِ مائل کی تہ

1۔ تسو: انگل (ایک پیمانہ)

351

خوبیِ حسنِ لالہ رنگ نہ پوچھ لعلِ لب کا بتاں کے ڈھنگ نہ پوچھ
صاف آتش میں کود پڑ، جل جا کچھ تو شعلے سے اے پتنگ نہ پوچھ
قتل کر جس کو تیرا جی چاہیے مجھ سے اے ترکِ خانہ جنگ نہ پوچھ
وصل کی شب ہوا میں شادیِ مرگ جی کی جی میں رہی امنگ نہ پوچھ
گل کی پتی پہ حرف ہے مجھ کو ہائے رنگِ گلِ فرنگ نہ پوچھ
مصحفی مثلِ برق چشمک زن
بد بلا ہے وہ شوخ و شنگ نہ پوچھ

352

نظر آیا جو کوئی خشک سحابِ سادہ رخِ خورشید کی سمجھا میں نقابِ سادہ
نہیں بے تہ تری آنکھوں کا حجابِ سادہ سرخ جالی بھی ہے اک زیرِ نقابِ سادہ
طفل جب تک کہ ہے امرد وہ حیا کرتا ہے تب تو مشہور ہے عالم میں حجابِ سادہ
حرف مٹ جاویں گے مصحف کے قیامت کے قریب جلد میں اپنی رہے گی یہ کتابِ سادہ
جس میں عالم ہی نہ ہو نشے کی رنگینی کا آبِ سادہ سے نہیں کم وہ شرابِ سادہ
قمقموں میں نہ کئی رنگ کی مے جب ہو بھری کیا مزہ ہولی میں دیوے یہ شرابِ سادہ
بے دماغی سے رہا شانۂ مجنوں نہ درست عرقِ بید ہوا اس کو گلابِ سادہ
ہاتھ مل مل کے ہوا موسمِ گرما میں تباہ دیکھ کر اس کے دوپٹے کا میں دابِ[1] سادہ
نہ ملی حسنِ برشتہ سے ہمیں لذتِ عشق اس نمک پر بھی تو نکلا وہ کبابِ سادہ
روتے روتے مری آنکھوں کی گئیں پتلی بہہ نظر آتی ہیں وہ اب جوں دو حبابِ سادہ
ہے سمن زار ترا سینہ صباحت سے صنم شب مہ کاش کہ دیکھے یہ شبابِ سادہ

1۔ داب : چھپائی ؟

مصحفی خاک جیوں جب کہ کرے یار بغیر
کام خنجر کا گلے پر مرے آبِ سادہ

353

اُس گل کی خموشی ہے تکلّم سے زیادہ — جنبیدنِ لب موجِ تبسّم سے زیادہ
داغِ جگرِ سوختہ میرے پسِ مُردن — چمکیں گے شبِ گور میں انجم سے زیادہ
گر میں نے چھوا اس کی کبھی زلف کی لٹ کو — نرمی میں وہ پائی فز و قاقم[1] سے زیادہ
ہر اشک کے قطرے کو مرے ہے یہی دعویٰ — پھیلاؤ میں اپنے ہوں میں قلزم سے زیادہ
بن چشم کے آئے ہوئے رہتا ہی نہیں اشک — اس طفل کو کچھ انس ہے مردم سے زیادہ
کر ذبح وہ ہنستا ہے کہ نغمہ مرے خوں کا — ہے آب رواں کے بھی ترنم سے زیادہ
دوزخ ہے مگر عشق کا آتش کدہ جس میں — انسان و حجر جلتے ہیں ہیزم[2] سے زیادہ
مستوں کا ہو گر بالشِ سر جام جہاں بیں — قدر اس کی نہیں خشتِ سرِ خم سے زیادہ

اے مصحفی مجلس میں وہ گل آج تو بارے
دیکھے ہے مجھے چشمِ ترحّم سے زیادہ

354

آئے تھے کوے یار میں جس آرزو کے ساتھ — آخر چلے جہاں سے اسی جستجو کے ساتھ
قربانیانِ عید کی ہمّت کا ہوں غلام — کرتے ہیں سر کٹا کے مروّت عدو کے ساتھ
بلبل نہ تیرے رخ کی لطافت پہ جان دے — گل کون سا ہے باغ میں اس رنگ و بو کے ساتھ
ساون کی راتیں اس کی ہی آواز دیں بڑھا — گاوے جو حور اس صنم خوش گلو کے ساتھ
پرچک[3] ہوئی ہے جب سے ترے تارِ زلف کی — کشتی رہے ہے زخم کو میرے رفو کے ساتھ
شبنم کا دانہ گل سے ہوا متّہم تو کیا — آخر تو وہ چمن سے گیا آبرو کے ساتھ

1۔ فز و قاقم: دو قیمتی ریشمی کپڑوں کے نام 2۔ ہیزم: ایندھن 3۔ پرچک: اشتعال

خونریز خلق پر ہے جو مائل بہارِ حسن　　بانکے پھریں ہیں سیکڑوں اس جنگجو کے ساتھ
کہتا ہے گر رقیب مجھے نیک و بد کہے　　کس کو دماغ بحث ہے اس ہرزہ گو کے ساتھ
کیوں میکدے سے جائے وہ باہر کہ مصحفی
بیعت ہے پیرِ جام کو دستِ سبو کے ساتھ

355

نہیں مجنونِ دور از بیگاہ　　آج ناقے کے گرد ہے ہمراہ
تیر آخر مرے لگا کے کہا　　اس کماں کش نے ''فی سبیل اللہ''
واں ہے شاخِ بلند پر میوہ　　یاں سو دستِ نگاہ بھی کوتاہ
میں نے دیکھی مزارِ سرمد پر　　قدِ آدم بلند سبز گیاہ
آرسی زلف سے ترے اے جاں　　پیش آتا ہے اس کے روزِ سیاہ
ہوں تو ملحد پہ عرض ہے یہ مری　　بہ جنابِ رسولؐ و حضرت شاہؑ
نزع کے دم زبان سے نکلے
مصحفی، لا الٰہ الاّ اللہ

356

سینے کا اٹھان اس کا ہے انجیر کا دانہ　　اور ناف سو خوبانیِ کشمیر کا دانہ
کس طرح سے طفلِ دلِ عاشق کو شفا ہو　　ڈھلتا ہی نہیں چیچکِ تقدیر کا دانہ
لٹکے ہے پڑا جائے دُرِ گوش زمرّد　　اللہ رے اس کافرِ بے پیر کا دانہ
دفعِ نظرِ بد کو تری آگ میں عاشق　　ڈالیں ہیں سپندِ دلِ دلگیر کا دانہ
ہرگز نہ ملے سخت طبیعت سے نتیجہ　　سرسبز نہ ہو خاک میں زنجیر کا دانہ
عصیاں کی خجالت کو کرے یاد جو زاہد　　پانی ہو ہر اک سبحۂ تذویر کا دانہ
روزی نہ ملی سنبلۂ چرخ سے مجھ کو　　کوئی نہ جھڑا خوشۂ تدبیر کا دانہ

قاتل نہ روا رکھ کہ شہیدوں کے لہو سے　　مونگا ہو ہر اک جوہرِ شمشیر کا دانہ
دل چاٹ پہ خالِ لبِ شیریں کے ہے عاشق　　یعنی یہ کبوتر کی ہے تسخیر کا دانہ
کیوں ہنس کے مانندِ درِ اشک میں چگتا　　ہوتا جو قفس میں مرے تقدیر کا دانہ
منقار نہیں کھولتے حیرت زدہ اس کے　　دیکھا نہ سنا طوطیِ تصویر کا دانہ
ہے شوقِ بناگوش ترا باغِ ارم کو　　رشکوک بنے کیوں کہ نہ ہر انجیر کا دانہ
گندم ہے وہ گندم ہے وہ گندم ہے وہ گندم　　باعث ہوا آدم کی جو تقصیر کا دانہ
اے مصحفی اس شخص کی کھانا نہ قبولی[1]
گرنے دے زمیں پر جو نہ کفگیر کا دانہ

357

صاف کر لے پہلے اپنا روزمرّا فاختہ　　کیجیو تب بلبلِ بستاں سے غرّا[2] فاختہ
سروِ باغِ حسن یعنی وہ دونالی تھی زلف　　کھا گئی خالِ سیہ سے جس کے چھرّا فاختہ
دیکھ کر خوش قد کو میرے بیٹھتے ہی سرو پر　　بال کو اپنے بناوے اس کا ارّا[3] فاختہ
سرد مہری سرو نے یہ کی کہ آخر ہوگئی　　گل کے اشکِ گرم میں اپنے محرّا[4] فاختہ
اُس نے درویشانہ پہنا کسوتِ خاکستری　　کر چکی جب سب مذاہب پر تبرّا فاختہ
کر لیا شمشاد نے طوقِ غلامی میں اسیر　　گل سے رکھتی تھی محبت ایک ذرّا فاختہ
مصحفی گر باغ میں آیا وہ سروِ شعلہ رو
جوں پرِ پروانہ خواہد سوخت ذرّا فاختہ

358

گوشت ہی باقی رہا تجھ میں نہ ذرّا فاختہ　　کس کے خالِ لب سے کھایا تو نے چھرّا فاختہ
بے دماغانِ چمن کرتے ہیں بحثِ صرف ونحو　　باز بے حرفی ہے غوغاے تو فرّا[5] فاختہ

1۔ قبولی : چنے کی دال کی کھچڑی　2۔ غرّا : غرور　3۔ ارّا : بظاہر ارّا یہاں آرا کے معنی میں استعمال ہوا ہے
4۔ محرّا : گرم، حرارت رکھنے والی؟　5۔ فرّا : ازہر؟

بر میں پہنے ہے وہ اپنے جامۂ خاکستری بس کہ ہے رنگِ تکلف سے معرّا فاختہ
نالہ حشر انگیز میرا بھی ہے اس گلزار میں کر نہ صورِ فاختہ پر اتنا غرّا فاختہ
گل ہیں سب نازک مزاج اور سرو بیکس بے دماغ دمبدم کُو کُو نہ کر اتنا نہ ٹرّا فاختہ
شانۂ شمشاد ہے مطلوب زلفِ یار کو چیر چوب اس کی، بنا بازو کو اڑا فاختہ
شستہ وصاف اس قدر اس کی زباں کس روز تھی
مصحفی سیکھ آئی (تیرا) روز مرّا فاختہ

چرخ و انجم ہی نہیں کرتے مروّت اپنے ساتھ کیوں نہ اما ماندے ہر دم نحوست اپنے ساتھ

ی

359

جس پاس کہ ہوں حرص کے سیماب کی بُوٹی[1] جنگل کی جڑی ڈھونڈے نہ تالاب کی بُوٹی
تب دیکھیو جب حسن نکالے گا وہ کم سن بیکل ہے ابھی لالۂ سیراب کی بُوٹی
پھلکاری کا لطف اس کی اگر دیکھیں تو ہرگز تارے نہ بنیں چادرِ مہتاب کی بُوٹی
مجھ سوختۂ عشق کی تربت سے نہ نکلی ساون میں بھی ہرگز گلِ شاداب کی بُوٹی
چادر وہ چڑھانا مری تربت پہ پس از مرگ ہوں جس میں بنی خنجرِ قصاب کی بُوٹی
نسّاجِ قضا کو مری گردش ہے جو منظور بُنتا ہے مرے جامے میں گرداب کی بُوٹی
اس بن بہ تصور بھی جو کھانے کو میں کھایا ناگن ہو مجھے ڈس گئی مشقاب کی بُوٹی
طاؤس بناتی ہیں ہر اک ران کی تیری کافر ترے پاجامۂ کمخواب کی بُوٹی
اب چشم میں عاشق کی کہاں خواب کہ تجھ بن جڑ پیڑ سے اکھڑی ہے رگِ خواب کی بُوٹی

1۔ ردیف بوٹی یا بوٹے؟ مطلع کے دوسرے مصرعے میں ''جڑی بوٹی'' کے پیش نظر بوٹی کو ترجیح دی گئی۔ اصل: بوٹی

پھرتا نہ سیہ بھنگری[1] کی خواہش میں مہوّس ملتی جو تری تیغ سیہ تاب کی بوٹی
ابرو نے تری تیغ اگر ان کو دکھائی چھاپیں گے نہ چھپے کبھی محراب کی بوٹی
اک لکھ کے غزل دوسری اب مجھ کو دکھادے
اے مصحفی تو نقشِ اصطرلاب کی بوٹی

360

ہے مردمکِ چشم تو کم خواب کی بوٹی اشک آب رواں پر ہے مرا آب کی بوٹی
آرائشِ ظالم ہے سدا خون کی چھینٹیں چھاپے میں نہیں جامۂ قصاب کی بوٹی
مسجود خلائق تو نہ ہو کیونکہ کہ ظالم ناخن زنِ دل ہیں ترے کم خواب کی بوٹی
فندق نے ترے ہاتھ کی خوب اس کو جھکایا لالے کی کلی تھی تری مِشقاب کی بوٹی
کھاتے ہوئے ناخن جو ترا اس کو لگا تھا لب چاٹے ہے اب تک تری مشقاب کی بوٹی
آہِ دلِ بیتاب کے عالم پہ نظر کر سیماب سے نکلی ہیں یہ سیماب کی بوٹی
مارے نہ ستاروں پہ شبِ ماہ میں چشمک جب ہووے مقیشی تری جلباب کی بوٹی
پاجامہ جو پہنے وہ تو اس نرم بدن کی لے ران میں چٹکی وونہی کم خواب کی بوٹی
کیونکر نہ کرے وہ دلِ بلبل کو شگفتہ ہو جس کی قبا پر گلِ شاداب کی بوٹی
مرزائی میں دیکھ اس کو نہ ہو کیوں کہ خنک دل ہے اولے کی بوٹی بھی مجھے آب کی بوٹی
ناخن کی خراش آئی ہیں از بس مرے تن پر ہر عضو سے گل کترے ہے محراب کی بوٹی
اے مصحفی ادریس تو ہے وقت کا اپنے
آتی ہے تجھے چھاپنی ہر باب کی بوٹی

361

بگوشِ یار گراں کیوں مری فغاں نہ لگے شبِ فراق میں تالو سے جب زباں نہ لگے

1۔ بنگری : بھنگری (کوئی دوا یا بوٹی)

زبس کسی کے بلائے ہوئے گئے وہ ادھر　زمیں سے مثلِ صبا پاے رفتگاں نہ لگے
تپِ فراق نے کب دل کو مضمحل نہ کیا　کب اس مریض کے بستر سے استخواں نہ لگے
سپندِ شب کو جلاتا ہے خوشۂ پرویں　کہ چشمِ بد تجھے اے فتنۂ زماں نہ لگے
رکھے ہے اس لیے اپنے وہ پشتِ پایۂ نگاہ　کہ آئینے سے مرے دل میں یہ سناں نہ لگے
سدا عذار کو اس کے جو گل سے دیں تشبیہ　ہمارا حرفِ سبک یار کو گراں نہ لگے
ہر ایک غنچۂ تہِ دل سے دے رہا ہے دعا　ہوا قفس کی تجھے مرغِ گلستاں نہ لگے
شبِ فراق میں کرتا ہے دل جو نالہ و آہ　یہ چاہتا ہے مری آنکھ یک زماں نہ لگے
حیاے عشق یہ چاہے ہے وصل کی شب بھی　کہ وقتِ بوسہ دہاں سے ترے دہاں نہ لگے
فسانۂ شبِ ہجراں سنے ہے خلق بہت　کسی کے گھر میں کہیں آگ ناگہاں نہ لگے
میں سرخرو ہی نہ ہوں حشر کو شہیدوں میں　جو مجھ پہ زخم ترا تیغِ امتحاں نہ لگے
تو بے نقاب جو اے گل چمن میں آ نکلے　بہار دیدۂ بلبل میں کیوں خزاں نہ لگے

عروج کر نہ سکے مصحفی یہ آہِ ضعیف
جو چرخ پر مرے نالے کی نردباں نہ لگے

362

وقتِ پیری ہوسِ عشقِ بتاں کیا کیجے　شرم آتی ہے اب اس منھ سے فغاں کیجے
خط نکالا ترے عارض نے نہ سمجھا اتنا　سورۂ نور کو پامالِ دخاں کیا کیجے
ہر نفس مشغلۂ آتشِ زرتشتی ہے　کچھ نہ پوچھو تپشِ دل کا بیاں کیا کیجے
مرگ نے ہم کو لکدمال[1] کیا یاروں کا　نقشِ پاسب کے ہیں تربت پہ گراں کیا کیجے
ہوسِ بوسۂ لب ہے تری اک مدت سے　دل سمجھتا نہیں، اے غنچہ دہاں، کیا کیجے
ہو گئے شوق کے مضمون تھے جتنے وہ تمام　تم کہو اب رقم اے نامہ براں کیا کیجے
بام سے اپنے وہ طالع ہوئے مانندِ سہیل　یہ نہ سمجھے کہ کسی جی کا زیاں کیا کیجے

1۔ لکدمال : پامال (لکد: لات)

نزع کے وقت بھی ہم شعر ہی کہتے لیکن
کام کرتی نہیں کچھ اب تو زباں کیا کیجے

تھے سبک مرگ سے چارہ نہ چلا کچھ اپنا
لے گئی ہم کو بہا خوابِ گراں کیا کیجے

یہ سمجھ کر کے کیا ترکِ محبت ہم نے
دوستداروں کو عبث دشمنِ جاں کیا کیجے

مرگ کے بعد بھی نرگس کی طرح تربت میں
بند ہوتی نہیں چشمِ نگراں کیا کیجے

کام آئی نہ علم داریِ اشجارِ بلند
لے گئی لوٹ چمن فوجِ خزاں کیا کیجے

مصحفی رازِ محبت کا چھپانا ہے عبث
جو نہاں ہو نہ سکے اس کو نہاں کیا کیجے

363

دل میں گر داغِ محبت چمن آرا ہووے
نکہتِ گل شررِ آہ سے پیدا ہووے

چشمِ عاشق کو تو ہے طاقتِ نظارہ کہاں
آپ اپنا تو مگر محوِ تماشا ہووے

خضر کو کوے محبت میں بھٹکتے دیکھا
اس سے پوچھو تو کہیں راہ نہ بھولا ہووے

آہ اے برقِ اجل پھونک دے اس خرمن کو
ڈھیر تا چند تمنا پہ تمنّا ہووے

ہر سحر روزنِ دیوار پہ ہے دیدۂ مہر
عشق بازی سے تری کیوں کہ نہ رسوا ہووے

گر ترے حسن کا ہو جاوے زمانہ حیراں
پھر نہ ہرگز کبھی اِمروز کا فردا ہووے

جوشِ خوں نے مجھے گلشن سے نکالا باہر
فصلِ گل میں نہ کسی شخص کو سودا ہووے

میں تو اک جز و محقّر ہوں و لے شہرتِ مرگ
چاہتی ہے کہ مری نعش پہ غوغا ہووے

عشق چاہے ہے کہ رسوا میں کروں عاشق کو
شرم کہتی ہے نہ اس بات کا چرچا ہووے

پانو ناقے کے گراں اٹھتے ہیں آج اے لیلیٰ
پسِ محمل کوئی واماندہ نہ آتا ہووے

اے صنم اس کو دکھا اپنی تو مسّی کی دھڑی
کبھی یہ روزِ سیہ جس نے نہ دیکھا ہووے

مصحفی میں تو تہی دست رہا، کیا حاصل
گو موے پر مرا دیوان مطلّا ہووے

364

ہر ایک عضو ترا خود ہے سیم بر چاندی
ضرور کیا ہے کہ لادے تو سیر بھر چاندی

چُرا کے دزدِ حنا اس کو خاک خوش ہوگا
کہ عطرداں میں نہیں تیرے اس قدر چاندی

جو چاہے خاتمِ انگشتِ خوبرو ہونا
گداز دے کے ذرا دل کی صاف کر چاندی

یہ جوشِ آتشِ غم سے نہ بےقرار ہیں اشک
کٹھالیوں میں گلاتی ہے چشمِ تر چاندی

لفافہ سادہ بھی لایا اگر تو واں سے تو میں
برابر اس کے تجھے دوں گا نامہ بر چاندی

حسد سے ووں ہی مہِ چاردہ کا رنگ اڑا
ہوئی جو شب ترے گلداں کی جلوہ گر چاندی

جبیں کا چاند بنے ہے تری اسی خاطر
کہ دیوے عاشقِ مفلس کو دردِ سر چاندی

یہ مجھ پہ خانہ آئینہ سے ہوا روشن
ہمیشہ ہووے ہے اہلِ صفا کا گھر چاندی

صفائے شعر کا عالم ہے مصحفی کچھ اَور
کہ سادہ کار ہی رکھتا ہے خوبتر چاندی

365

کوٹھے پہ آ کے تو جو بر و دوش کھول دے
کیوں ماہِ نو فلک پہ نہ آغوش کھول دے

خُم کا دہن نہ مے کا اگر جوش کھول دے
بند اس کا تو ہی رندِ سبو نوش کھول دے

کہتا ہے کون خُم کا تو سرپوش کھول دے
شیشے کا منہ تو ساقیِ مے نوش کھول دے

ڈوبے نہ کیوں کہ ورطۂ دریائے غم میں دل
ناف و شکم جو تو بتِ بےہوش کھول دے

صیاد، اتنا تنگ نہ رکھ مجھ اسیر کو
اک صبح تو چمن میں قفس پوش کھول دے

تو بتکدے میں جائے تو روحی فداک کہہ
تصویر دفعتًا لبِ خاموش کھول دے

کیا مغبچے نے دی ہے تجھے بھول اس کو تو
بازو کا نورتن مرے مینوش کھول دے

مہرے سے سر پٹک کے دونہی مار سرد ہو
کاکل کی وہ گرہ بہ سر و دوش کھول دے

بالے سے اس کی برق پڑے میری جان پر
مِعجر سے مصحفی جو وہ گل گوش کھول دے

366

زلفیں اٹھا کے رخ سے جو وہ گوش کھول دے
پردیں منہ اپنا صورت مدہوش کھول دے

آوے جو تیری شکل کی ساغر بہ کف ہو حور
مردہ مرا لحد میں بھی آغوش کھول دے

دوکانِ گل ہو تختہ جو آتے ہی باغ میں
بندِ قبا وہ سروِ قبا پوش کھول دے

چھڑکے ہے کون منہ پہ ترے دیکھ تو گلاب
آنکھیں ذرا تو اے دلِ بے ہوش، کھول دے

مستوں کو[1] انتظار کی طاقت نہیں رہی
ساقی خُمِ شراب کا سرپوش کھول دے

367

بوسے میں جو کلائی اس کی ہنسی سے کاٹی
اس نے بھی میری انگلی آہستگی سے کاٹی

مژگاں کو دیکھ اس کی مرغانِ سدرہ چونکے
اس لہر کی جرأت جب صانع نے جی سے کاٹی

اے باغباں، گنہ بھی ثابت کیا کچھ اس کا
سنبل کی چوٹی تو نے کیوں بے بسی سے کاٹی

اس کا خدا ہے شاہد، عاشق نے تیرے اے گل
کاٹی تو ہجر کی شب پر بے کلی سے کاٹی

مژگاں کا تک اشارہ اس کی ہوا جو اس کو
صیدِ حرم نے گردن اپنی چھری سے کاٹی

اتنے تو پودے اس کے بڑھ بھی گئے نہ تھے کچھ
بے درد باغباں نے مہندی ابھی سے کاٹی

کیا مصحفی بتا دیں ہم اس کا حال تجھ کو
عمرِ عزیز ہم نے جس بے کسی سے کاٹی

368

جب پشتِ دستِ حسرت ہم نے ابھی سے کاٹی
اوقات زندگی کی کیونکر کسی سے کاٹی

سادی سمجھ جو اس پر مانجھے کا پیچ آیا
ہم نے بھی بگلی[2] اس کی کیا تحفگی سے کاٹی

تیغِ زباں سے اس کی زخمی ہوئے ہزاروں
گاہے جو بات میری اس نے ہنسی سے کاٹی

پکڑے ہوئے کلیجا پھرتے ہیں اس پہ لاکھوں
آج اس نے تاپ تلی[3] کس کی چھری سے کاٹی

1۔ اصل : کی 2۔ بگلی : کوئی پتنگ؟ 3۔ تاپ تلی : بخار کے سبب بڑھی ہوئی تلی

پانی سے جو لبالب رہتی ہے چشمِ گریاں
یہ نہر مصحفی کیا میں گومتی سے کاٹی

369

ملے نہ خاک میں تنہا بدن فقیروں کے — ہزاروں دفن ہیں صندوق یاں امیروں کے
مٹائے دل سے مرے داغ ہم صفیروں کے — قفس میں ہمیں نے سنے زمزمے اسیروں کے
نہ تار تار ہے ابرِ سیہ میں برق اس شب — نشاں محک پہ ہوں جوں سونے کی لکیروں کے
وہ دن ہیں یاد کہ ہولی میں تیرے رخ پہ صنم — ملا کیا ہوں میں مٹھے سدا اُبیروں[1] کے
شبیہ کش نے دہن میں ترے رکھی ترجیع — بنائے لعل کے گر لب تو دانت ہیروں کے
مگر بہار گل آئی جو خود بخود صیّاد — قفس چمن کو اڑے جاتے ہیں اسیروں کے
سوادِ خط کا ترے نقشا کھنچ نہیں سکتا — قلم بناں سے گرے پڑتے ہیں دبیروں کے
جو کشتے تڑپیں ہیں ایک ایک تیر کھا کے ترا — انھیں پہ ہنستے ہیں سوفار تیرے تیروں کے
ملے فراق میں یاں تک تو میں کفِ افسوس — کہ نقش مٹ گئے سب ہاتھوں کی لکیروں کے

جہاں میں مصحفی وہ صاحبِ کرم نہ رہے
پتے جو پوچھنے والے تھے گوشہ گیروں کے

370

دکھلا دے ترا حسن جو جادو گری اپنی — صورت نہ سرا ہے کبھی ہرگز پری اپنی
آئینے میں کل دیکھ کے وہ عکس کو بولا — تو کیا ہے پری سے نہ ہوئی ہمسری اپنی
عاشق ہے مگر اس قدِ آزاد کی قمری — جو شکل بنا آئے ہے خاکستری اپنی
ہم آنکھ سے کیا اس کی لگے آنکھ چرانے — وہ تاڑ گیا جب نگہِ سرسری اپنی
عشوہ ہی مرے قتل سے بدنام نہ ہووے — غمزہ بھی تو دکھلائے بھلا کافری اپنی

1۔ ''اُبیر'' ہندی لفظ ہے اس کے معنی ابرک کے بُرادے کے ہیں ابیر اور عبیر دونوں لفظ ہیں۔ مگر یہاں پر ''اُبیر'' الف سے لکھا جائے گا۔ ع سے نہیں عبیر کے معنی خوشبودار پاؤڈر کے ہیں جو عربی لفظ ہے یہاں درکار نہیں۔

گر اب کہ بہار آئی تو اس موسمِ گل میں　　کچھ رنگ دکھاوے گی گریباں دری اپنی
آیا تھا وہ کرنے تری رفتار سے دعویٰ　　سو بھول گیا چال ہی کبکِ دری اپنی
قائل وہ کسی بات میں مجھ سے نہیں ہوتا　　منظور ہے یہ اس کو سخن پروری اپنی
اے مصحفی تیرا یہ جب اندازِ سخن ہو
کس طرح غزل تہ نہ کرے انوری اپنی

371

یاربن باغ سے ہم آتے ہیں دکھ پائے ہوئے　　اشک آنکھوں میں بھرے ہاتھ میں گل کھائے ہوئے
آنکھ سیدھی نہیں کرتا کہ مقابل ہو نگاہ　　آرسی ناز سے وہ دیکھے ہے شرمائے ہوئے
کس کے آنے کی خبر ہے جو چمن میں گلچیں　　جوں صبا چار طرف پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے
ہم تو ترسیں ہیں صنم اک نگہِ دور کو بھی　　بخت اُن کے ہیں جو مردم ترے ہمسایے ہوئے
حسنِ خجلت زدگی رنگ دکھاتا ہے نئے　　آرسی بھی اسے اب دیکھے ہے للچائے ہوئے
اس کے کوچے سے اٹھ آتے ہیں جو ہم دیوانے　　پھر انہی پانو چلے جاتے ہیں بولائے[1] ہوئے
مصحفی کیوں کہ عناں گیر ہو اس کا جوں برق
توسنِ ناز کو جب جائے وہ چمکائے ہوئے

372

طاقت گئی فغاں کی کوئی آہ کیا کرے　　کیا جانے رفتہ رفتہ تری چاہ کیا کرے
جانا اسے محال ہے بامِ وصال تک　　ہووے کمندِ آہ جو کوتاہ کیا کرے
وہ سوچ میں کہ سر سے ہو وا کیوں کہ یہ بلا　　میں منتظر کہ دیکھیے اللہ کیا کرے
مثلِ کتاں اڑیں ہیں گریباں کی دھجیاں　　اس سے زیادہ ظلم شبِ ماہ کیا کرے
کانٹا سا کر دیا ہے سُکھا مجھ نحیف کو　　اب آگے دیکھیے غمِ جانکاہ کیا کرے
گرما میں سائبانِ درخت اس کو چاہیے　　مفلس تلاشِ خیمہ و خرگاہ کیا کرے

1۔ بولانا : پاگل ہونا

جب ہو نہ وصلِ یار مقدر تو مصحفی
طوفِ مزار و مرقد و درگاہ کیا کرے

373

نہ ہوا شاد دل اپنا تو گلستاں میں کبھی — توڑ کر گل نہ رکھے ہم نے گریباں میں کبھی
کوفت یہ دل نے اٹھائی کہ نہ ٹھہرے آنسو — یاد آئی جو تری موسمِ باراں میں کبھی
ہے جہاں خانۂ تاریک نہ دیکھی ہم نے — روشنی شمع کی اس تیرہ شبستاں میں کبھی
پنجۂ شانہ کو ڈالوں گا میں جھنجلا کے مروڑ — جا پڑا ہاتھ گر اس زلفِ پریشاں میں کبھی
منھ چھپانے نے ترے اب کے رجھایا ہم کو — نہ ملا تھا یہ مزہ حسرت و حرماں میں کبھی
ہے بگولے کی طرح خاک مری سرگشتہ — کوہ و برزن[1] میں کبھی، کوہ و بیاباں میں کبھی
بس کہ ظلمت میں گرفتار رہا گھر پہ مرے — ہائے بجلی بھی نہ چمکی شبِ ہجراں میں کبھی
زلف اس رخ سے سرکتی ہی نہیں اک ساعت — یہ ملاقات نہ تھی گبر و مسلماں میں کبھی
اب کے کیا جانے یہ آزار ہوا ہے کیسا — تھا نہ عیسیٰ کو تأمل مرے درماں میں کبھی
حسن کے رعب کا عالم ہی نرالا دیکھا — اشک یوں خشک ہوئے تھے بُنِ مژگاں میں کبھی
آنکھ کے لگتے ہی دیتا ہے کوئی مجھ کو جھنک — خوابِ غفلت میں کبھی خوابِ پریشاں میں کبھی
سرمۂ چشمِ بتاں پیشِ نظر تھا اپنے — سیر کرتا تھا میں بازارِ صفاہاں میں کبھی
آہ کس وصل کے کشتے کو کیا تو نے شکار — آج تک خوں نہ لگا تھا ترے پیکاں میں کبھی
شاید آیا ہے اسیروں میں کوئی تازہ اسیر — اس قدر شور نہ تھا خانۂ زنداں میں کبھی
آہ ایسا تو ہمیں بھول گئی اے وحشت — چوکڑی ہم بھی تو بھرتے تھے غزالاں میں کبھی

مصحفی جب سے میں اُس غنچہ دہن سے ہوں جدا
آشتی میں نے نہ دیکھی لب و دنداں میں کبھی

1۔ برزن : صحرا

374

از بس ستم گری پہ دلِ یار گرم ہے ہر گام پر اگلنے میں تلوار گرم ہے
کوچے میں اس کے تابِ خورشید حسن ہے بیٹھوں کہاں کہ سایۂ دیوار گرم ہے
شعلہ بنا دیا ہے مجھے فکرِ شعر نے جوشِ دماغ سے سر و دستار گرم ہے
مرغِ چمن کی موت تو آئی نہیں کہیں بوسے پہ برگِ گل کی جو منقار گرم ہے
کیا آمدِ بہار کی اس نے خبر سنی جی دینے پر جو مرغِ گرفتار گرم ہے
آتش رہے ہے اس کے قفس میں جو زیرِ پا زنجیر پائے مرغِ گرفتار گرم ہے
باقی ہے بس کہ نالہ و فریاد کا اثر اب تک ہوائے دامنِ کہسار گرم ہے
نظارہ بازِ حسن کی جھپکے ہے کوئی آنکھ ہر چند آفتابِ رخِ یار گرم ہے
سوادِ متاعِ حسن کا ہووے تو تو نہ چوک جی تک لگانے پر تو خریدار گرم ہے
سسکے ہے اک طرف، کوئی تڑپے ہے اک طرف اس کُو میں کشت و خون کا بازار گرم ہے
شب ہائے ہجر آنکھ جو میری لگی نہیں بدخوابیوں سے دیدۂ بیدار گرم ہے
جاتا ہے مثلِ برق یہ سرپٹ اُڑا ہوا کتنی سمندِ عمر کی رفتار گرم ہے
آہوں نے[1] گھر کو خانۂ حمام کر دیا رکھتا ہوں ہاتھ جس پہ وہ دیوار گرم ہے
بلبل کی اس پہ کیا نگہِ گرم پڑ گئی ہر برگِ گل کا (آج) جو رخسار گرم ہے
کیونکر نہ دوستوں کو پڑے زیست کا گماں بعد از فنا بھی تپ سے تنِ زار گرم ہے

رکھ مصحفی ہمیشہ تو تبرید کا خیال
کہتے ہیں عشق جس کو یہ آزار گرم ہے

375

گر حور بھی عالم یہ ترے حسن کا دیکھے چٹ چٹ لے بلائیں وہیں سو بار دو دستی

1۔ اصل: کے

رسوائیِ عاشق سے تو واقف نہ ہوا اور یاں بج گئی تالی سرِ بازار دو دستی
بوسے کا سخن منہ سے مرے نکلے تو ووں ہی عارض پہ طمانچوں کی پڑے مار دو دستی
مثلِ گلِ بازی ہوں میں سیلی خورِ خوباں لڑکوں سے مجھے پہنچے ہے آزار دو دستی
کوٹوں نہ شبِ ہجر میں کس طرح سے زانو طبلوں میں تو ہوتی نہیں بیکار دو دستی
یہ حزم[1] کا عالم ہے کہ اب عکس سے اپنے منہ ڈھانپے ہے شرما کے وہ عیّار دو دستی
تکلیف ہمیں ضعف نے دی سیرِ چمن کی جب لٹ گئی سب حسن کی گلزار دو دستی
ہے قتل کا وعدہ جو سحر سوچ میں عاشق سر پکڑے ہوئے بیٹھے ہیں ناچار دو دستی
جوں مردمِ بنگالہ ترے کشتے کے غم میں ہیں سینہ زناں صد جگر افگار دو دستی
دے خصم کو تالی کہ پئے دفعِ نحوست آواز پہ ہے چغد کی درکار دو دستی
اے مصحفی گر میں یہ غزل ان کو سناؤں
مل وجد کریں کافر و دیندار دو دستی

376

گر یہ آہوں کا دھواں گنبدِ گرداں بن جائے سائبان دگر از بہرِ شہیداں بن جائے
تیر و شمشیر کے زخم اس نے لگائے کہ مرا چاند تارے کا دوپٹا تنِ عریاں بن جائے
اس کی تصویر ہی کھنچوا کے کوئی لا دو مجھے کسی صورت سے مرا کام تو یاراں بن جائے
بے قراری میں ملے چین دلِ عاشق کو عشق چاہے تو ابھی درد بھی درماں بن جائے
روٹھ جانا تو ترا مجھ پہ قیامت لایا ہے غضب وصل کی شب یوں شبِ ہجراں بن جائے
کہہ لوں دو بات تصور سے ترے میں دل کی کاش دو چار گھڑی کو وہی مہماں بن جائے
گلشنِ دہر کے معشوق کا میں بندہ ہوں ہاتھ اگر سیب پہ ڈالوں تو زنخداں بن جائے
گل فشاں ہوویں جو واں ناقۂ لیلیٰ کے قدم چند روزے تو بھلا نجد گلستاں بن جائے

حزم: احتیاط

مصحفی میں تو تماشے کے لیے آیا تھا
کیا کروں پر جو چمن جنگ کا میداں بن جائے

377

دشمنِ دین و دل و جان نہ ہو اتنا بھی آدمی درپئے انسان نہ ہو اتنا بھی
غنچہ کر وقتِ سحر نیم تبسّم بولا کیا مرا چاک گریبان نہ ہو اتنا بھی
نگہِ بازپسیں کی ہو ہوس، چاہوں ہوں دلِ کم بخت میں ارمان نہ ہو اتنا بھی
خار و خس بسترِ دیبا و گلِ بالیں اشک کیا شبِ وصل کا سامان نہ ہو اتنا بھی
حالتِ عاشقِ شوریدہ ہے عبرت کی جگہ کوئی دنیا میں پریشان نہ ہو اتنا بھی
کیا کہوں کیسی خرابی میں ہوں میں یار بغیر گھر کسی شخص کا سنسان نہ ہو اتنا بھی
اپنی طاقت پہ دلا کر تو نظر جانے دے پیچھے اس شوخ کے حیران نہ ہو اتنا بھی

مصحفی دل کوئی ہرجائی کو دیتا ہے میاں
جان اور بوجھ کے نادان نہ ہو اتنا بھی

378

قطرہ گر اس گل کے روے عرق فشاں سے گر پڑے دفعتاً سورج زمیں پر آسماں سے گر پڑے
باغ سے جانے لگا جس دم وہ رشکِ نوبہار اشکِ حسرت ووں ہی چشمِ باغباں سے گر پڑے
اے صبا آہستہ چل گلشن میں از بہرِ خدا بیضۂ بلبل نہ کوئی آشیاں سے گر پڑے
کر تعرج اشک پھر مژگاں سے یوں "غلطاں" ہوا جس طرح چڑھنے میں لڑکا نردباں سے گر پڑے
عطسہ[1] گر لیوے ترا بیمار اتنا ہے ضعیف ساتھ عطسے کے وہیں مغز استخواں سے گر پڑے
ضعف نے تب رخصتِ سیرِ چمن دی مجھ کو آہ جب ہزاروں نخلِ گل بادِ خزاں سے گر پڑے
کر دکھاوے معجز اپنا چشم کی گردش تری ساغرِ مے بزم میں دستِ مغاں سے گر پڑے

1۔ عطسہ: چھینک

تیغ ابرو کا کروں مذکور گر اس شوخ کی ہے یقیں ووں ہی زباں کٹ کر دہاں سے گر پڑے
پیش قدمی جو کرے کوچے میں اس کے مجھ سے کاش کھا کے ٹھوکر ووں ہی سنگِ آستاں سے گر پڑے
گریۂ سرشار نے آنسو بہائے یوں مرے مے چھلک کر جس طرح رطلِ گراں سے گر پڑے
کیا عجب ہے مصحفی اس کا جو پیش از روزِ حشر
گنبدِ گردوں مرے شورِ فغاں سے گر پڑے

379

شبِ ہجر صحرائے ظلمات نکلی میں جب آنکھ کھولی بہت رات نکلی
مجھے گالیاں دے گیا وہ صریحاً مرے منھ سے ہرگز نہ کچھ بات نکلی
ہوا وادیِ قتل صحرائے محشر مری نعش جب روزِ میقات[1] نکلی
کمی کر گیا نازِ پنہاں کا خنجر نہ جاں تیرے بسمل کی ہیہات نکلی
تو اے مصحفی اب تو گرمِ سخن ہو
شب آئیں دراز اور برسات نکلی

380

لیلیٰ شاید سرِ پا اس کو لگا آتی ہے بیدِ مجنوں سے مجھے بوے حنا آتی ہے
کوے قاتل کی طرف کب ہے گزر ہر اک کا وہی جاتا ہے وہاں جس کی قضا آتی ہے
خفتۂ خاک بھی گویا ہیں جو تُو کان رکھے اب تلک ساز خموشی سے صدا آتی ہے
شاہدِ حی کی جہاں قبر ہے جا کر اس جا روحِ مجنوں عجب اک دھوم مچا آتی ہے
بس کہ حق کو نہیں ویرانیِ عالم منظور باری باری اجلِ شاہ و گدا آتی ہے
واں سے چلتی ہے خطوں کا جو صبا لے کے جواب میرے مکتوب کو رستے میں گرا آتی ہے
اے اسیرانِ قفس صبر بھی لازم ہے تمھیں اتنا پھڑکو نہ کوئی دم میں صبا آتی ہے

1۔ میقات: وعدے کا دن، مراد روزِ قیامت

صدقے اس شرم کے ہوتی نہیں آنکھیں اونچی آرسی دیکھتے بھی اس کو حیا آتی ہے
قصرِ تن پر نہ ہو مغرور کہ ڈھانے کو اسے شکل پیری میں چلی سیلِ فنا آتی ہے
مصحفی دردِ محبت سے ہے آگاہ وہی
سر پہ جس کے شبِ ہجراں کو بلا آتی ہے

381

عاشق وہی بس عشق میں جو جان لگا دے اور روز و شب اس کی ہی طرف دھیان لگا دے
سینہ مرے سینے سے تو اے جان لگا دے یا لب سے لب اپنے کسی عنوان لگا دے
دردِ دلِ عاشق کو ابھی ہوتی ہے تسکیں تو ہاتھ سے اپنے جو اسے پان لگا دے
چل ڈوبتے سورج کو دلا اس کی گلی میں پھاٹک نہ سرِ شام سے دربان لگا دے
پھر ہار کا اور جیت کا اندیشہ نہ رکھے جی داوِ محبت میں جب انسان لگا دے
ڈیوڑھی میں نہ پٹ بھیڑ کے کر غیر سے باتیں ایسا نہ ہو واں اپنے کوئی کان لگا دے
چوری کی نگاہوں سے نہ دیکھ اس کو تو اے دل کچھ تیری نظر تجھ کو نہ بہتان لگا دے
آتی ہے ہوا سردِ گلستاں کی طرف سے اٹھ کر تو ہی دروازہ مری جان لگا دے
ہے مصحفی وہ شخص جو آوے اسے ٹوٹا
تنخواہ میں نوکر کو یہ دیوان لگا دے

382

سر کاٹ کر مرا جو وہ بے پیر پھینک دے لازم ہے وون ہی ہاتھ سے شمشیر پھینک دے
آیا ہوں پھرتے پھرتے غنیمت سمجھ مجھے کیا جانے پھر کدھر مجھے تقدیر پھینک دے
اے عشق تیر نالہ ترا مونج [1] ہو گیا کس کام کا رہا ہے تو یہ تیر پھینک دے
جوں برگِ گل سبک ہے مرا جسمِ ناتواں چاہے جدھر کو رنگ کے تغیّر پھینک دے

1۔ مونج: گھاس پھوس؟

مانی کی تیرے حسن پہ جس دم پڑی نظر   یوسف کی لے کے ہاتھ میں تصویر پھینک دے
حلقے جو تیری زلف کے اس کو پسند آئیں   پانو سے قیس اتار کے زنجیر پھینک دے
میری غزل کا حسن جو دیکھے تو مصحفی
مانی بناں سے خامۂ تحریر پھینک دے

383

ہم تو چمکتے ہی ہوا ہو گئے   مثلِ شرر دم میں فنا ہو گئے
مجلسِ ہستی میں جو آئے تھے یار   یہ نہیں معلوم وہ کیا ہو گئے
رشک ہے اوقات پر ان کی مجھے   موسم گل میں جو رِہا ہو گئے
سیرِ چمن کی نہ دلا ہم کو یاد   وہ بھی دن اے بادِ صبا ہو گئے
گریے سے کم دردِ دل اپنا ہوا   اشک کے قطرے ہی دوا ہو گئے
آئینہ خانے میں وہ جس دم گیا   آئینے خورشید نما ہو گئے
طبع میں مضمر ہے وہی رنگ طبع   خشک ہو گو سودہ حنا ہو گئے
گریے کی جا ہے کہ یہ اہلِ قبور   کیسے عزیزوں سے جدا ہو گئے
جی گئے اس چال پہ اے خوش خرام   کبک خراموں کے فدا ہو گئے
دیکھتے ہی ہوش و خرد، صبر و تاب   کیا کہیں ہم تجھ سے کہ کیا ہو گئے
مصحفی آیا جو وہ کل بزم میں
اپنے تو اوسان خطا ہو گئے

384

دیکھ اس نے مجھے دور سے شمشیر نکالی   "کیوں سامنے آیا تھا" یہ تقصیر نکالی
مانی نے یہ اعجاز کیا چہرہ کشی میں   ہنستے ہوئے رخ کی ترے تصویر نکالی
صیاد نے تارِ رگِ گل پانو میں باندھے   بلبل کے لیے زور یہ زنجیر نکالی

زندانیِ الفت نے رکھی تیغ گلے پر زنداں سے نکلنے کی یہ تدبیر نکالی
مجرم تو میں تھا پر گنہِ عشق کی میرے کچھ سوچ کے قاضی نے یہ تعذیر نکالی
گیرائی کا بندہ ہوں مرے زخم سے اس نے پیکاں نہ نکلا جو نئی تیر نکالی
رانجھا کے تصور سے بھی سوئی نہ لپٹ کر تو نے ہوسِ دل نہ کچھ اے ہیر نکالی
مذکور پہ سنبل کے مرے دشمنِ جاں نے چہرے سے وونہی زلفِ گرہ گیر نکالی
کاغذ مرے نامے کا لگا ہاتھ جو اس کے پڑھ کر وونہی ہر بات میں تقریر نکالی
رسوائیِ الفت کا برا ہووے کہ اس نے میّت مری اس کُو سے بہ تشہیر نکالی
اے مصحفی مانی نے قلم ہاتھ سے رکھا
اس خط نے جو رخسار پہ تحریر نکالی

385

دمِ شمشیر پر اس جو خوں عاشق کا ٹھہرا ہے تأمل کیوں ہوا اس کو مگر یہ گھاٹ[1] گہرا ہے
نہ اہلِ دہر سے مل عقل سے گر تجھ کو بہرا ہے کہ ان کی چشم دل اندھی ہے گوشِ ہوش بہرا ہے
بتاں کرتے ہیں سیرِ باغ اور عشاق جلتے ہیں جو ان کو شب دوالی ہے تو اُن کو دن دسہرا ہے
صبا گلشن میں مذکورِ دہانِ تنگ پر اس کے تبسّم کر سکے گل کی کلی یہ اس کا زہرا ہے
مگر اس کو لڑائی ہے دورنگی سے زمانے کی پتنگ جو اس نے اڑوایا ہے کہتے ہیں گلہرا[2] ہے
مری اور اس کی کشتی ہووے گی اک دن برابر کی نہیں کچھ میں بھی بھاری گر بدن اس کا چھرہرا ہے
نزاعِ لفظیِ یارانِ مجلس سے معاذ اللہ! وہی کچھ خوب سمجھے ہے جو گونگا اور بہرا ہے
صفا کس طرح ہوا اے مصحفی رخشِ طبیعت کی
کہ ہے سائیس بیمار اور نہ ہتھی نے کھر ہرا ہے

1۔ گھاٹ: تلوار کی دھار کا اوپر کا حصہ۔ تلوار کا وہ حصہ جہاں سے اس کا ڈھال شروع ہوتا ہے نیز دریا کا کنارہ۔
2۔ گلہرا: دھاری دار

386

مقابل ہوویں اس کے مہر و مہ کا کب یہ زہرا ہے
مگر دل سنگ کر کے اک ذرا آئینہ ٹھہرا ہے

عجب ان خفتگانِ خاک کی ہے نیند بے کھٹکے
پڑے آرام سے سوتے ہیں چوکی ہے نہ پہرا ہے

ہوا میں کانپنا خورشیدِ تاباں کا نہیں بے جا
یہ نیزے کا ہماری آہ کے گویا پھرہرا ہے

نہیں اک لحظہ امکانِ توقف بے قراروں کو
بتا دیوے کوئی کب آسماں گردش سے ٹھہرا ہے

کبھی آتا ہے آنسو اور کبھی ہوتا ہے جذب اس میں
یہ میری چشم کی پُتلی کھڑی ہے یا بجہرا[1] ہے

نہیں پایاب دریا اشک کا اے مردمِ دیدہ
کہیں غوطے نہ کھاؤ تم کہ پانی اس میں گہرا ہے

لباسِ سندروسی[2] اس نے پہنا ہے خدا جانے
ہوا کا رنگ جو اپنی نظر میں کچھ سنہرا ہے

نہیں سنتا کبھی اے مصحفی فریادِ مظلوماں
ہمارے بھائیں[3] تو پیرِ فلک گویا کہ بہرا ہے

387

خواہشِ زخمِ دگر پھر دلِ افگار میں ہے
ہم تو سمجھے تھے کہ برّش تری تلوار میں ہے

اس کے کہتا ہے دمِ ذبح یہی کشتۂ ظلم
کیا صنم رحم بھی تیرے دلِ خونخوار میں ہے

طائرِ نامہ بر اس شوخ نے کس کا مارا
سرخیِ خونِ کبوتر لبِ سوفار میں ہے

مُو قلم سے نہیں مانی کے رقم ہو سکتی
کچھ نزاکت سی نزاکت کمرِ یار میں ہے

اتنی تندی سے نہ چلیو تو صبا بہرِ خدا
کاغذِ نامہ مرا رخنۂ دیوار میں ہے

مرضِ عشق کی صحت کے نہیں ہیں خواہاں
ہم ہیں عاشق ہمیں آرام اسی آزار میں ہے

اس کو منظور اجل کا ہے مگر استقبال
اتنی سرعت جو مری نبض کی رفتار میں ہے

ساتھ سرمے کے لیے سیکڑوں دل اس نے لگا
دیکھیو کتنی لگاوٹ نگہِ یار میں ہے

پیچھے جالی کے خراماں کوئی پھرتا ہے مگر
کچھ چمک اور ہی ہر رخنۂ دیوار میں ہے

1۔ بجہرا: زرد شفاف، مثلِ کہربا   2۔ سندروسی؟   3۔ ہمارے بھائیں، ہمارے بھاویں: ہمارے نزدیک

تو جو سیٹی سی بجاتی ہے چمن میں بلبل
برگِ گل زیرِ زباں کیا تری منقار میں ہے

مصحفی ایک غزل اور بھی دلچسپ سی پڑھ
لذتِ قندِ مکرّر تری گفتار میں ہے

388

کس کی مژگاں کی انی سینۂ افگار میں ہے
دمبدم خار سا چبھتا جو دلِ زار میں ہے

دے نہ اے عشق مجھے نالہ کشی کی تکلیف
صبر کر برگِ گلِ تر مری منقار میں ہے

پانو جاتے ہیں کھنچے کوچۂ جاناں کی طرف
جان دینا جو مقدر قدمِ یار میں ہے

اس کے پانو کی دھمک نے تو ہمیں ٹھور[1] رکھا
اچپلاہٹ یہ کہاں کبک کی رفتار میں ہے

دشتِ مجنوں کی مسافت نہیں طے ہوتی ہے
ہوئی اک عمر کے ناقہ ابھی رفتار میں ہے

میں ہی مشتاق نظارے کا نہیں کچھ اس کے
آنکھ اس کی بھی ادھر رخنۂ دیوار میں ہے

اک ذرا آنکھ جھپکنے کے روادار نہیں
کس کی تصویر مرے دیدۂ بیدار میں ہے

تو ہے وہ جنسِ نفیس اے بتِ کافر جس کی
جنگ سودے پہ خریدار خریدار میں ہے

گو قفس سے میں گیا سوے چمن کیا حاصل
رشتہ الجھا ابھی خارِ سرِ دیوار میں ہے

تندرستوں کی چھٹنی جاتی ہے نبض اس کو دیکھ
یہ نشاں سا جو تری نرگسِ بیمار میں ہے

وہ بھی آوے جو تماشے کو تو کچھ دور نہیں
زور ہی بیع و شرا عشق کے بازار میں ہے

موشگافی نہیں واں شانہ ہی کرتا یاں بھی
دخل ناحق کا گریبان کے ہر تار میں ہے

مصحفی بازوے معشوق جو صرفہ نہ کرے
کام اپنا تو تمام ایک ہی تلوار میں ہے

389

واں گئے تم غیر کے گھر اور رہے آرام سے
آگ پر لوٹا کیے یاں صبح تک ہم شام سے

1۔ ٹھور رکھنا: مار رکھنا

رفتہ رفتہ پیر کر دیتے ہیں دورے اس کے ہائے　اے جواں، غافل نہ رہ تو گردشِ ایام سے
ہیں تو ہیں عریاں تنوں میں جاوے کعبے کو وہ شخص　جس کو حاصل ہو بزرگی جامۂ احرام سے
حلقۂ زنجیر سے نکلا نہ یہ پاے جنوں　غم نہیں باہر گیا گو حلقۂ اسلام سے
تھی گرفتاری میں بھی اک لذتِ آسودگی　کیا کہیں ہم کتنے پچھتائے نکل کر دام سے
شرم سے گر در تلک آنا تمھیں دشوار ہے　منھ تو دکھلایا کرو گاہے کنارِ بام سے
اس قدر بھی میں نہیں بیہوش منھ شیشے کا کھول　مجھ کو ڈہکاتا ہے کیا ساقی تو خالی جام سے
اس گلِ نازک کا کب اس میں نہانا ہے صلاح　ڈوب جاوے جو عرق میں گرمیِ حمام سے
بیٹھے رہنا نت مراقب ہم کو اس کوچے کے بیچ　کوئی آوے کوئی جاوے کام اپنے کام سے

مصحفی نے شاعری میں نام اگر پیدا کیا
تو اسے حاصل ہوا کیا خاک اپنے نام سے

390

چشم بد دور کہ پھر کھینچی ہے تلوار اس نے　ہم کو ٹھہرایا ہے الفت کا گنہگار اس نے
مر گیا ہوتے ہی جو طفل بہت خوب ہوا　کہ نہ دیکھا ستمِ چرخِ جفاکار اس نے
باغباں بھول گیا کیا مری پرواز کا ڈھنگ　کی ہے اونچی جو پھر اب باغ کی دیوار اس نے
دستِ عاشق کے لپٹنے کی نکلتی تھی ادا　توڑ ڈالا اسی اندیشے سے زنار اس نے
یہ ادا کبک کی ہم کو تو نہ بھائی ہرگز　رفتہ رفتہ جو اڑالی تری رفتار اس نے
نت رہا مرغِ چمن اپنی فغاں پر مغرور　نہ سنا نالۂ مرغانِ گرفتار اس نے
پیچ قسمت ہی کا تھا اس کا بیاں کیا کیجے　جس ادا سے کہ کیا دل کو گرفتار اس نے
قفسِ پاسِ ادب ہی میں رہا مرغِ چمن　برگِ گل پر نہ رکھی بھول کے منقار اس نے
مہربانی یہ مرے حال پہ ہے صانع کی　کہ رکھا ہے مجھے ہر فعل کا مختار اس نے
سامنے اس کے تصور کے میں رویا ہی کیا　کبھی پونچھے نہ مرے دیدۂ خونبار اس نے

مصحفی کھول دی آتے ہی جو جعد مشکیں
کر دیا گھر کو مرے کلبۂ عطار اس نے

391

نالے نہ اپنے بابِ اجابت تلک گئے
فریاد کرتے کرتے تو ہم آہ تھک گئے

لب پر ہمارے حرفِ صمد ہو گیا صنم
ہرچند اتنے مست نہ تھے پر بہک گئے

نتھنے چڑھائے اس نے جو کل گل کو سونگھ کر
کتنوں کے اس ادا پہ وونہی دم بھڑک گئے

واں تیغ بھی نکلنے نہ پائی کہ یار و دوست
خطرے سے اپنی جان کے اک اک کھسک گئے

ہم پر یہ تنگ پوشی نے اس کی ستم کیا
چولی چُسی کبھی، کبھی مونڈھے مسک گئے

گویا ہر ایک چین میں تھا نافۂ ختن
کھولی جو اس نے جعد تو صحرا مہک گئے

نشتر نے دے گا کب تلک اے نالے یہ بتا
یاں ضبط کرتے کرتے کلیجے تو پک گئے

میں نے تو کچھ کہا نہیں غصہ ہو وہ ہی رات
آیا جو کچھ کہ جی میں خفا ہو کے بک گئے

لیلیٰ کو جب کہ شامِ غریباں نے آ لیا
محمل گراں ہوا قدم ناقہ تھک گئے

جب معرکے میں عشق کے میں نے قدم رکھا
کیا کیا نہ دوست ساتھ سے میرے سرک گئے

کاہے کو پھر تو مصحفی لیویں گے نامِ عشق
دھمکائے سے کسی کے اگر ہم دبک گئے

392

موجِ ہوا سے گزری جب پیرہن خراشی
ناخن پہ برگِ گل کے ٹھہری بدن خراشی

اک تیز استرے سے سبزہ منڈا کے خط کا
دکھلائی اس کے رخ نے ہم کو سمن خراشی

نازک لب ایسے کیونکر دنداں زدِ ہوس ہوں
بوسے سے جس دہن کو ہووے دہن خراشی

مجنوں کا تن بنا ہے مشقِ الف کی تختی
کانٹوں نے بن کے کی ہے از بسکہ تن خراشی

تم پشتِ خار رکھ کر زیرِ ذقن نہ بیٹھو
پنجے سے تا نہ اس کے ہووے ذقن خراشی

شاید بہار آئی دستِ جنوں، جو پھر ہے   ویسی ہی جامہ چاکی وہ ہی بدن خراشی
خسرو کے دل پر اس کو یہ زخم مارنا تھا   تیشے نے کیا سمجھ کر کی کوہ کن خراشی
لیلیٰ کی قبر پر مت تم برگِ گل بکھیرو   کنجِ لحد میں اس کو ہوگی کفن خراشی
مجنوں کی قبر میں یہ کانٹے رکھے تھے کس نے   جواب تلک کریں ہیں اس کی کفن خراشی

اے مصحفی تو چپکے رو مجلسِ عزا میں
نالے سے تا نہ تیرے ہو انجمن خراشی

393

وہ دوستیِ غیر پہ مغرور نہ ہو جائے   قتل اس کو کسی شخص کا منظور نہ ہو جائے
ہر دم ہے غضب جنبشِ مژگاں کا اشارہ   عاشق کے رواں حلق پہ ساطور[1] نہ ہو جائے
اک ضعف سا آتا ہے چلا دستِ جنوں میں   یہ جامہ دری سے کہیں معذور نہ ہو جائے
میں خاک میں ملنے کو کروں اپنے نہ باور   تا مور کا طعمہ تنِ رنجور نہ ہو جائے
اس سے بھی محبت ہے مجھے دل سے زیادہ   رونے سے کہیں داغِ جگر دور نہ ہو جائے
یاروں کی زباں زد ہے مری چاہ کا قصہ   افسانۂ بازار ہو، مشہور نہ ہو جائے
خطرہ ہے یہی ہاتھ سے ساقی کے صراحی   مستی میں کہیں گر نہ پڑے چور نہ ہو جائے
آبِ دمِ تیغ اس کی ہے نزدیک گلے سے   پیمانہ کہیں عمر کا معمور نہ ہو جائے
رہتا ہے یہ ڈر[2] اس کی مجھے خیرہ سری سے   اوروں کے تو کہنے میں وہ مغرور نہ ہو جائے
جب رنج سے خوش ہو وہ، ترے مست کے سر پر   کیوں ابر بلا سایۂ انگور نہ ہو جائے
رنگِ رخِ عاشق جو اڑے غم نہیں اس کا   مہندی ترے، ہاتھوں کی تو کافور نہ ہو جائے
ایوب تو مت کیجیو مرہم کی تمنا   تا زخم ہر اک جسم پہ ناسور نہ ہو جائے
نالے نہیں باز آتے ہیں ناوک فگنی سے   چھت گھر کی مرے خانۂ زنبور نہ ہو جائے
زلفوں کے تصور سے بڑھا اور غم اپنا   یہ طول کسی کی شبِ دیجور نہ ہو جائے

1۔ ساطور: خنجر   2۔ اصل: اور

پردہ نہ اٹھا مصحفی اس ماہ کے رخ سے
خورشید قیامت کہیں مستور نہ ہو جائے

394

جی جس میں پس ہی جائے وہی چال روز ہے — اک میرا دم ہے تس پہ یہ دھمال روز ہے
میں خوں گرفتہ جان بچاؤں سو کس طرح — درپئے مرے وہ غمزۂ قتال روز ہے
ہو اس کے حق میں کیوں کہ کوئی بدگماں کہ واں — آرائشِ عذار و خط و خال روز ہے
زاہد، تری طرح نہیں ہم لوگ بے خبر — یاں پیشِ دیدہ نامۂ اعمال روز ہے
سلجھا چکوں جو زلف تو کاکل الجھ پڑے — اپنی تو جان کو یہی جنجال روز ہے
کیا سختیِ فراقِ عزیزاں بیاں کروں — حق میں مرے دراز تر از سال روز ہے

یاں زیبِ دست ہوں نہ گلِ تازہ مصحفی
واں زیبِ دوش شال کا رومال روز ہے

395

ہمارے پانو کے نزدیک ہی زنجیر لکھی ہے — ہماری بھی خدا نے کیا عجب تقدیر لکھی ہے
مصوّر نے دقیقہ ایک بھی باقی نہیں رکھا — نہایت دیدہ ریزی سے تری تصویر لکھی ہے
اجابت کا گلہ کیا ہے بدی اپنے نصیبوں کی — مری قسمت میں تو یہ آہِ بے تاثیر لکھی ہے
قضا نے مقتلِ عشاق کے نقشے میں ہر جاگہ — وہیں سر بھی بنایا ہے جہاں شمشیر لکھی ہے
طبیبِ مہرباں میرے سے جا کر کوئی یہ پوچھے — "صدیدی"[1] میں صداعِ دل کی کیا تدبیر لکھی ہے
جوانی میں کچھ اس کی شک نہیں کلکِ مصور نے — سپیدی ہی سے ٹک نرگس کی صورت پیر لکھی ہے
بنا جب آدمِ خاکی کا پتلا یوں قضا بولی — کہ بے تقصیر طالع میں تری تقصیر لکھی ہے
نظر آتا ہے سیم و زر پہ سکہ یہ جو اے یارو — اسی میں سرکشانِ حسن کی تسخیر لکھی ہے

---

[1] صدیدی: کتاب کا نام

اگر ثابت نہیں خوں تجھ پہ عاشق کا تو مانی نے　　تری تصویر کیوں بادستِ دامن گیر لکھی ہے

کوئی شعر اس میں بدبھی تو نہیں مجھ کو نظر آتا
غزل یہ مصحفی نے گرچہ بے تاخیر لکھی ہے

396

صراحی کو نہیں نسبت صفا میں تیری گردن سے　　صفائے سینہ ہے دونی بیاضِ صبحِ روشن سے

کسی غمناک نے خالی کیا کیا دل خیاباں میں　　صبا جو آج آتی ہے مکدّر طرفِ گلشن سے

اگر خلخالِ پائے یار کی ہم کو صدا آئے　　نکل آویں گے پیش از حشر ہم مضطر ہو مدفن سے

وہ محشر جلوہ دورِ رقص چالاکی پہ جب آیا　　لٹایا خوں میں مجلس کو سنجافِ سرخ دامن سے

کوئی قاتل سے جا کر یہ کہو تک بام پر آوے　　کہ زندانی ترے لب بند کر بیٹھے ہیں شیون سے

تنِ افسردہ اپنا مجھ کو خاکستر نظر آیا　　چمک بجلی کی جب دیکھی میں اس جالی کے روزن سے

بساط اپنی بہت کم ہے خداوندا میں سائل ہوں　　بچانا کشت کو میری تو ابرِ ژالہ افگن ہے

چمن میں جا کے میں دیوانہ کیا اے مصحفی خوش ہوں
نہ مجھ کو گل سے ربط اتنا نہ نرگس سے نہ سوسن سے

397

کھلتے ہی ہم تو باغ میں جوں گل فنا ہوئے　　لگنے نہ پائی باد بھی اور بس ہوا ہوئے

جانے سے ان کے ہم تو بہ غم مبتلا ہوئے　　یارانِ رفتہ آہ خدا جانے کیا ہوئے

ہم لوگ محض روح تھے مرنے کے بعد بھی　　یہ جان تُو نسیم ہوئے یا صبا ہوئے

بیگانگی ہی تیری ہر ایک بات میں رہی　　کس روز ہم سے طور ترے آشنا ہوئے

اب آئینہ ہی اور بنانا ہے زلف کا　　اچھا ہوا کہ تم بھی اسیرِ بلا ہوئے

پاسِ نگاہِ لطف نے گھونٹا زبس گلا　　مضمونِ شکوہ لب تلک آتے دعا ہوئے

ڈالا مسل ہمیں یہ عداوت تو دیکھیو　　ہم خاک ہو کے اس کے اگر نقشِ پا ہوئے

قاتل سے کوئی جا کے یہ کہہ دے کہ ان دنوں پھر زندہ تیرے کشتۂ تیغ ادا ہوئے

کل آپ ہم کو یاد کیا اس نے مصحفی
نالے شبِ فراق کے آخر رسا ہوئے

398

ہرگز نہ مرادِ دلِ معشوق بر آوے یا رب نہ شبِ وصل کے پیچھے سحر آوے
رکھا ہے لپیٹ اس نے تو اک اژدرِ پیچاں گر کھول دے جُوڑے کو ابھی تا کمر آوے
شرم آتی ہے کس منھ سے میں لوں نامِ محبت اپنا بھی تو کچھ حوصلہ مجھ کو نظر آوے
نے بادِ صبا جاوے نہ قاصد کوئی واں تو یارانِ عدم رفتہ کی کیونکر خبر آوے
فندق وہ ترے پنجۂ رنگیں کی جو دیکھے ہرگز نہ کبھی گل کی کلی رنگ پر آوے
جب بید کا پتا ہو ہر اک تیغ کشیدہ کیوں لالہ بروں خاک سے پھر بے سپر آوے
گو وصل کا دن منھ نہ دکھاوے تو نہیں غم یا رب کسی صورت شبِ ہجراں بسر آوے
چاہے ہے یہ دل آرزوے زخمِ دگر میں جو زخم لگے تن پہ وہ جلدی سے بھر آوے
یا رب دلِ سوزاں کو مرے ٹک تو اماں دے آنسو کی جگہ چشم سے کب تک شرر آوے

قاصد کو میں بھیجا تو ہے اے مصحفی اس پاس
تب جانوں یہ واں کے (جو) کچھ کام کر آوے

399

خط اس کو لکھ کے نہ سطریں تمام چھیلیں گے قلم تراش سے ہم حرفِ خام چھیلیں گے
ہوئے ہیں پنجۂ دستِ جنوں کے ناخن تیز رخ اپنا بیٹھے ہوئے صبح و شام چھیلیں گے
بتوں کی کج روشی سے یہی نکلتا ہے کہ دل کو کبک کے وقتِ خرام چھیلیں گے
جو ہاتھ آئی چھری اپنے تیز سی کوئی تری پتنگ کی کانپیں مدام چھیلیں گے
محرّرانِ قضا کو یہی تو عہدہ ہے یہ حرفِ طالعِ عاشق تمام چھیلیں گے

عجب مزہ ہے زمانے میں بے نشاں رہنا
ہم اپنا صفحۂ ہستی سے نام چھیلیں گے

جو دیکھیں گے لبِ نازک کو اس کے کاسہ گراں
تو چاقوؤں سے گلِ دورِ جام چھیلیں گے

جو دام میں ہی ہوئے ہم کریز[1] ہے یہ یقیں
ہماری جلدِ بدن تارِ دام چھیلیں گے

پڑا جو نامہ مرا ہاتھ میں رقیبوں کے
مقرر[2] اس سے یہ حرفِ (پیام) چھیلیں گے

فلک تو ان کی بھی محنت کو کیا مٹاوے گا
جو چھاتیاں سرِ دیوارِ بام چھیلیں گے

یہی ہے آئینہ رویوں کی خط تراشی اگر
تو زنگ دل کے مرے لا کلام چھیلیں گے

جو ناخنوں نے مدد کی تو بیٹھ کر سرِ راہ
ہم اپنے آبلۂ پا تمام چھیلیں گے

یہی ہے تیز نگاہوں کی گر تراش خراش
تو مصحفی یہ دل خاص و عام چھیلیں گے

400

پرزے کیے جگر کے تیغِ ادا نے تیری
آنکھوں سے خوں رلایا کافر حنا نے تیری

کیسا یہ نسخہ تو نے لکھا تھا اے مسیحا
مجھ کو اثر نہ بخشا ہرگز دوا نے تیری

سو بار کچھ سمجھ کر لکھی بھی اور مٹا دی
تصویرِ برگِ گل پر کلکِ قضا نے تیری

ہم قدرِ تنگ پوشی کیا جانتے تھے اے گل
چسپاں کیا ہے دل کو چسپاں قبا نے تیری

پھولوں نے خوں ہلوکا[3] غنچوں کے پھٹ گئے دل
کیسا ستم کیا یہ بلبل نوا نے تیری

اے کشتۂ تغافل دو چار دن پڑا رہ
دعوت قبول کی ہے زاغ و ہما نے تیری

منھ پر ترے لگائے آ صبح دم طمانچے
اے غنچے! کچھ نہ رکھی بادِ صبا نے تیری

تیر جفا لگا کر وہ صید سے کہے ہے
بھیجا تھا پاس میرے تجھ کو قضا نے تیری

تلووں کی نازکی کا عالم مجھے دکھایا
ہنگامِ چشم سودن شب پشتِ پا نے تیری

بے وقت اس گلی میں تو مصحفی گیا تھا
کیا آبرو رکھی ہے دی شب خدا نے تیری

1۔ کریز: پرندے کے پر جھڑنا 2۔ اصل: مکرر 3۔ خون ہلوکا: خون ڈالنا

401

کروں کیونکر رخِ جاناں پہ اپنی چشمِ تر سیدھی
حجابِ عشق کرنے ہی نہیں دیتا نظر سیدھی

نہ فرصت پائی اتنی ہمرہوں کی تیز گامی سے
ذرا دم لے کے ہم رستے میں کر لیتے کمر سیدھی

صراحی دور سے گردن کو اس کی دیکھ کہتی ہے
میں گو خوش وضع ہوں پر ہے یہ گردن کس قدر سیدھی

شریعت کا مزہ جاتا رہا سب اختلافوں سے
نہیں چلتے اُسے گو ہووے راہِ پُر خطر سیدھی

میں چاکِ دل پر آنسو قطرہ زن دن رات دیکھوں ہوں
یہ پگڈنڈی اسی کے گھر کو جاتی ہے مگر سیدھی

کہیں منہ لگ گیا جو کان کے موتی سے سوتے میں
نہ لی اس شوخ نے غصے سے کروٹ رات بھر سیدھی

اگرچہ کی ہے پیارے تونے اس سے مانگ کی تزئیں
یہ شوخی سے تری رہتی نہیں سلکِ گہر سیدھی

گلا اپنا بندھا کر دی ہے اجرت تجھ کو عاشق نے
رگِ گردن نہیں اس پر بھی تیری نامہ بر سیدھی

کریں اے مصحفی ہم صرف اسے بلبل کے اڈے میں
جو شاخِ گل کوئی لا دے ہمیں بادِ سحر سیدھی

402

وصل میں جوں جوں مزہ پاتا ہے جی
ساتھ باتوں کے چلا جاتا ہے جی

وہ نہ ایدھر آ پھرے افسوس ہے
چال پر جن کی چلا جاتا ہے جی

گریۂ خونیں کے ہاتھوں سے مرا
ساتھ آنسو کے بہا جاتا ہے جی

جی اگر جاوے کسی کا بے گناہ
آپ کا سچ ہے کہ کیا جاتا ہے جی

بات کہنا بگڑ کے کچھ اچھا نہیں
اس میں عاشق کا گھٹا جاتا ہے جی

ہجر کے غم کو کہاں تک جھیلیے
آہ اپنا تو کھپا جاتا ہے جی

کس کو میں دیکھا ہے ملتے اس کا سر
آج کچھ میرا ملا جاتا ہے جی

کھول دو بہرِ خدا بندِ نقاب
اس رکاوٹ سے رکا جاتا ہے جی

میں ہوں وہ طائر کفِ صیاد میں
جس کی وحشت سے چھٹا جاتا ہے جی

شمع بولی شوخیِ پروانہ دیکھ — تجھ سے تو میرا جلا جاتا ہے جی
ذکر اس کی چال کا جب آئے ہے — سننے والوں کا رندھا جاتا ہے جی
آسماں اک خانۂ پُر دُود ہے — اس میں تو اپنا گھٹا جاتا ہے جی
تیرا جانا مصحفی کی موت ہے
تُو پھر آتا ہے تو آ جاتا ہے جی

403

کسی کی یاد نہ یارب کسی کے دل کو لگے — بلا سے اس سے گر اک شعلہ آب و گل کو لگے
خیال لالہ رخاں بیشتر رہے ہے مجھے — کہیں نہ داغ مری جانِ مضمحل کو لگے
میں پھنک رہا ہوں یہ میرے قریب بیٹھے ہیں — ڈروں ہوں آگ نہ یارانِ متصل کو لگے
گلی سے تو مرا لاشہ اٹھا کے پھنکوا دے — حیا گر اس سے تری چشمِ منفعل کو لگے
نہ کیوں کہ آہ مری پھونک دے فلک کے تئیں — ہوائے تند جب اس نارِ مشتعل کو لگے
تو میرے درد سے آگاہ یوں ہووے گا — الٰہی چوٹ کسی دن ترے بھی دل کو لگے
لحد سے نکلوں میں اے مصحفی پئے پابوس
وہ نعلِ رخش جو تربت کی میرے سِل کو لگے

404

کمر کو نازنیں! جو ذہن میں گزرے سو سچ کہہ دے
پہیلی تو نہیں جو ذہن میں گزرے سو سچ کہہ دے
طبیبوں پر تو ہے دشوار تشخیصِ مرض اپنا
تو ہی اے ہم نشیں جو ذہن میں گزرے سو سچ کہہ دے
عدم یا نقطۂ موہوم ہے اس کا دہن اے دل
تو ہے خیلے ذہیں جو ذہن میں گزرے سو سچ کہہ دے

بگولا ہے یہ یا اڑتی ہے خاکِ قالبِ مجنوں
مہِ محمل نشیں جو ذہن میں گزرے سو سچ کہہ دے

بہ نرمی پنبہ ہے یا موم ہے اس کا بدن اے دل
تو بیٹھا ہے قریں جو ذہن میں گزرے سو سچ کہہ دے

ہماری تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ ہم کیا ہیں
ترے اے مہ جبیں جو ذہن میں گزرے سو سچ کہہ دے

یہ لالہ ہے کہ خونِ کشتگاں نے جوش مارا ہے
شتاب اے ہم نشیں جو ذہن میں گزرے سو سچ کہہ دے

تامل کر نہ اتنا نبضِ عاشق میں تو اے عیسیٰ
ہمیں ساعت ہمیں جو ذہن میں گزرے سو سچ کہہ دے

صنم! عاشق کے لختِ دل پہ تیرا نام ہے کندہ
اسے تھیوا، نگیں جو ذہن میں گزرے سو سچ کہہ دے

مرے ہاتھ آئے گی وہ زلفِ مشکیں یا نہیں گا ہے
تجھے اے شانہ بیں جو ذہن میں گزرے سو سچ کہہ دے

ہے عالم حادث اے دل! یا قدم میں ہے ثبوت اس کا
بہ علمِ فلسفیں جو ذہن میں گزرے سو سچ کہہ دے

خموش اے مصحفی تو وصف میں اس کے نہ رہ ہرگز
یہ کیسی ہے زمیں جو ذہن میں گزرے سو سچ کہہ دے

405

ہو کیوں کر مصحفِ دل کی مرے تفسیر بے معنی — کہ دانش مند کی ہوتی نہیں تقریر بے معنی
خط اس نے پڑھ کے میرا پھاڑ ڈالا اس بہانے سے — "یہ خط لکھا ہے کس نے، اس کی ہے تحریر بے معنی"

محیطے دار اس میں سیکڑوں نقشِ دوائر ہیں
نہیں یہ نقشۂ چرخِ کہن تعمیر بے معنی

نہ جب تک صاحبِ تصویر کا نام اس پہ لکھا ہو
کھلے کیا اس کی ماہیت وہ ہے تصویر بے معنی

بھری مجلس میں بوسہ شمع کے شعلے کا لیتا ہے
معاذ اللہ ہے کتنا رو سیہ گل گیر بے معنی

گل اس کی جعفری میں ہیں بنے یکسر سلیقے سے
کہوں کیوں کر ہے صید افگن کا میرے تیر بے معنی

شبیہِ مدِّ بسم اللہ اس کے خم سے ظاہر ہے
نہیں قاتل کی میرے صورتِ شمشیر بے معنی

نہ پڑھنے میں کسی کے سرنوشتِ عاشقاں آئی
قصورِ فہم تھا اپنا نہ تھی تسطیر بے معنی

نہیں کچھ پیش جاتی مصحفی ان نکتہ چینوں سے
ہے ان کو بس کہ اقلیدس کی بھی تحریر بے معنی

406

جو آیا واں سے اس نے مجھ سے کی تقریر بے معنی
مرے خط کی تو کچھ اتنی نہ تھی تحریر بے معنی

پڑھے پر جلد اثر کرتا ہے نقشِ صورتِ زیبا
خدنگِ ناز کا ہوتا نہیں نخچیر بے معنی

رہے ہے کام مجھ کو رات دن صورت پرستی سے
بسر کرتا ہوں میں جوں خامۂ تصویر بے معنی

کتابِ شاہنامہ میں نہ کوئی ان کو لکھوادے
سلاطینِ سلف کی ہوویں گر تصویر بے معنی

لکھا ہے ماجرا صاف اس میں قتلِ خاکساراں کا
نہیں خطِ غبارِ جوہرِ شمشیر بے معنی

وو ہی مفہومِ کلی ذہن میں آجائے ہے اس سے
نہ دیکھی مردِ دانا کی کبھی تقریر بے معنی

مرتب بھی کریں گر حاشیہ متنِ شہادت کا
نہیں قاتل کا بندِ جوہرِ شمشیر بے معنی

بہ بزمِ شاعراں سامع کی جا دیکھی پسِ قاری
بدیہی ہے کہ واں پاتا نہیں توقیر بے معنی

نہ تھی ضربِ قلم کی تاب اگر دشمن کو حیراں ہوں
ہوا پھر مصحفی کا کیوں گریباں گیر بے معنی

407

کس کا روے آتشیں شب تھا دوچار آئینے سے
کام خاکستر کا لے ہے روزگار آئینے سے

سادہ رویوں سے محبت زندگی میں تھی اسے
چاہیے عاشق کا پٹوانا مزار آئینے سے

عکس روے آتشیں تیرا اگر اس میں پڑا
صاف اڑ جاویں گے جوہر جوں شرار آئینے سے

اپنی صورت کو جو دیکھا شوخ نے کر کے بناؤ
جوں دلِ عاشق گیا صبر و قرار آئینے سے

معرکے میں نفس کے منظور ہے تن کی شکست
کام کیا رکھیں سپاہی ہم سے چار آئینے سے

اک دن اس میں پڑا تھا سایۂ مژگانِ یار
اب تلک جاتا نہیں وہ خار خار آئینے سے

عکس کا بھی دیکھنا اس کو برا لگتا ہے ہاے
وا نہیں ہوتی وہ چشمِ پُر خمار آئینے سے

آئینہ خانے میں کی میں وحدت و کثرت کی سیر
ایک صورت جب نظر آئی ہزار آئینے سے

پان کھا کر اس نے گر دیکھے وہ لعلِ آتشیں
جوش مارے گی گلِ تر کی بہار آئینے سے

حصۂ موئینہ پوشاں[1] کیوں صفاے دل نہ ہو
صاف کرتا ہے نمد گرد و غبار آئینے سے

پیک ٹھٹھکیلی میں گر اس پر کرے ہنگامِ ناز
دیکھیو ہو کاروانِ خوں شکار آئینے سے

مصحفی رکھتا ہے دشمن گر اصابت چشم کی
مثلِ تخمیرا[2] رکھوں گا اس کو مار آئینے سے

408

اشک نے راہِ چشمِ تر لی ہے
مصلحت کچھ تو دل سے کر لی ہے

جو بلا آسماں سے آئی ہے
ہم نے وہ اپنی جان پر لی ہے

نازکی اس کمر کی وہ سمجھے
ہاتھ میں جس نے وہ کمر لی ہے

آؤ عرصے میں تم بھی سرِ بازو
اس نے پھر تیغ اور سپر لی ہے

مر گیا میں تو ٹکٹری[3] ایسی
تو نے، اے بلبلِ سحر، لی ہے

اپنے بندے سے بے خبر وہ نہیں
بطنِ ماہی میں بھی خبر لی ہے

تب ڈبویا ہے قہرِ خالق نے
جب گناہوں کی ناؤ بھر لی ہے

میں نے بازارِ حسنِ خوباں سے
مول اک حسرتِ نظر لی ہے

1۔ موئینہ پوشی: بالوں کا لباس، پوستین 2۔ تخمیرا؟ 3۔ ٹکٹری: گانے میں آواز کا نشیب و فراز

یہ غزل کہہ کے میں مقیموں[1] سے
مصحفی قیمتِ ٹھہر لی ہے

409

چمن میں غش پہ غش آئے جونہی بہار ہوئی   ہمیں ہوائے گلستاں نہ سازدار ہوئی
نکل کے دام وقفس سے نہ باغ تک پہنچے   خراب موتِ اسیرانِ دل فگار ہوئی
گیا نہ لشکرِ بادِ خزاں سے حفظ چمن   اگر چہ گل کی کلی آپ جامدار ہوئی
ستم تو دیکھیو بالیں پہ یار لائے اسے   دمیکہ بند مری چشمِ انتظار ہوئی
نہ جوے شیر سے جیتا پھرے گا پھر فرہاد   برائے سیر جو شیریں کبھی سوار ہوئی
ہمیں تو اس کا ہے مرنا کہ وقت مستی کے   دو چار آئینہ وہ چشم پُر خمار ہوئی
کریں گے یادِ گلستاں کا کیا لحد میں (اگر)   نہ ڈالی گل کی بھی نخلِ سرِ مزار ہوئی
جب آینے میں کھلے بال اس کے آئے نظر   بلاے تازہ مری جان سے دوچار ہوئی
سحر نہانے کو اترا وہ بت جو دریا میں   عجب لطافتِ تن اس سے آشکار ہوئی
دکھائی گات تو موتی صدف میں جا کے چھپا   کھلی جو جعد تو ہر موج بے قرار ہوئی

میں مصحفی نہیں ہاجی کسی کا شکر ہے یہ
کہ مجھ سے مدحِ امیرانِ روزگار ہوئی

410

غمِ فراق سے اس کے اگر نہ خو کرتے   تو روزِ وصل کی کس منہ سے آرزو کرتے
نکل کے اس کی گلی سے جو مارا جاتا میں   سگانِ شہر نہ لاشے کو میرے بُو کرتے
یہ گم ہوئے ہیں خیالِ وصالِ جاناں میں   کہ گھر میں پھرتے ہیں ہم اپنی جستجو کرتے
دیَت نہ خون کی قاتل سے مانگتا میں تو   جو روزِ حشر مجھے اس کے روبرو کرتے

1۔ مقیم: تاجر، دلال، منشی

شب اس کے کوچے میں جا کر کے پچھلے پانو پھرے — ہم اپنی جاں کا کس کس کو واں عدو کرتے
بناتے گل سا جو چہرہ ترا شبیہہ کشاں — تو صرف دستۂ سنبل کو جاے مو کرتے
قباحت اس کی سمجھتے جو یہ کماں ابرو — نہ استخواں کو مرے تیر کا گلو کرتے
خدا ہی جانے کہ عالم پہ کیا غضب آتا — زیادہ اس سے اگر اس کو خوبرو کرتے

ملا نہ مصحفی اس فتنۂ زماں کا سراغ
تمام عمر ہوئی ہم کو جستجو کرتے

411

نسیمِ وادیِ مجنوں کو ہم جو بو کرتے — نہ نجد سے کبھی پھر سوے خانہ رو کرتے
ترا خیال نہ جاتا گر اپنے ساتھ صنم — تو ہم لحد میں بھلا کس سے گفتگو کرتے
براے سینہ خراشی جو خار ہاتھ آتا — تو اس چمن سے نہ ہم گل کی آرزو کرتے
میں مست دفن جو ہوتا مغاں کو لازم تھا — کہ صرف قبر میں تختوں کی جا سبو کرتے
خیالِ لالہ رخاں سے کب اتنی فرصت تھی — کہ داغ بند کی ہم اپنے شست و شو کرتے
تری گلی میں جو خضر و مسیح بھی آتے — نکلتے یاں سے نہ جب تک سفید مو کرتے
جو یہ سمجھتے کہ تہمت کی جا ہے کوچۂ یار — تو اس گلی میں نہ ہم منھ کو سو بہ سو کرتے
بھلا ہوا نہ سیئے زخم میرے یاروں نے — اُدھڑتے ایک کے ٹانکے گر اک رفو کرتے
جو میرے حال پہ صورت گروں کو رحم آتا — رقم نہ وہ مری تصویر تا گلو کرتے
کیا ہے قتل میں کس مدعی کو حیراں ہوں — جو خوں طلب مری پھرتے ہیں جستجو کرتے

خوشی جو اس کی نہ ہوتی تو مصحفی ہم لوگ
شبِ فراق کے صدموں سے کیوں کہ خو کرتے

412

بلبل پہ جب نزاکتِ گل برگِ تر کھلی — منقار نالہ اس کی نہ بارِ دگر کھلی

ہیں چاک ہائے سینہ مرے سیر گاہِ حسن — چلمن میں جیسے رکھتے ہیں راہِ نظر کھلی
تجھ سے ہنسی کا وصل کی شب قصد تھا و لے — پہنچی نہ تیرے ہاتھ کی اے سیم بر، کھلی
واشد نہ تھی دل اپنے کو ملکِ عدم میں تو — بارے کچھ اپنی طبع یہاں آن کر کھلی
کب سوئے خوابِ ناز میں ہم کشتگانِ ناز — شمشیر کب کمر سے تری خوش کمر کھلی
انجامِ کار کچھ نظر آتا نہیں دریغ — حیرت سے آنکھ رہتی ہے دو دو پہر کھلی
دیکھا تو سیلِ اشک ہے دریا سے ہمکنار — جب روتے روتے اپنی کبھی چشمِ تر کھلی
ہم تجھ کو بوے مشک کی دکھلاویں گے بہار — چوٹی کبھی جو اس کی نسیم سحر کھلی
خط پڑھ کے اس نے تیغ سے پرزے کیا اسے — آخر کھلی تو یہ خبرِ نامہ بر کھلی
مسّی تو تھی ہی لیک لبِ لعل پر ترے — پانو کی بیڑی اس سے صنم خوبتر کھلی
شب قصد تھا کہ پھینکوں گا اس بام پر کمند — کم بخت میری آنکھ نہ پچھلے پہر کھلی
ہم دیکھ لیں گے زمزمہ سنجانِ باغ کو — اپنے دہن سے مُہر خموشی اگر کھلی

پھر اشک سرخ آنے لگے تیرے مصحفی
پھر چشم کی طرف رہ خون جگر کھلی

413

چاہت کا کسی کی جو کوئی ذکر کرے ہے — لا آنکھوں میں اشک، آہ یہ دل آہ بھرے ہے
قاصد جو ترا ہو کبھی اس کوچے میں جانا — اتنا ہی تو کہیو کہ کوئی تجھ پہ مرے ہے
اس چاہِ زنخداں کا نہیں مہر ہی بندہ — مہتاب بھی یاں کچے گھڑے پانی بھرے ہے
جاتے ہی جھکی عکس کی آنکھ اس لیے یعنی — آئینہ تری نازکیِ خو سے ڈرے ہے

اے مصحفی جاتا ہے جسے کرنے تو مجرا
کہہ یہ تو وہ سر پر بھی کبھی ہاتھ دھرے ہے

414

ہے زلفِ دراز اس بتِ شبگوں کی رسّی — یا حسن کی کشتی کی ہے مستول کی رسّی

آنسو مرے کافی ہیں مساحت کو زمیں کی — جوں موج ہے ان کی بھی بڑی طول کی رسّی
کیا اس کا گنہ تھا جو پس از قتل بھی قاتل — وا تو نے نہ کی گردن مقتول کی رسّی
نے زلف نہ کاکل کا گرفتار ہے مسکیں — ایک وہم ہے صیدِ دلِ معلول[1] کی رسّی
پُتلی سے مری بستہ ہیں اس زلف کے حلقے — اس ڈول سے کھلتی نہیں معمول کی رسّی
دیتی ہے سدا اس سے ہی پھانسی وہ گلوں میں — سرمہ ہے جو اس نرگس مکحول کی رسّی
یاں ناؤ میں خاک اڑنے لگی اب نہیں نبھتی
اے مصحفی کب تک میں بٹوں دھول کی رسّی

415

پردے میں جو پنہاں ہے وہ پیدا نظر آوے — کھل جاوے اگر آنکھ تماشا نظر آوے
مجنوں کی جھپک جاوے اگر آنکھ بھی گاہے — تو اس کو وہی ناقہ و لیلا نظر آوے
اے دل بگڑ اک روز تو اس دشمنِ جاں سے — تا دوستیِ مردمِ دنیا نظر آوے
گل کھاؤں سراپا میں جو میں واسطے اس کے — پھولوں سے لدا نخلِ تمنّا نظر آوے
بالیں پہ جو دیکھے ترے بیمار کی جا کر — انگشت بہ لب اس کو مسیحا نظر آوے
اس دشتِ خطرناک میں لائی ہمیں وحشت — ہرگز نہ جہاں آہوے صحرا نظر آوے
عاشق کی اگر کنجِ لحد جا ہو پس از مرگ — واں حور کی صورت میں چھلاوا نظر آوے
مانندِ صبا میں کبھی اک لحظہ نہ ٹھہروں — کچھ بھی مجھے جس باغ میں کھٹکا نظر آوے
قربان کروں جان و دل اس پر بھی میں ظالم — تو ایک طرف گر ترا سایا نظر آوے
اس رخ پہ اگر عقدِ گہر جلوہ نما ہو — خورشید ثریّا میں چمکتا نظر آوے
اے مصحفی دیکھ اس کو میں اس طرح کیا غش
مصروعی[2] کو جس طرح کہ دریا نظر آوے

1۔ معلول : علیل، بیمار 2۔ مصروعی: مرگی کا مریض

416

مد ہر اک کوئی کے خطِ نور پیراہن میں ہے
اور جو تکمہ ہے چراغِ طور پیراہن میں ہے

ہاتھ اگر مجنوں کے ہوتے پھینکتا سر سے اتار
ضعف سے وہ ناتواں مجبور پیراہن میں ہے

جامۂ عریاں تنی تک تجھ سے کل لیویں گے چھین
چیت اے غافل! تو کیا مغرور پیراہن میں ہے

رمز کو سمجھے ہے میرے کشتۂ حسنِ سپید
یعنی وہ بت لعبتِ کافور پیراہن میں ہے

اس کے چاکِ آستیں پر کیوں نہ ہوں ہم اشک ریز
تکمے رکھنے کا بھی تو دستور پیراہن میں ہے

جس طرح کوزے میں پانی ہو بھرا وہ نورِ قدس
ہر بشر کے اس طرح معمور پیراہن میں ہے

رنج کم بھی ہے دلِ نازک طبیعت پر زیاد
ناز پرور کو مگس زنبور پیراہن میں ہے

کان کے سبزوں کی کس کے یہ لگی اس کو ہوا
جو ہرا ہر دانۂ انگور پیراہن میں ہے

کچھ خود آرائی کی خاطر میں اسے پہنا نہیں
عیب عریانی مرا مستور پیراہن میں ہے

فندقِ دست نگاریں کس کے اس کو چھو گئے
آج کچھ غنچہ نپٹ مسرور پیراہن میں ہے

تن پہ زنگی کے اگر ہو رختِ ابیض یہ سمجھ
روزِ روشن کے شبِ دیجور پیراہن میں ہے

میں سمجھتا ہوں اسے روحِ مجسم مصحفی
قلب بینوں کی نظر جوں نور پیراہن میں ہے

417

اے آہ شعلہ ور ہو ناداں دھواں نہ ہووے
ہے تنگ خانۂ دل یہ آسماں نہ ہووے

مسلخ میں عاشقی کے وہ تنگ ذبح ہوں میں
ہرگز گلے پہ جس کے خنجر رواں نہ ہووے

مجنوں کا دیکھنا ہے اس دم ہمیں تماشا
جب ناقہ ہو اکیلا اور سارباں نہ ہووے

تصویر کے مقابل لا تم کو کر دیا ہے
کیا تاب اس سے کھینچے جس کے دہاں نہ ہووے

بے تابیوں کو ہم نے کیا مار مار رکھا
عاشق نہیں وہ جس سے ضبطِ فغاں نہ ہووے

کس کو نہاں کرے ہے تو اے نقاب چل دور
جو لاکھ پردوں میں بھی ہرگز نہاں نہ ہووے

ایسا بشر جہاں میں مَیں نے کوئی نہ دیکھا چاہت کا تیری مجھ کو جس پر گماں نہ ہووے
گو میں نہ دیکھوں تو بھی میری یہی دعا ہے گلزارِ حسن یا رب ہرگز خزاں نہ ہووے
کب شمع بزم خوباں ہوتا ہے وہ سخنور
اے مصحفی جو مجھ سا آتش زباں نہ ہووے

418

دکھانی تھی مگر مانی کو بُرّش تیغِ قاتل کی تڑپتی خوں میں جو تصویر کھینچی مرغِ بسمل کی
سیہ بختی نویدِ وصل دیتی ہے مجھے ہر دم مسافر کو خوشی ہوتی ہے وقتِ شام منزل کی
خدا جانے کہ کیا منظور ہے نقاشِ قدرت کو بنائی اس نے جو تصویر پھر وہ وونہی باطل کی
جہاں مجنوں پکارا بس وونہی در تک نکل آئی صدا پہچانتی ہے آپ لیلیٰ اپنے سائل کی
بنایا مردمِ آبی ہمیں طالع کی دوری نے نہ دیکھی خواب میں کشتی نے اپنی شکل ساحل کی
جو گاہے نجد سے ہو کر عرب کا قافلہ گزرا تو گردِ دشت حائل ہو گئی لیلیٰ کے محمل کی
میں نقاشی کا کلکِ صنعِ صانع کی ہوں دیوانہ بنائی اس صفا سے کس نے صورت آب اور گل کی
ذرا خوابیدگانِ خاک کی بیہوشیاں دیکھے نہ کی ہو گر کسی نے سیر بدمستوں کی محفل کی
بنایا تو خدا نے مجھ کو پر میں اس کا حیراں ہوں کہ میری خاک میں تیری محبت کیوں کہ شامل کی
اگر بیتابیِ دل سے کبھی زنداں میں ہم تڑپے تو فریاد آسماں تک جائے گی اپنے سلاسل کی
نہ ہرگز مصحفی دل دیجیو ایسے کو کہتا ہوں
بری ہوتی ہے ناداں! دوستی معشوقِ دہ دل کی

419

کب تک شبِ ہجراں کی سیاہی نظر آوے انجام تو کچھ اس کا الٰہی نظر آوے
جب پردۂ غفلت ہو پڑا چشم پہ تیری کیا حال کی عاشق کے تباہی نظر آوے
آ نکلے ابھی باغ میں گر وہ گلِ خنداں اے گل! تری برگشتہ کلاہی نظر آوے

پھرتی ہے مٹکتی نظر اس چشم میں اس طرح
جوں آب میں ترتی ہوئی ماہی نظر آوے

شبنم سے بھی نازک ہوں تری چشم کے پردے
تب خواب میں اس کُرتی کی لاہی[1] نظر آوے

ایسے سے بھلا کیوں کہ کوئی عہدہ برآ ہو
جو بات کہوں اس کو وہ واہی نظر آوے

تیغِ خمِ ابرو نے کوئی زندہ نہ چھوڑا
مشکل ہے کہ دنیا میں سپاہی نظر آوے

یوں ہوگئی ہے زرد حنا ہاتھوں کی تیرے
جوں رنگِ گُلِ تر کبھی کاہی نظر آوے

دردیلی غزل ایسی تو لکھ مصحفی جس کا
ہر شعر رقم کردۂ آہی نظر آوے

420

آسماں لوہے کا ہے اور یہ زمیں پتّھر ہے
دل شکستن کو تری چینِ جبیں پتّھر ہے

سنّی و شیعہ کے قضیے میں ہے حیراں مری عقل
نہیں ہلتا، یہ عجب در رہِ دیں پتّھر ہے

غیر سے گرم محبت ہے تو عاشق سے بہ کیں
دلِ معشوق کہیں موم کہیں پتّھر ہے

اس کا مذکور کوئی منھ پہ نہ رکھیو اس کے
سامنے اس لبِ نازک کے نگیں پتّھر ہے

نہیں تعظیم کو رندوں کی جو اٹھتا جا سے
کیا مگر زاہدِ سجّادہ نشیں پتّھر ہے

تیری تصویر کے عالم کو نہیں پاتا ایک
گرچہ بت خانے میں ہر بت کا حسیں پتّھر ہے

خرق و پیوند کا امکاں جو نہیں اس میں ذرا
روزِ ایجاد سے کیا چرخِ بریں پتّھر ہے

شورِ لیلیٰ کی ملاحت کا نہ جاوے گا کبھی
تربتِ قیس کا اب تک نمکیں پتّھر ہے

اک غزل اور بھی لکھ مصحفی اس میں ہر روز
تو ہے فولاد قلم گو کہ زمیں پتّھر ہے

421

کعبہ و دَیر میں مسجودِ زمیں پتّھر ہے
یعنی ان دونوں جگہ فرشِ زمیں پتّھر ہے

1۔ لاہی: ایک ریشمی کپڑا

نزع کے وقت یہ سِل کیوں کہ ٹلے حیراں ہوں
میری چھاتی پہ دمِ باز پسیں پتھّر ہے

راہِ صحرا لے اگر وسعتِ مشرب چاہے
کہ ترا دل ابھی اے کعبہ نشیں پتھّر ہے

تجھ کو آنکھوں کی ترازو میں صنم تولوں گا
دُر کے پلّے میں نہ مُل دُرِّ یمیں میں پتھّر ہے

زور وہ موسمِ باراں میں زمیں ہی کو گیا
میری تربت کا بھی کیا خاک نشیں پتھّر ہے

گر دلِ عاشق و معشوق ہوں یکجا، اے چرخ
رکھیو ٹک دھیان کہ شیشے کے قریں پتھّر ہے

جب خضرؑ پوچھی تھی اعجاز طلب نے اس سے
کیا خبر تھی نہ پیمبر کے تئیں پتھّر ہے

میں زمیں وادیِ الفت کی نہ دیکھی سادی
کہیں بنجر، کہیں بیہڑ، تو کہیں پتھّر ہے

سوزشِ عشق ہے اے مصحفی یوں دل میں نہاں
جس طرح جوہرِ آتش کا امیں پتھّر ہے

422

ہیں جو نازک تری مژگاں کے، پری رو! کانٹے
دل میں چبھتے ہیں مرے وہ ہیں بلا خُو کانٹے

ہر سرِ خار سے آلودہ ہے خوں مجنوں کا
ناقہ کس طرح مغیلاں کے کرے بو کانٹے

وادیِ عشق وہ خوں ریز زمیں ہے جس جا
تیر سے ہوتے ہیں تلووں میں ترازو کانٹے

دل فریبی چمن حسن کی کچھ مجھ سے نہ پوچھ
گل گر اعجازِ مجسّم ہیں تو جادو کانٹے

بے پر و بال کوئی سیر کو جاوے کیوں کر
درِ گلزار سے ہوتے نہیں یکسو کانٹے

اس گلِ تر کی نزاکت کا بیاں کیا کیجے
خوابِ مخمل بھی ہوں جس کے تہِ پہلو کانٹے

رنجِ غربت کی خلش سب دونہی مٹ جاوے اگر
میرے تلووں سے نکالے مرا گل رو کانٹے

خط کے سودائی نہیں جانبِ مژگاں جاتے
ہوتے سبزے کے کوئی چرتے ہیں آہو کانٹے

کیا عجب اس کا اگر ماہیِ بینی کے لیے
قلزمِ حسن میں پھینکیں خمِ ابرو کانٹے

مصحفی باغ سے جانا نہ ملا تجھ کو دریغ
اپنے دامن سے جدا کر نہ سکا تو کانٹے

423

ان کا جس دن سے پیا کرتے ہیں لوہو کانٹے
ہیں ترے آبلہ پانو کے دعا گو کانٹے

عشقِ مژگاں سے حق اپنے میں نہ بو کانٹے
ٹھور رکھیں گے تجھے ورنہ یہ جادو کانٹے

بے قراری سے نہ بستر پہ پڑا چین مجھے
شبِ ہجراں میں مرے تن پہ ہوئے مو کانٹے

چھوٹنا نیش زنوں کا ہے محال اس گل سے
چھوڑ جاتے ہیں کوئی پھول کا پہلو کانٹے

خلشِ دل نے شبِ وصل بھی سونے نہ دیا
تا دمِ صبح رہے تکیۂ پہلو کانٹے

دور میں عارضِ رنگیں کے ترے، جانِ بہار!
کوئی پھولوں کو نہیں پوچھتا، یکسو کانٹے

اوّلاً کون ہو، دیکھیں تو بھلا، جل کر خاک
ہم جلیں آگ میں اک سمت کو، یکسو کانٹے

وادیِ عشق میں موزوں کا پہننا ہے ضرور
بڑھ کے آجاتے ہیں واں تا سرِ زانو کانٹے

آدمی رزق سے ہوتا ہے گرفتارِ بلا
پاویں چارے کے سبب مچھلی پہ قابو کانٹے

مصحفی پانو کے تلووں کی خبر تجھ کو نہیں
ابھی دامن ہی کے چنتا ہے میاں تو کانٹے

424

تنِ مجنوں میں ہیں یوں بن کے ترازو کانٹے
شانہ جس طرح کہ رکھتا ہے دو پہلو کانٹے

الم عشق جو پھیلا تو سمٹتا کب ہے
تنِ ماہی کے کوئی ہوتے ہیں یکسو کانٹے

اس کی مژگاں کے تصور میں جو سو جاتا ہوں
کوئی رکھ دیتا ہے میرے تہِ پہلو کانٹے

عرق افشاں کوئی اس دشت سے گزرا ہے مگر
آج کچھ عطر کی دیتے ہیں مجھے بو کانٹے

بر میں تو جو شبِ ماہ کی اے ماہ نہ تھا
مجھ کو تجھ بن نظر آئے گلِ شبّو کانٹے

مرغ جب لوہے کے کانٹوں سے لڑاویں استاد
کیوں نہ دولات میں بازی کریں یکسو کانٹے

میز پر چہرے کی رکھنے کو پئے دعوتِ حسن
اس کے مژگاں جو چھری لائیں تو ابرو کانٹے

چمنِ حسن میں جا کر کوئی کیا خوش ہو کہ واں
جتنے بدوضع ہیں گل دیتے ہیں کج خو کانٹے

مصحفی کشتہ ہے اس گل کا کہ جس کی شبِ وصل
سیس پھولوں میں نہاں رکھتے ہیں گیسو کانٹے

425

جاں خراشی کو دلا سب ہیں یہ گل رو کانٹے
چاہ مت ان کو نہ حق اپنے میں بو ٹو کانٹے

وادیِ عشق میں آیا تھا میں گل چننے کو
یہ نہ سمجھا تھا چبھیں گے مرا لوہو کانٹے

اس کے عارض کا کروں وصف کہ مژگاں کی ثنا
جیسے خوش چہرہ ہیں گل ویسے ہی خوش رو کانٹے

نوک جھونک ان کی چلی جاتی ہے تلووں سے مرے
نیشِ عقرب کی طرح کتنے ہیں کج خو کانٹے

اس پہ جراح نہ رکھ مرہمِ گل کہنا مان
خارشِ آبلۂ پا کی ہیں دارو کانٹے

ہے یہ نیزے پہ بہار آپ کے دیوانوں کی
سر سے جاتے ہیں گزر توڑ کے تالو کانٹے

کاش مجھ برہنۂ پا کا گزر اس دشت سے ہو
گلِ مقصود کی دیتے ہیں جہاں بو کانٹے

دلِ وارستہ مرا قید میں راحت کی نہیں
ان کو گل سمجھے اگر ہوں تہِ پہلو کانٹے

دل میں چبھتی ہیں وہ مژگاں تو یہ کہتے ہیں ملک
گلشنِ سحر کے کیوں کر نہ ہوں جادو کانٹے

اس زباں پر نہ گیا شکوۂ پامالیِ چرخ
مصحفی سچ تو یہ ہے کتنے ہیں کم گو کانٹے

426

شرمندہ سمن ہے تری نازک بدنی سے
غنچے کو خجالت ہے بہت خوش دہنی سے

حق میں مرے سم ہے یہ دُرِ اشک کا ریزہ
بچتا نہیں دیکھا کوئی ہیرے کی کنی سے

دو چار کی تا جان نہیں جانے کی مشفق
تم باز نہیں آنے کے پیماں شکنی سے

غربت میں وطن گرچہ کیا میں نے مقرر
اس پر بھی نہ نکلا میں غمِ بے وطنی سے

دنبالہ جو سرمے کا ترے اتنا ہے دلکش
سیکھا ہے پٹا کیا کسی راوت دکنی سے

فرہاد نے خوں اپنا کیا مار کے تیشہ
یہ لعل ملا اس کو بس اس کوہ کنی سے

کس زلف کی بو بادِ صبا لے گئی واں تک
جاتا ہے لہو چشمِ غزالِ ختنی سے

اس چشمِ سخن گو کو نہیں لب پہ فضیلت
کب بحث میں جیتے ہے حجازِ یمنی سے

مل غیر سے تم نے مری خاطر شکنی کی　　کیا ہاتھ لگا آپ کو خاطر شکنی سے
تودے پہ ترے کشتۂ مژگاں کے شبِ کور　　تارے نہیں باز آتے ہیں ناوک فگنی سے
پہلو کے تلے ہووے اگر پھولوں کی چادر　　نیند اس کو نہ آوے کبھی نازک بدنی سے
از بہرِ خدا اب تو کہیں بول تو کافر　　جاں ہونٹوں پہ آئی ہے تری کم سخنی سے
فہمید قدم رکھ کہ ہوئے راہ کے مردے　　تربت میں بھی زخمی تری جوتی کی انی سے
ہو جاتی ہیں صد آرزوے مردہ کفن پوش　　یہ فائدہ ہوتا ہے گدا کو کفنی سے

جو مصحفی ہیں اپنے مقدّر ہی پہ قانع
رکھتے نہیں کچھ کام گدا اور غنی سے

427

جیسے کہ ترے لب ہیں عقیقِ یمنی سے　　چمکیں ہیں صنم دانت بھی ہیرے کی کنی سے
گل جامہ دراں ہیں تری گل پیرہنی سے　　کانٹوں کو خلش ہوتی ہے مژگاں کی انی سے
دن عید کے عاشق سے وہ عمداً کہیں ملتا　　ڈر ہے زبس اپنی اسے نازک بدنی سے
یہ ظلم کیا اور کہ وہ تیغِ تغافل　　منھ پھیر گئی عاشقِ گردن زدنی سے
پیسے ہے دل اس کا تری آنکھوں کا تصور　　کچھ بن نہیں آتی ہے غزالِ ختنی سے
ہستی کو مٹا اپنی جو ہے وصل کا طالب　　پایا نہ پیمبر نے خدا بت شکنی سے
اے چرخ یہ ہر صبح شفق پھولتی کیا ہے　　اک روز تو بس کر کہیں آتش فگنی سے
پیرایۂ تقلید نہیں میری فقیری　　طفلی ہی میں خوگر میں ہوا تھا کفنی سے
کیوں تلخیِ دشنام کی لذت نہ چکھائی　　شکوہ ہے یہی یار کی شیریں دہنی سے
غربت ہی جب آئی تو کھلا ہم پہ یہ عقدہ　　بہتر تھا ہمیں رنجِ وطن بے وطنی سے
لیلیٰ نے کیا ضبط ہی گو جان پر اس کی　　اک کوفت سی دن رات رہی طعنہ زنی سے
اسباب طرب سارے تھے آمادہ ولیکن　　ہمت مری سائل نہ ہوئی چرخِ دنی سے

تھا مصحفی مشتاق جو دیدارِ خدا کا ق مستغنی ہی گزرا وہ گدا اور غنی سے
موسیٰ کی طرح لیک زباں بند نہ رکھّی
ہر شام و سحر نعرۂ رَبِّ اَرِنی سے

428

چشم[1] کے پردے کیے واں مے گلابی رنگ نے شیشۂ دل پر مرے یاں خاک باندھی سنگ نے
صبح سے تا شام ہے شغلِ شمارِ تارِ جیب کیا ہنر پیدا کیا ہے عاشقِ بے ننگ نے
خطِ سبزہ روے سرخ اس کا ہوا ہے آشنا کی ہے آمیزش بہم یعنی شراب و بنگ نے
رہ گئی بوسے کی حسرت ہو مرے دل میں گرہ یہ بدن اپنا چرایا اس دہانِ تنگ نے
گل کو غش آیا ہے اور کرتے ہیں غنچے جیب چاک کیا ستم برپا کیا بلبل ترے آہنگ نے
نالۂ عاشق کو کیا ہے مجلسِ عشرت سے کام باندھ رکھی ہے ہوا یاں اپنی تارِ چنگ نے
گرد باد آتا ہے یہ ناقے کے پیچھے دیکھیو یا کیا ہے قیس کو رقصاں صداے زنگ نے
ہاے رہتا ہی نہیں اک وضع پر اس کا مزاج جان سے مارا ہمیں ہر دم کی صلح و جنگ نے
نالہ کرنے کی گئی طاقت جو مجھ سے مصحفی
خلق میں رسوا کیا مجھ کو شکستِ رنگ نے

429

نہ رشک کش ہوں جواے گل صبا بدن کو لگے میں چاہتا نہیں تیرے ہوا بدن کو لگے
وہ پُر حجاب ہے محبوب میرا از پۓ غسل جسے اتارتے کُرتہ حیا بدن کو لگے
پھپھولے دیکھ مرے کیا عجب کہے جو طبیب کہ اس مریض کے چندے حنا بدن کو لگے
جلاؤ پہلے مجھے کوئی یہ کہے تھا پتنگ جب آگ شمع کے سر تا بہ پا بدن کو لگے
پڑے ہیں کشتۂ تیغ اس کی رہ میں رکھیو یہ ہوش کسی کے تا نہ تری پشتِ پا بدن کو لگے

1۔ اصل کے حاشیے میں یہ عبارت بھی ہے: "حسبِ فرمائش نواب جلال الدولہ بہادر عرف مرزا مہدی علی خاں بہادر گفتہ شد"

بتاں میں ہم تو اسے جامہ زیب کہتے ہیں کہ جو لباس وہ پہنے بھلا بدن کو لگے
وہ چونک خواب سے اٹھ بیٹھے اتنا ہے ذی ہوش گر اس کے دستِ تصور ذرا بدن کو لگے
جو خوں پیے نمکیں ترے لب کے کُشتے کا تو چھوڑ ہڈیاں کھانے ہما بدن کو لگے
ہے آئینے کا یہ منھ اس کے دو بدو ہووے نہ مہر و ماہ کی جس کے صفا بدن کو لگے
شفا ہے سودۂ الماس ہم جریحوں کی ہو سودمند وہی جو دوا بدن کو لگے
ضعیف اتنا ہوا ہوں کہ شمع کے مانند قبا جو پہنوں نہ ہرگز قبا بدن کو لگے
غمِ فراق کو کر مصحفی نہ اپنا قُوت
غذا وہ کھا تو میاں جو غذا بدن کو لگے

430

نزع میں ہیں ہم تک اس ساعت خدارا پوچھیے اب تو کیجے رحم اور مطلب ہمارا پوچھیے
بے تکلف صاف کہہ دوں گا کہ ہاں عاشق تو ہوں دردِ دل میرا نہاں یا آشکارا پوچھیے
آپ کی چاہت میں کیا کیا تو ہمے مجھ پر بندھے میرے قاصد سے مرا احوال سارا پوچھیے
ہیں دلِ معشوق کی سختی سے نالاں کیا کہیں شیشہ طبعوں سے نہ ظلمِ سنگ خارا پوچھیے
ہم کلامی ننگ ہے مجھ سے تو پیارے میرا حال چتونوں ہی میں کبھی کر کے اشارا پوچھیے
ایک شب تو خواب میں عاشق کے آ کر میری جاں ہجر کا دن تو نے، کہہ کیونکر گزار پوچھیے
جو بلا آئی، ہوئی وہ نوشِ جاں میاں مصحفی
کیا فقیروں سے گوارا ناگوارا پوچھیے

431

کب سر کو مرے ٹھوکر وہ مار نہیں چلتی اٹھکھیلی سے کب تیری تلوار نہیں چلتی
اس دستِ حنائی کا جو دست گرفتہ ہے موٹھ اس پہ دوالی میں زنہار نہیں چلتی
چکّی جو فلک کی ہے، ہے اس میں بھی کچھ حکمت بے پیچ نہیں پھرتی، بیکار نہیں چلتی

بسمل کا گلا تیرے ہرچند کہ نازک ہے تو بھی تو چھری تجھ سے، خونخوار! نہیں چلتی
اس کے کج و واکج کے ہم اس پہ بھی بندے ہیں گو موجِ رواں تیری رفتار نہیں چلتی
ہے دم کے سبب انساں عرصے میں خرامش کے ہرگز کبھو کٹھ پتلی بے تار نہیں چلتی
یہ حکمِ قلندر میں کہتے ہیں تصرّف تھا ہر ایک کے کہنے سے دیوار نہیں چلتی
سرگشتگی اپنی کا کیا خاک لکھوں نقشا خواہش پہ طبیعت کی پرکار نہیں چلتی
سررشتۂ کار آخر یاں ہاتھ سے جاتا ہے ہنگامِ اجل نبضِ بیمار نہیں چلتی
منصور کا ہنگامہ ہم پھر بھی تو واں دیکھیں کیوں عرصۂ محشر تک یہ دار نہیں چلتی

خط غصے کا تو کس کے اے مصحفی پڑھتا ہے
فرفر تو زباں تیری اے یار نہیں چلتی

432

کب آنکھ تری ان کو سنکار[1] نہیں چلتی کس دم دو برادر میں تلوار نہیں چلتی
شیریں کبھی جاتی ہے فرہاد کی جانب کو بے ننگ نہیں چلتی، بے عار نہیں چلتی
جاں سوے عدم میری جانے کو تو حاضر ہے پر بے مدد تیغِ خونخوار نہیں چلتی
تارِ رگِ گل بلبل بے صوت ہے کیوں اتنا کیا اس پہ یہ مضرابِ منقار نہیں چلتی
جو صاحبِ تمکیں ہیں کیا کام انھیں جنبش سے ہنگامِ وغا تیغِ کہسار نہیں چلتی
بے اصلوں کی خاطر یاں اسباب ہے گردش کا پہیّوں کے لگانے سے دیوار نہیں چلتی
اب لیلیٰ کی مچلائی[2] یہ ہمرہِ مجنوں ہے دو چار قدم چل کر زنہار نہیں چلتی
پانوں کی لکھوٹی پر کب خون نہیں ہوتے مسّی کی دھڑی پر کب تلوار نہیں چلتی
جو صاحبِ نعمت ہیں وہ سر کو جھکاتے ہیں اوپر کو کبھی شاخِ پُر بار نہیں چلتی
خورشید کی سوزن ہے ہر تار شعاع ان کا یعنی یہ گھڑی بھی تو بیکار نہیں چلتی
مجنوں کی نحیفی پر لیلیٰ کو ترحّم ہے پھولوں کی چھڑی اس پر جو مار نہیں چلتی

1۔ سنکارنا : اشارہ کرنا 2۔ مچلائی: ضد، مچل جانا

جو چاہے کرے اس کو وہ مصحفی مالک ہے
بندے کی خدا سے کچھ اے یار نہیں چلتی

433

جان آنکھوں سے شبِ وصل بہ دقت نکلی
بعد اک عمر کے نکلی تو یہ حسرت نکلی
یار آتا تھا زیارت کو بڑی خیر ہوئی
کہ شہیدانِ وفا میں مری تربت نکلی
آتشِ حسن میں جل جل کے قلم خاک ہوا
نہ مصور سے مرے یار کی صورت نکلی
رستے والوں نے کیا شورِ قیامت برپا
کوچۂ یار سے جس دم مری میّت نکلی
اور ہنگامہ بپا حشر میں اک ہوگا اگر
نعش کشتے کی ترے روز قیامت نکلی
رشک نے حشر کے دن بھی نہ جگایا ہم کو
ہم نہ سمجھے کہ کدھر صبحِ قیامت نکلی
اس کی تصویر کو میں نے لیا چھاتی سے لگا
آہ کچھ طرزِ نگہ سے وہ محبت نکلی
ظلم کی کس نے پڑھائی تھی یہ تختی تجھ کو
تیغ جب نکلی ستم گر، تری بابت نکلی
درِ جنت پہ جو پہنچا ترا مغرور مزاج
کف پہ اک مور لیے کاسۂ شربت نکلی
اس کے پہلو میں اگر تربتِ معشوق بنی
روح عاشق کی وونہی بہرِ زیارت نکلی
مصحفی پیر ہوا میں پہ کروں کیا اس کو
روے خوش کی جو مرے دل سے نہ الفت نکلی

434

ہم اگر ننگ کو غیرت کے گوارا کرتے
تیری خاطر سے رقیبوں کی مدارا کرتے
سر کو ہم پہلے ہی مقتل میں جھکا بیٹھے تھے
کیوں کہ قاتل کا تہِ تیغ نظارا کرتے
پھول نرگس کا اگر ہاتھ ہمارے آتا
ہم تصور پہ تری چشم کے وارا کرتے
آبِ جوشاں کی طرح حسنِ شباب اس کا تھا
ڈوبے ہم اور گئے جوں جوں کنارا کرتے
تیرے بیمار کی بدلی نہیں اب تک ہیئت
عمر گزری ہے مسیحا کو بھی چارا کرتے

طرفہ مجلس نظر آئی ترے حیرانوں کی دیکھتے ہیں، نہیں آنکھوں سے اشارا کرتے
کھول دی آنکھ میں جلد اپنی غشی سے ورنہ بیٹھے بالیں پہ مجھے یار پکارا کرتے
ہر قدم اپنا وہاں تو دمِ شمشیر پہ تھا کیوں کہ ہم کوچۂ قاتل سے گزارا کرتے
ہو گیا ہم سے میاں مصحفی وہ اور خفا
کاش ہم اس سے نہ مذکور تمھارا کرتے

435

وے نہ تھے ہم کہ کبھی شکوۂ خوباں کرتے گریہ رگ رگ میں فرونشترِ مژگاں کرتے
ابھی گھر سے ہمیں محروم نہ پھیر، اے بے رحم آخر آئے ہیں سبھی خاطرِ مہماں کرتے
ان کی آنکھوں سے سرکتا جو دوئی کا پردہ اک طرف سجدہ بہم گبر و مسلماں کرتے
قیدِ یوسف کی زلیخا کو بُری سوجھی ہائے ایسے لوگوں کو نہیں ساکن زنداں کرتے
دردِ نظارہ سے ہوتی جو خبر تم کو بتاں بال زلفوں کے نہ عارض پہ پریشاں کرتے
یوں تو سو بار مسیحا نے بلایا ہے ہمیں آپ ہم درد کا اپنے نہیں درماں کرتے
اس نگر میں ہمیں لے آئی ہے قسمت جس جا مشکلِ کارِ غریباں نہیں آساں کرتے
منزلِ صعبِ جنوں ہو گئی طے ہم جو رہے ذکرِ صبحِ وطن و شامِ غریباں کرتے
رنگِ امید دیا گریۂ خونیں نے دکھا کب تلک سیرِ بہارِ گلِ حرماں کرتے
پاسِ رسوائیِ معشوق سے ہم شعلہ زباں شمع ساں جلتے ہیں لیکن نہیں افغاں کرتے
خواب میں بھیجتے خط دے کے خیالی قاصد کچھ تو میری بھی تسلّی کبھی خوباں کرتے
پارسائی سے بتنگ آئے ہیں ورنہ ہم تو عرضِ احوال تو گاہے کسی عنواں کرتے
اس کے تلووں کی صفا سامنے تھی شب کیونکر رخ بھلا تیری طرف اے مہِ تاباں کرتے
مصحفی کوئی پہنچتا ہی نہیں داد کو یاں
عمر گزری ہے ہمیں نالہ و افغاں کرتے

436

نہ گئی پیش کوئی بات مری اس گل سے　اس کی شوخی کا کروں کیا میں گلہ بلبل سے
نیند گو چشم صراحی میں بھری ہے لیکن　شیشہ سونے نہیں دینے کا اسے قلقل سے
کوئی آزاد اگر ان کی نظر پڑتا ہے　باندھ لیتے ہیں گلا اس کا بتاں کاکل سے
لالہ و گل کے مجیرے جو لگے دینے تال　ناچنے سرو لگا زمزمۂ صلصل [1] سے
بارے اے مطربِ خوانندہ ذرا تھام زباں　اڑ گئے کان کے پردے تو مرے اس غل سے
بحرِ ہستی کا پھر آسان ہے انساں کو عبور　آنکھ اٹکے نہ اگر نقش و نگارِ پل سے

مصحفی میں تو علیؑ سا کوئی دیکھا نہ سوار
کفر مسمار رہا جس کے سُمِ دُلدل سے

437

آب سے یاں گوہرِ تر کا سا عالم تن پہ ہے　دیدۂ ماہی وہاں گرداب کے روزن پہ ہے
میں روادارِ اذیّت اس کا کس دن تھا کہو　رنج سا کیوں میرے ہونے سے دلِ دشمن پہ ہے
بندۂ خاکی جھکائے رہ سرِ تسلیم کو　بارِ طوقِ زندگی جب تک تری گردن پہ ہے
کچھ نہیں چنگیز خاں سے کم وہ قتالِ جہاں　تہلکہ سا تہلکہ دن رات مرد و زن پہ ہے
قتل ہونے سے ملے ہے یاں حیاتِ جاوداں　زندگی اپنی دمِ شمشیرِ مرد افگن پہ ہے
الفتِ چسپاں کا عالم اس سے آتا ہے نظر　داغِ خوں کس کشتہ کا اب تک ترے دامن پہ ہے
لعل لب کا اس کے کیا شعلہ ہوا پرتو فگن　جو بہارِ ارغواں رنگِ گلِ سوسن پہ ہے
دیکھیو قسمت کی خوبی ہم کو کام اس سے پڑا　ٹوٹ جانے کا گماں جس تیغ سخت آہن پہ ہے
کسمسانے سے ترے چولی گئی ساری مسک　رحم بھی ظالم تجھے اس نازنیں چپکن پہ ہے
مے کا نرگس کو تو ہے افیون کا لالے کو کیف　تم بھی گر آؤ تو ان روزوں سماں گلشن پہ ہے

1۔ صلصل: فاختہ

جاؤ اپنے اپنے گھر کو ہو چکا سو ہو چکا حشر کا ہنگامہ کیوں، یارو، مرے مدفن پہ ہے
مصحفی گر میں کروں نالہ تو سب ہو جاویں گرم
جوش میں آنا رقیبوں کا مرے شیون پہ ہے

438

لب کا ترے ہے یار لکھوٹا سرخیِ پان و رنگ مسی یا ہے یہ جوشِ خونِ سودا سرخیِ پان و رنگ مسی
شیفتہ اپنا کیوں کہ نہ ہو وہ اس کو رکھے ہے آئینے میں دو دو پہر تک محو تماشا سرخیِ پان و رنگِ مسی
لعلیں لب وہ برگِ گلِ تر مانی کو دکھلاتے ہیں رو م و حبش کا کھینچ کے نقشا سرخیِ پان و رنگِ مسی
جب لب پر رکھتا ہے اپنے شب کو وہ گل جامِ شراب اور کرے ہے نشہ دو بالا سرخیِ پان و رنگِ مسی
کاجل بھی آنکھوں کا اس کی سیف کشیدہ مجھ پر ہے خصمِ جان نہیں ہے تنہا سرخیِ پان و رنگِ مسی
بوسوں کی اس شب ہے چڑھائی آبرو رہ جا گر رکھ لے اس لعلِ لب کا پردا سرخیِ پان و رنگِ مسی
کون مزے لوٹے گا تمھارے یہ تو بتا دو مجھ کو تم آج ستارہ کس کا چمکا سرخیِ پان و رنگِ مسی
آگ میں پھونکا اور جلا کر کوئلہ کر دیا عاشق کو ظلم کیا یہ تم نے کیسا سرخیِ پان و رنگِ مسی
اس کی قرولی جیسے بیڑی اس کا تیغہ موجِ نیل خون کریں دیکھیں کس کس کا سرخیِ پان و رنگِ مسی
جنگل میں جا کر کے اس نے چربہ اس کا کھینچ لیا دیکھ گیا تو لالۂ صحرا سرخیِ پان و رنگِ مسی
مصحفی خوں روتا ہے کب سے اور ہے لبوں پر دودِ آہ
رحم کرو ٹک اس پہ خدارا سرخیِ پان و رنگِ مسی

439

جو یاں ہے سو پھیلائے ہوئے پانو پڑا ہے کیا گورِ غریباں بھی اک آرام کی جا ہے
لازم ہے مجھے تیرگیِ بخت کہ آخر دیوار کا سایہ سوے دیوار گیا ہے
کیوں آج ہلا جائے ہے دل بانگِ جرس سے کیا قافلے کے پیچھے کوئی آبلہ پا ہے
کچھ روز میں صحبت چمنِ دہر کی دیکھی جو زاغ ہے یاں زعم میں اپنے وہ ہما ہے

قاصد، تو ادھر جاوے تو اتنا اسے کہیو　　مدت سے کوئی شخص گرفتار بلا ہے
غنچے کو تبسم کی جگہ یاں نہیں ملتی　　صحنِ چمنِ دہر زبس تنگ فضا ہے
تکلیف نہیں دی میں کبھی دستِ جنوں کو　　بے عربدہ یاں پیرہنِ سبز قبا ہے
یاں آکے بھلا زندۂ جاوید رہا کون　　ہستی کا سبھی ملک یہاں ملکِ فنا ہے
جوں نقشِ قدم ہم سے بھی افتادہ اٹھے ہیں　　ہر چند کہ اس دشت میں ہر خار عصا ہے
ہے معجزہ اتنا تو مری بادِ نفس میں　　چاہا ہے جو میں غنچۂ تصویر کھلا ہے
بے لطف ہوا اپنا شبِ ہجر میں مرنا　　آئی نہ شبِ وصل قضا سے یہ گلا ہے

اب مصحفی کیا مہر کروں لب پر اب اپنے
قصہ مری رسوائی کا عالم نے سنا ہے

440

مدت سے ہوں میں سرخوشِ صہبائے شاعری　　ناداں ہے جس کو مجھ سے ہے دعوائے شاعری
میں لکھنؤ میں زمزمہ سنجانِ شہر کو　　برسوں دکھا چکا ہوں تماشائے شاعری
پھبتا نہیں ہے بزمِ امیرانِ دہر میں　　شاعر کو میرے سامنے غوغائے شاعری
اک طرفہ خر سے کام پڑا ہے مجھے کہ ہائے　　سمجھے ہے آپ کو وہ مسیحائے شاعری
ہے شاعروں کی اب کے زمانے میں یہ معاش　　پھرتے ہیں بیچتے ہوئے کالائے[1] شاعری
لیتا نہیں جو مول کوئی مفت بھی اسے　　خفّت اٹھا کے آتے ہیں گھر وائے شاعری
اے مصحفی ز گوشۂ خلوت بروں خرام　　خالی ست از برائے تو خود جائے شاعری
ہر سفلہ را زبان و بیانِ تو کے رسد　　آرے توئی فغانی و بابائے شاعری

مجنوں منم چرا دگرے رنج می برد
در حصۂ من آمدہ لیلائے شاعری

1۔ کالا: سامان (نے غمِ دزد و نے غمِ کالا)

441

ذرا سی دیکھ اس سینے کی تختی ہوئی شرمندہ آئینے کی تختی
یہ پرچہ ہے زمرّد کا مربع کہ ہے اس کان میں مینے کی تختی
طلسمِ چرخ کو باطل نہ سمجھو یہ ہے استاد دیرینے کی تختی
وہ کیا سختی کو سمجھے جس کا سینہ رہا ہو شال و پشمینے کی تختی
سرِ استاد پر توڑے ہے وہ لوح پڑھا دی کس نے یہ کینے کی تختی
تبھی سے مصحفی تھا اس پہ عاشق
کہ تھی نادِ علیؑ سینے کی تختی

442

پائی نرگس نے کہاں آنکھ نشیلی کون سے گل کی کلی نکلی چھبیلی ایسی
تیری سج دھج پہ صنم، کیوں کہ نہ بلبل مرجائے برگِ گل کی بھی نہیں گات سجیلی ایسی
اک تو بنی وہ بلا، دوسرے نتھنے آفت کہیں ہوتی بھی ہے بندوق دو نیلی ایسی
سرخیِ چہرہ تری ہم پہ بلا لائی ہے گرچہ سوزندہ نہ تھی نارِ خلیلی ایسی
دیکھ اک پیچ ترا سات پری یوں بولی دل میں چبھتی ہے مرے وضع نکیلی ایسی
کس کی آنکھوں نے تجھے چوس لیا اے نرگس سچ بتا مجھ کو تو کیوں ہو گئی پیلی ایسی
مانگنا جو اسے لینا اسی ساعت ہٹ کر حور اس عمر میں دیکھی نہ ضدیلی ایسی
مصحفی جس کے تئیں دیکھ کے بیچا[1] سمجھے
شکل اپنی نہ بنا گنبدِ نیلی ایسی

443

گدّھوں کے بازو لگتے ہیں یکسر بھرے بھرے آئی بہار، نکلیں ہیں پتّے ہرے ہرے

1۔ بیچا: ڈراونی شکل والی؟

پتّے ہر ایک شاخ سے نکلے ہرے ہرے پھولوں کے گال پھر نظر آئے بھرے بھرے
آیا نہیں وہ اور شبِ انتظار میں مرجھا گئے ہیں پھولوں کے دونے دھرے دھرے
ہوتا ہے عاشقوں پہ جدائی سے جب عتاب وہ قبر سے پکاریں ہیں اب تک "مرے مرے"
جاؤں جو اس کے پاس میں آلودۂ شراب وہ نیک پاک مجھ کو کہے ہے "پرے پرے"
اس کی زباں بھی قندِ مکرّر سے کم نہیں
اے مصحفی کہے ہے جو مجھ کو "ارے ارے"

444

جو بندۂ خاکی کہ فراموشِ زمیں ہے اک دم میں جو دیکھو تو ہم آغوشِ زمیں ہے
خوں اُبھّے[1] ہے عاشق کا تو ہرگز نہیں چھپتا ہر چند فلک صورتِ سرپوشِ زمیں ہے
زندہ کبھی مردے سے نصیحت نہیں لیتا ہر چند کہ گویا لبِ خاموشِ زمیں ہے
سننے کو نویدِ خبرِ مرگِ عزیزاں جو گور شکستہ ہے وہ اک گوشِ زمیں ہے
یہ کوہ تو کچھ اتنی گرانی نہیں رکھتے عصیاں سے تہِ بارگراں دوشِ زمیں ہے
لاغر کے ستانے کا میں منکر نہیں ہرگز ہو جاتا ہے ایسا بھی جہاں جوشِ زمیں ہے
کوچے میں ترے چلتی ہے تلوار جو ہر دم کشتوں کا نت اک دجلۂ خوں نوشِ زمیں ہے
چل سیرِ گلستاں کو ٹک اے ماہ کہ اس جا پھولوں سے قصب[2] پوشِ تن و توشِ زمیں ہے
ہوں کس کا زخود رفتہ جو اے مصحفی مجھ کو
نے دھیان فلک کا ہے نہ کچھ ہوشِ زمیں ہے

445

گھر اپنا کیا ہے دلِ بے غم میں جو غم نے پھر مار رکھا ہے ہمیں اک تازہ صنم نے
قسمیں تو بہت کھاوے ہے جھوٹی مرے سر کی جی سخت جلایا ہے ترے قول و قسم نے

1۔ ابھنا، ابھن جانا: ابلنا، جوش میں آنا 2۔ قصب: باریک ریشمی کپڑا

ہر گام پہ واں بس کہ کھدے چاہِ بلا تھے
اس کوچے میں پائی نہ جگہ اپنے قدم نے

آتش میں جلا قلب کو پانی میں بجھایا
زرگر کا کیا کام ترے عشق میں ہم نے

حیراں ہے ترا سبزۂ خط دیکھ کے عالم
یہ سبزہ ہے کیسا جو لگا آگ پہ جم[1] نے

اس وقت تو چونک اٹھتے جو تو قبر پر آتا
رخصت ہمیں اتنی بھی نہ دی خوابِ عدم نے

اے مصحفی جب آئی مرے دینے کی باری
تب کھینچ لیا ہاتھ ہی اربابِ کرم نے

446

تم جو روٹھے ہو صنم مجھ سے، سزا ہے میری
دشمنِ جاں مری البتہ وفا ہے میری

تو سنے یا نہ سنے ٹھہرنے والا میں نہیں
پھیری والوں کی سی اے یار صدا ہے میری

ہے دقِ عشق، مسیحا سے کوئی یہ پوچھے
جی بچے گا کہ نہیں کچھ بھی دوا ہے میری

ذکر مت گیسوئے سنبل کا تو کر مجھ سے صبا
جی الجھتا ہے طبیعت جو خفا ہے میری

میری جانب سے، گر اُس کو میں ترا جانا ہو
محرمِ راز فقط تو ہی صبا ہے میری

کبھو کاہے عصمتِ بے رحم و ستم گر پیارے
کیوں نہیں بولتے تقصیر وہ کیا ہے میری

مصحفی ایسے پری رو پہ جو عاشق میں ہوا
اس کی تقصیر نہیں کچھ، یہ خطا ہے میری

447

ابرو کے تیرے صدقے شمشیر یہ ملی ہے
جی زلف پر بھی وارا زنجیر یہ ملی ہے

صورت کا تیری نقشا بہزاد لکھ کے بولا
یوسف کے حسن سے بس تصویر یہ ملی ہے

یعنی کے بعد مردن پھر خرخشا نہیں کچھ
خوابِ جہاں کی ہم کو تعبیر یہ ملی ہے

تڑپا میں ہجر کی شب جتنا کہ جی نے چاہا
بس جرمِ عاشقی کی تعذیر یہ ملی ہے

1۔ جم نے : جمنے

خونِ جگر پہ ہر شب دی ہے برات غم نے دفتر سے تن کے ہم کو جاگیر یہ ملی ہے
تن خاک ہوگیا ہے اپنا لحد میں جاکر بعد از فنا ہمیں تو اکسیر یہ ملی ہے
خط سے گزر کے بوسہ کیوں زلف کا نہ لیویں اس مزرعہ سے ہم کو توقیر یہ ملی ہے
صفِ نعال جا گہ ٹھہری ہے مصحفی کی
مجلس میں اس کی اس کو توقیر یہ ملی ہے

448

بے قراری ہے شب و روز فزوں کیا کیجے کیوں کہ دل سینے سے ہو جائے بروں کیا کیجے
پھر رکھی سان پہ شمشیر تعدی اس نے پھر ہوا عشق مرا تشنۂ خوں کیا کیجے
عشق پیری میں تو دیکھا نہ سنا تھا ہم نے شرحِ رسوائیِ احوالِ زبوں کیا کیجے
دیر سے اپنی کہانی میں کہے جاتا ہوں پر ادھر سے تو ابھی ہاں ہے نہ ہوں کیا کیجے
مصحفی وصل کی کچھ بن نہیں آتی تدبیر
سر ہے زانو پہ مرے کب سے نگوں کیا کیجے

449

کانپے ہے سدا برق تری جنبشِ لب سے دوزخ کو بھی اندیشہ ہے اس نارِ غضب سے
چمکاوے ہے عاشق کے تئیں تیرگیِ بخت ہے روشنیِ شمع تو تاریکیِ شب سے
جی ہار گئے ہم نہ رہے کام کے آگے پہنچے درِ مقصد پہ جو رنج و تعب سے
بوسہ کفِ پا کا تو بہت سہل تھا لیکن خود پانو میں باہر نہ رکھا حدِ ادب سے
سقا کیِ حسن اس کی اگر ہند میں یہ ہے تو شیشہ نہ نکلے گا کبھی شہرِ حلب سے
تھا نالہ کشِ درد میں خو کردۂ ماتم صحبت نہ ہوئی گو کہ مری سازِ طرب سے
تو آگے تو دوکھے تھا صنم حقہ کشوں کو سچ کہہ نئی قلیاں ہوئی ہمدم تری کب سے
سیرابیِ رنگ اتنی کہاں لعل نے پائی ہر بات میں خوں ٹپکے ہے ظالم ترے لب سے

اس خانہ خرابی کا برا ہووے نہیں تو عشرے میں تو گھر اس کو میں لاتا کسی ڈھب سے

اے مصحفی صد شکر ہوا وصل میسّر
افطار کیا روزہ میں اس لب کے رطب سے

450

حیراں سی جو نگاہیں رہ جاتیاں ہیں تیری کیا آنکھیں آرسی سے شرماتیاں ہیں تیری
مجھ سے جو میری زہرہ ملتی نہیں ہے اب تک اے پیرِ چرخ سب یہ بدذاتیاں ہیں تیری
چہرے پہ جب سے اپنے تو نے لیا ہے برقع اک اک نظر کو آنکھیں ترساتیاں ہیں تیری
لہروں کا تھرتھرانا کیونکر پسند آوے یعنی نظر میں اپنی خوش گاتیاں ہیں تیری
ہم کو تو وصل کی شب اک داغ دے گئی ہے کھل کھل کے باتیں کرنی یاد آتیاں ہیں تیری
یہ بانک پن نہیں تو پھر اور کیا ہے سچ کہہ جو دیکھ مجھ کو زلفیں بل کھاتیاں ہیں تیری

اے مصحفی اسے بھی رکھتا ہے شاد جی میں
ہر دم وہ میرا کہنا کیا چھاتیاں ہیں تیری

451

ان منعموں کے ہاتھ سے طرزِ دہش اکثر گئی چشمِ حیا اندھی ہوئی، مسکیں مروّت مر گئی
شہرت بہ زیرِ آسماں رکھتے تھے حاتم کی سی جو اس کا نہیں ملتا نشاں کیا جانے وہ کیدھر گئی
تن کے نشیمن سے سفر دشوار اسے آیا نظر سو بار جانِ مضطرب اندر گئی باہر گئی
ناسورِ داغِ سینہ کو ماء الحیات اپنا سمجھ تن خاک کا پھر ڈھیر ہے کجلا جو یہ اخگر گئی
سو دل پریشاں ہو گئے عالم اندھیرا ہو گیا گدی سے جس دم دوش تک کاکل تری اتر گئی
گویا زمینِ کربلا تھی قتل گاہِ عاشقاں جو بدلی آئی اس طرف گریاں بہ چشمِ تر گئی

دیکھا نہ میں نے ہند میں جب خستۂ پیشاوری
لینے برنج اے مصحفی روح اپنی پیشاور گئی

452

جاویں گے ہم چمن سے نہ بن جی دیے ہوئے شبّو کے گل ہیں سید ھے تمنچے کیے ہوئے
مرتے ہیں انتظار میں امیدوارِ قتل جاتے کدھر ہو ہاتھ میں تیغا لیے ہوئے
اے جذبِ شوق اس کو بہکنے نہ دیجیو
آتا ہے بت کدے سے وہ بت مے پیے ہوئے

وسعتِ تنگِ جہاں بس کہ نہ تھی قابلِ دید نہ پھرا تیر کماں کا جو گیا میداں سے
مصحفی خار ہیں سب اپنی زباں کے ہاتھوں
ہے خود اکسیر جو ہو ضبطِ نفس انساں سے

453

ہر دم تہِ دنداں جو بتِ شوخ کا لب ہے ہرگز نہیں معلوم کہ یہ کس پہ غضب ہے
سر رکھے جو زانو پہ میں ہوں محوِ تصوّر ہے ہجر کی سب لیک مجھے وصل کی شب ہے
کیا روٹھ گیا مجھ سے مرا یار الٰہی! کیوں آنکھ ملاتا وہ نہیں کچھ تو سبب ہے
ہر دم صفِ مژگاں میں جو ہے موت مقابل ہر پیر و جواں کو مرے جینے کا عجب ہے
ہووے گی جو محشر میں تو اعمال کی پُرسش تجھ سے نہ یہ پوچھیں گے کہ کیا تیرا نسب ہے
بس تیرے لیے آیا تھا آئینہ حلب سے بے روئی سے تیری اسے پھر قصدِ حلب ہے
اے مصحفی رکھ اس میں قدم اپنا سنبھل کر
سودا کی زمیں ہے یہ، تجھے جائے ادب ہے

454

مجھ کو سحر خجل نہ کرے روے یار سے اتنی ہی آرزو ہے شبِ انتظار سے
جاں بر ہوئے گر اب کے شبِ انتظار سے شکوہ کریں گے صبحِ جدائی کا یار سے

پتھر نمیں بن گیا ستمِ روزگار سے
ٹوٹے گا آبلہ نہ مرا نوکِ خار سے

غم حشر کا کسے ہے کہ اپنا یہ جسم زار
ہے یہ یقیں کہ اٹھ نہ سکے گا مزار سے

اللہ رے شوقِ دید ترا بعدِ ذبح بھی
طرزِ نگاہ نکلے ہے چشمِ شکار سے

رستم کی کیا ہے تاب کہ میدانِ شرط میں
گھوڑا نکالے اس بتِ چابک سوار سے

وہ ناتواں ہیں ہم کہ ترے رہ گزار میں
لیتے ہیں مانگ اٹھنے کی طاقت غبار سے

رکھا ہے مار اس کے علی بند[1] نے مجھے
وہ انگلیاں بھی کم نہیں کچھ ذوالفقار سے

جاتا ہے کوئی پیری میں عاشق کا سوزِ دل
جب کہنہ ہو تو جھڑتی ہے آتش چنار سے

اس شعلہ رو سے گرم ہے شاید کنارِ غیر
آتی ہے بوے یاس دلِ داغدار سے

جو مر فلک نے ایک نہ ہونے دیا وفا
وعدے تھے سیکڑوں دلِ امیدوار سے

گویا کلید قفل طبیعت تھی شاخ گل
کیا کیا طلسم ہم پہ کھلے ہیں بہار سے

آنسو ہمارے ابر پہ ہوتے ہیں طعنہ زن
نالے کو ہم عنانی ہے برق و شرار سے

خاک اس کی اس کے کوچے میں رہنے بھی دے صبا
یہ کیا خلش ہے مصحفیِ خاکسار سے

455

قدر اوقات کی اپنی اگر انساں جانے
کنج خلوت کے تئیں ملکِ سلیماں جانے

عاشقوں میں اسے کیوں کر نہ کہیں دیوانہ
فصلِ گل جو نہ گریباں کو گریباں جانے

ہو نہ دل بستہ کسی چیز کا یاں صاحبِ ہوش
رہے دنیا میں ولے آپ کو مہماں جانے

بیش و کم رکھتی ہے کچھ اس سے صبا آگاہی
تو تو کیا حال مرا اے گلِ خنداں جانے

خوبرو کے تئیں گو اور نہ ہو عقل و تمیز
چاہیے اتنا کہ انسان کو انساں جانے

قصۂ عشق مرا اب تو ہوا افسانہ
اس کا کچھ غم نہیں گو گبر و مسلماں جانے

مصحفی چاہیے سودائی بہ غفلت دانا
ہر ستارے کو شبِ ہجر کے پیکاں جانے

1۔ علی بند: کلائی میں یا انگلیوں میں پہننے کا ایک زیور

456

جسے وہ چشمِ تغافل شعار بھول گئی
نگاہ ناز بھی کر کے شکار بھول گئی

نہ غنچہ لائی گلِ ارمغاں کبھی افسوس
ہمیں قفس میں نسیمِ بہار بھول گئی

اجل نے سیکڑوں مارے فراق میں اس کے
ہمیں کو ایک شبِ انتظار بھول گئی

ہوا نے خاک دھولینڈی[1] میں سب کی دی برباد
مگر مرا ہی وہ مشتِ غبار بھول گئی

یہ آسیاے فلک سے بڑی ہوئی تقصیر
کہ استخواں مرے کرنے غبار بھول گئی

گئی جو گورِ غریباں میں روحِ شاہدِ حی
وہ قیس ہی کا طوافِ مزار بھول گئی

ملے تھا جس کے دوراہے میں نجد کا رستہ
وہ راہ لیلیِ محمل سوار بھول گئی

کہاں کی عرضِ تمنا کہ اپنی ہستی ہی کو
ہوئی جب آرسی اس سے دوچار بھول گئی

نشے میں جام چڑھا تو گئی وہ نرگسِ مست
چڑھاتے وقت پر اس کا اتار بھول گئی

بہار لالہ و گل اس نے آپ ہی دیکھی
ہمیں چمن میں بلانا ہزار بھول گئی

ادب جو خسرو کا پنہاں تھا دل میں شیریں کے
میانِ لذتِ بوس و کنار بھول گئی

یہ صاف قحبۂ دنیا ہی کی لگاوٹ تھی
جو شب وہ پاس مرے اپنا ہار بھول گئی

مگر رہا نہ طرف اس کی مصحفی کا خیال
عروسِ طبع جو کرنا سنگار بھول گئی

457

دل زلف میں پھنسے تو خرابی لگی رہے
پھر واں سے چھوٹنے کی شتابی لگی رہے

شاید تری دکاں سے ہو اس مست کا گزر
اک سیخ کوئلوں پہ کبابی لگی رہے

میکش ہم اس کو جانتے ہیں جس کے ساقیا
دن رات منہ سے مے کی گلابی لگی رہے

گر بوسۂ لبِ نمکیں ہو محالِ عقل
پستے کی کچھ گزک تو شرابی لگی رہے

1۔ دھولینڈی: ہولی کا دوسرا دن (اس دن دھول اڑائی جاتی ہے)

حلم غرورِ حسن ہے اس پُر غرور کو یعنی کمر سے تیغ دو نابی لگی رہی
ہے حکمِ شاہِ حسن کہ روزوں کی شب مدام فرنی کی خوانچے پہ رکابی لگی رہے
ہو مصحفی سے کیوں کہ فراموش درسِ عشق
جب اس کو یاد روے کتابی لگی رہے

458

عقدۂ دل وا ہوا اس ابروے خم دار سے جو گرہ ہو سخت تر کاٹیں اسے تلوار سے
جھوٹے وعدوں کا تمھارے گرچہ ہے کس کو یقیں پر تسلّی سی ذرا ہو جاتی ہے اقرار سے
کوفت سی اب تک ہے دل پر حضرتِ دہلی میں ہم چار چشم اک دن ہوئے تھے نرگسِ بیمار سے
خود خبر ہو جاتی ہے ان کو وگرنہ فصلِ گل کب اسیروں تک صبا آئی گئی گلزار سے
کس کی چشم سرگیں سے اس کے دل پر آئی کوفت رنگ نرگس کا اڑا جاتا ہے کیوں رخسار سے
جب کہ رتی[1] تھی چمکتی کیا خطا ہم سے ہوئی کیوں نہ خوابِ وصل مانگا طالعِ بیدار سے
رخصتِ عریانی مرا کیونکر نہ پھر زیبندہ ہو آپ قاتل نے اسے اٹّو کیا تلوار سے
اہلِ معنی کا نہ ہووے کیوں کہ اس سے دل دو نیم نیم کی پتی کی صورت ملتی ہے منشار[2] سے
موتی مالا کا بھلا کیونکر اٹھاوے پھر وہ بوجھ جس کمر کو بے کلی ہو موتیا کے ہار سے
وصل کی شب بھی جو اس نے اس کا نظارہ کیا آنکھ عاشق کی لڑی پر حسرتِ دیدار سے
اے صبا کس مستِ مے کی بزم سے آتی ہے تو لغزشِ پا بوجھی جاتی ہے تری رفتار سے
طفلِ دہشت خوردہ ہوں سایہ پری کا یک طرف مجھ کو جھڑ آتی ہے تپ اب سایۂ دیوار سے
عمر نے جب منزلِ ہشتم میں رکھا ہو قدم
مصحفی کیا ہو سکے مجھ ناتوان و زار سے

1۔ رتی: قسمت، عروج۔ نور اللغات میں جان صاحب کا یہ مصرع دیا گیا ہے: ستارہ، جان مری آج کل ہے رتی پر
2۔ منشار: آرہ

459

ہر گوشہ جب اک قہر کا ٹکڑا نظر آوے
دل محفلِ خوباں سے نہ کیوں چشم تر آوے

وہ نخل ہوں میں سوختۂ صرصرِ حرماں
نے گل ہی کبھی جس میں لگے نے ثمر آوے

ایسی نہ بنا وضع تو اپنی بتِ کافر
جس سے کہ دلِ پیر و جواں کو عذر آوے

اے اشک رہِ روزنۂ چشم کو دھو رکھ
شاید کہ پھسلتا کوئی لختِ جگر آوے

واں بادِ صبا جائے نہ قاصد کا گزارا
یارانِ عدم رفتہ کی کیونکر خبر آوے

سر کاٹ کے قاصد کا وہ تشہیر کرے ہے
تا پھر نہ کسی کا کوئی پیغام بر آوے

لاکھوں درِ عصمت پہ نگہبان ہیں اس کے
ممکن ہے فرشتے کی بھی امید بر آوے

اک دل دو مصیبت میں گرفتار ہوا ہے
نے جائے قلق نے شبِ ہجراں بسر آوے

یوں دل کو مرے صید کیا خالِ جبیں نے
جس طرح کہ دانے پہ کبوتر اتر آوے

اے تیغ نگہ اپنے تو مشتاقِ جفا پر
وہ زخم لگانا کہ بہ جاں کارگر آوے

منظور یہ ذلت نہیں اب بابِ اثر تک
گر جائے کبھو نالہ مرا بے اثر آوے

گر مصحفی سوؤں میں کر اس رخ کا تصور
خورشید مرے خواب میں وقتِ سحر آوے

460

گر اس تنِ نازک پہ ہوا گرم چلے گی
تربت میں مری پیٹھ زمیں کو نہ لگے گی

اے جان بلب آمدہ کل جائے گا قاصد
پیغام وسلام آج اسے کہہ رکھ جو کہے گی

رہنے کا یہاں لطف ہے کیا تن سے نکل جا
اے روح تو کب تک ستمِ ہجر سہے گی

جاتے ہی ترے چال پڑی[1] کشورِ دل میں
کوسا تھا یہ کس نے کہ یہ بستی نہ بسے گی

انسان کی نرمی ہی اصالت کی ہے حجت
کاٹے گی وہی خوب جو تلوار کسے گی

1۔ چال پڑنا: لوگوں کا رخصت ہونا

گر معجزہ دکھلائے گی اپنا یہ شبِ وصل — تو صبح کی بانھن سے نہ گھڑیال بجے گی
شیریں کو نہ ہم جانیں گے معشوق ہے اس کی — فرہاد کی تربت پہ اگر منھ نہ ڈھکے گی
دیکھے اگر بہ چشمِ تامل تو مصحفی
اس کارگاہِ دہر کا مختار ایک ہے

461

نظرِ بد کا گماں مجھ کو سوے کوکب ہے — شب کو منھ کھول نہ اپنا تو کہ آخر شب ہے
طاعتِ بت کے سوا اور تمنا کب ہے — وہ سمجھتا ہے جو رہباں سے مرا مطلب ہے
جسمِ خاکی کی تگ و پو پہ تو نازاں مت ہو — بیٹھ جاتا ہے جو رستے میں یہ وہ مرکب ہے
اس کے جونکوں کے نشاں کتنے بھلے لگتے ہیں — سیب نقشے سے مقابل وہ چہِ غبغب ہے
روح نے قالبِ مردہ سے جدا ہو کے کہا — پھر کہاں گور میں پائے یہ جو فرصت اب ہے
کیا کروں سیرِ چمن یارِ مسی زیب بغیر — گل و سوسن تو مرے حق میں سیہ عقرب ہے
ماہِ تاباں کو نہ کس طرح سے رکھوں میں عزیز — کہ تری بندشِ دستار کا وہ قالب ہے
ماں پہ لیلیٰ کی کھلا کچھ تو کہ اب لیلیٰ کو — اتنی فرصت نہیں تا جاوے جہاں مکتب ہے
تیرے طالع نہیں رکھتی ہے پری کی تصویر — ورنہ تیری سی صنم اس میں شباہت سب ہے
مصحفی کا نہ کرو ذکر بتاں جانے دو
وہ بھی انسان ہے اس کا بھی تو کچھ مذہب ہے

462

تیرے بیمار کے بچنے کی توقع کب ہے — اور اک سدِ رمق اس میں یہ شب کی شب ہے
ہر نفس دودِ دلِ سوختہ گردِ لب ہے — کچھ تو صدمہ ہے جو یارب بہ پسِ یارب ہے
آئے ہیں دور سے مجنوں کی ملاقات کو ہم — لے چلو واں ہمیں لیلیٰ کا جہاں مکتب ہے
شبِ مہتاب میں سوتا ہے وہ مہتابی پر — مستعد بوسہ ستانی کا ہر اک کوکب ہے

جاں کنی پر مری آیا نہ تجھے رحم دریغ　ملک الموت کا اب تک تہِ دنداں لب ہے
مقتلِ گنجِ شہیداں سے تو آتا ہے مگر　خوں سے آلودہ جو ہر اک سُمِ مرکب ہے
منھ پہ کہہ دیوے ہے ہر اک کا بد و نیک وونہی　ہے یہی عیب کہ آئینہ صفا مشرب ہے
اس کو ہندو و مسلماں میں نہیں فرق ذرا　قاتلِ خلق ترا غمزۂ بد مذہب ہے
مانتا ایک کی ہرگز نہیں وہ مایۂ ناز　خلق کا دستِ ساجت بہ تہِ غبغب ہے
اس کو ہرگز تو بگولا نہ سمجھ اے لیلیٰ　روحِ سرگشتۂ مجنوں کا یہی قالب ہے
فقط اوقات توکّل پہ بسر کرتا ہوں　اس سے آگاہ ہے خالق جو مرا منصب ہے
کہکشاں چھوڑتا ہے خوش ہو پٹاخوں کی لڑی　قمقمہ رنگ سے بھرتا ہے وہ جو کوکب ہے
اس قدر عالمِ علوی میں جو ہے جوشِ نشاط　نہیں معلوم کہ یہ وصل کی کس کے شب ہے

سات دیوان کیے مصحفی میں نے تحریر
ہے بجا ہفت ہزاری جو مرا منصب ہے

463

ناز میں ناز ہے انداز میں اک کرتب ہے　اس کی چھل بل سے خبر حور و پری کو کب ہے
کیوں کہ دنیا میں نہ ہم طالبِ سیم و زر ہوں　آخر آسودگیِ دل سے یہی مطلب ہے
کیوں نہ آوارہ پھرے دامنِ مژگاں سے نکل　گہرِ اشک مرا کودکِ مکتب کب[1] ہے
اس قدر شمع سے تو لگ نہ چل اے پروانے　دلِ واسوختہ شایانِ محبت کب ہے
حال دریا کو جو دیکھا میں ترے شوق کے بیچ　جوشِ مستی سے وہ دیوانہ کفِ بر لب ہے
جمعہ کے دن بھی فغاں کرتے ہیں اس کوچے میں ہم　نام چھٹی کا نہیں جس میں یہ وہ مکتب ہے
سر و پا کیجیے موذی کا بہ شمشیر جدا　اپنے نزدیک یہی بس ہرجِ اخرب[2] ہے
پردہ کھل جائے جو یہ بیچ سے اٹھ جائے ابھی　شہِ شطرنج ہے جاں فرز[3] بدن اردب[4] ہے

1۔ کب: قیاس سے اضافہ کیا گیا　2۔ ہرجِ اخرب: عروض کی ایک بحر　3۔ فرز: فرزیں
4۔ اردب (شطرنج کی اصطلاح) وہ مہرہ جو شاہ کو کشت سے بچانے کے لیے بیچ میں لایا جاتا ہے۔

حسن طفلی کا یہ میداں بہ شباب اس نے لیا
مصحفی سر پہ غریبوں کے قیامت اب ہے

464

تم جو پوچھو ہو سدا حالِ رقیباں ہم سے
یہ ہنسی خوب نہیں اے گُلِ خنداں ہم سے
دیکھ کر مجھ کو تری سوزنِ مژگاں بولیں
نہ سیا جائے گا اس کا تو گریباں ہم سے
ناز پروردۂ ظلمت ہیں ہم اے بدرِ سحر
ہو سکے کیوں کہ وداعِ شبِ ہجراں ہم سے
اے جنوں تیری مدد ہووے تو طے ہو جاوے
دو شلنگوں میں یہ صحرائے مغیلاں ہم سے
مستی شوق میں کعبے کی طرف جا نکلے
ہو گئی سہو رہِ کوچۂ جاناں ہم سے
زلف آشفتہ بہ رخسار کا شکوہ نہ کریں
اس نے رکھا ہے چھپا چشمۂ حیواں ہم سے
ہم نہ شانہ نہ صبا ہیں نہیں کھلتا ہے یہ بھید
اینٹھتی جاتی ہے کیوں زلفِ پریشاں ہم سے
قدرداں ہی نہ کوئی ہووے تو کیا اپنا گناہ
خلق ہوتے ہیں کوئی مصحفی انساں ہم سے

465

ہم قسم قتل پہ میرے ہے اجل جاناں سے
دل رکا آئے نہ کیوں نہ طولِ شبِ ہجراں سے
سادگی پر مجھے قاتل کی بڑا رحم آیا
اپنی شمشیر کا پونچھے تھا لہو داماں سے
جانبِ قیس تب اس دم کہیں پھر کر دیکھا
جب گئے دور نکل عشق کے ہم میداں سے
اس کے کوچے میں جو جاوے یہ نصیحت ہے مری
کچھ نہ کچھ میرا ابھی مذکور کرے درباں سے
رنگ کس گل کا جھلک ان کی گیا آنکھوں میں
پھول نرگس کے جو آتے ہیں نظر حیراں سے
مہ رخ کس کا مقابل ہے دم گریہ مرے
جو عیاں ہوتی ہے خشکی سی بُنِ مژگاں سے
باغ سے کیوں کہ میں جاؤں کہ بہ شوقِ قدِ یار
دل کو اک انس سی ہے سایۂ سروستاں سے
مجھ کو ڈر ہے کہیں گردن میں نہ بل پڑ جاوے
گرہِ صید کو کھولا نہ کرو دنداں سے

میں نہ رویا تو بڑھی دانۂ گوہر کی بہا غلّہ کیوں کر نہ گراں ہو کمیِ باراں سے
گر یہی دل کا ہے عالم تو نظر آتا ہے دوستی بت کی لڑاوے گی مجھے رہباں سے
اشک رنگیں کے سوا اور نہ کچھ ہاتھ آیا پھول ہم چن کے یہ لائے چمنِ حرماں سے
فصد کر کے مری فصّاد ہوا سخت خجل نوکِ نشتر کو بچایا نہ گیا شریاں سے
دلِ گم گشتہ کو اپنے میں کہیں کیوں ڈھونڈوں چوری ثابت ہے مری اس کے لبِ خنداں سے

466

دستِ جنوں سرک کہ جب آئی ہے فصلِ گل خود چاک ہو گئے ہیں گریباں سیے ہوئے
اس کُو میں تھا یہ حال میاں مصحفی کہ یار
لائے گھر ان کو ہاتھ بغل میں دیے ہوئے

467

یہ بھی قسمت کہ نہاں یوں رخِ دلبر ہو جائے آئینہ بیچ میں دیوارِ سکندر ہو جائے
اشک جو دیدۂ گریاں سے گرا چاہے ہے کسی صورت تری پازیب کا گوہر ہو جائے
نامۂ رنگیں نہ لکھ اس گل کو دلا، کہنا مان مفت میں فائدہ کیا خونِ کبوتر ہو جائے
بعد بوسے کے تو اک بوسہ اگر اور بھی دے تو وہی حق میں مرے قندِ مکرّر ہو جائے
دم نہ مارو کہ خواص اس میں ہے آئینہ کا کہیں یارو نہ دلِ یار مکدّر ہو جائے
فائدہ کیا اسے روپوش ہو پھر شرمانا منہ پھراتے ہی تری جان جو مضطر ہو جائے
یاں کسی کو نہیں دیتا ہے کوئی پارۂ نان
مصحفی! جان غنیمت جو میسّر ہو جائے

468

قاصد تو کہیو اس سے میری زبانی اتنی عاشق کو کب روا ہے نامہربانی اتنی
ہے مشتِ خاک تربت اس کو صبا اڑا مت رہنے دے ٹک زمیں پر میری نشانی اتنی

ہم پیر ہو چکے ہیں پر شعر میں مزا ہے — کہنے کو رہ گئی ہے باقی جوانی اتنی
مجنوں کا قصہ سن کر شب خوب روئی لیلیٰ — پُر درد ہر کسی کی کب تھی کہانی اتنی
تصویر اس کی ہرگز تجھ سے نہ کھینچ سکے گی — تصدیع کھینچتا ہے ناحق تو مانی اتنی
تو نے وفا نہ کی کچھ مجھ ساتھ میں نہ سمجھا — ہے ہے تو بے وفا تھی دنیاے فانی اتنی
ملنے سے مدعی کے یک بار ہاتھ اٹھایا — شکرِ خدا کہ میری بات اس نے مانی اتنی
عاشق ہوں میں تمھارا سمجھو نہ اور کا تم — تم کو روا نہیں ہے یہ بدگمانی اتنی
گلیوں میں تا کمر خوں بہنے لگا بہر سو — اس قاتلِ جہاں نے کی تیغ رانی اتنی
آخر کو حال میرا کیا جانے کیا کرے گی — دل کو جو لگ رہی ہے یاد فلانی اتنی
کیوں چھپ رہے ہو پیچھے پٹ کے نکل بھی آؤ — کیا فائدہ رکھے ہے صورت دکھانی اتنی

میاں مصحفی تمھارے وہ دن نہیں رہے اب
تم کو بھلی نہیں ہے یہ شعر خوانی اتنی

469

کم چاندنی کا فرش نہیں سطحِ آب سے — صورت میں میر فرش[1] ہیں اس پر حباب سے
طرّار زلفِ یار اگر چرخ پر چڑھے — سونا اتار لے ورقِ آفتاب سے
اللہ رے نازکی کہ گل اندام کے مرے — عارض خراش پاتے ہیں مسِ نقاب سے
قاصد تو اس کے در پہ نہ رہیو پڑا کہ یار — ہم آپ ناامید ہیں خط کے جواب سے
آبادیِ فضاے عدم ہم سے خاک ہو — کچھ ساتھ لے گئے نہ جہانِ خراب سے
واں بھی خیالِ روے بتاں ساتھ ہی رہا — بعد از فنا بھی ہم تو نہ چھوٹے عذاب سے
ظالم کو دیوے ساقیِ دوراں نہ کامِ دل — بندوق کا پیالہ تہی ہے شراب سے
فتراک میں نہ باندھ سرِ کشتگاں صنم — بوسے نہ لیں کہیں تری چشمِ رکاب سے
سچ ہے محال ہے غشیِ مرگ کا علاج — آنکھیں نہ کھولیں مردۂ بے حس گلاب سے

1۔ میر فرش: برجی کی شکل کے وہ پتھر جو فرش کے کنارہ دبانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں

پیمانہ آپ حاجتِ زینت سے ہے بری گوسہ؟ کا کام ہی نہیں ہوتا خضاب سے
تھا زندگی میں علم کا خوگر میں مصحفی
تربت بنائیو مری خشتِ کتاب سے

470

وہاں حسن نے کیا جو تجاوز شباب سے اڑتا پھرے گا رنگ رخِ آفتاب سے
بل بے گدازِ عشق کہ بے منتِ جنوں زنجیر شوخ تر ہے مری موجِ آب سے
کیا کیا نہ اس نے کی ہیں ہماری خرابیاں شکوے ہیں سیکڑوں دلِ خانہ خراب سے
ٹھوکر نے تیرے پانو کی اے فتنۂ زماں چونکا دیا ہے فتنۂ محشر کو خواب سے
ہمراہ غیر گھر کو نہ جا، آج رہ یہیں آنکھیں بھری ہوئی ہیں تری کیفِ خواب سے
آیا تو جس کے ہاتھ گیا جیت وہ صنم بازی ہو گنجفہ کی فزوں آفتاب سے
آہوں کا کل جو میری دھواں سدّ رہ ہوا تا شام آفتاب نہ نکلا سحاب سے
کیا وقتِ نزع یار کی صورت نظر پڑی جاتی سنی نہ جان میں اس اضطراب سے
معشوقی اس کو کہتے ہیں بعد از ہزار سال آئے بھی خواب میں تو نہ بولے حجاب سے
دیتے ہو بوسے گن کے تو نشمردہ[1] گالیاں گر یہ حساب ہے تو میں گزرا حساب سے
رکھا جو اس نے پاے نگاریں بغیر کفش ایک موجِ خوں بہی وہیں چشمِ رکاب سے
کس ترکِ تیز دست نے تلواریں ماریاں
جو پھول گر پڑے سپرِ آفتاب سے

471

دستِ نسیم مس ہو جو بندِ نقاب سے تیرِ کرشمہ جائے گذر آفتاب سے
معبود اس کا وہ ہی ہے جو جس کی ہو پسند آتش عزیز تر ہے سمندر کو آب سے
تیرے سبب ہے مجلسِ خوباں کی آبرو سرلوح چاہیے نہ جدا ہو کتاب سے

1۔ نشمردہ : بے شمار

کیا زیست میں ہو عالمِ بعد از فنا کی سیر   مردے کی آنکھ کھلتی ہے غفلت کے خواب سے
یاقوت گر شفق کا نہ تشبیہ دے سکا   سرخی کو تیری چشم کو لعلِ مذاب سے
دریا میں تو نہانے نہ جا مجھ کو ہے یہ ڈر   ہو صدمہ کش ترا تنِ نازک حباب سے
دورِ فلک میں سب ہے ہنڈولے کی چال ڈھال   کس دن زمانہ باز رہا انقلاب سے
خالِ دہن کچھ اور ہے خالِ ذقن کچھ اور   رکھتے ہیں فرق نقطۂ مشک انتخاب سے
بس دیکھتے ہی اس کی زباں بند ہوگئی   کیا پیش جائے غمزۂ حاضر جواب سے
جو گل رخوں کے ہجر میں رو رو کے مر گیا   دیتے ہیں غسل اس کو ملائک گلاب سے

بکواس لگ گئی تجھے کیسی یہ مصحفی
شعرِ غزل ہیں اب کے ترے بے حساب سے

472

اک روز ترے کوچے سے ہم مر کے اٹھیں گے   بیٹھے ہیں، مصیبت کے یہ دن بھر کے اٹھیں گے
اس شوخ کے گر جا کے لبِ بام پہ بیٹھا   واں سے نہ کبھی پانو کبوتر کے اٹھیں گے
ہم بھی اُسی دن جانیں گے عباسِ علی کو   جس دن کہ عَلم خانۂ دلبر کے اٹھیں گے
پہلو میں اس امید پہ بیٹھا ہوں کہ آخر   شانے پہ مرے ہاتھ تو وہ دھر کے اٹھیں گے
گر ہے یہی چپ چپ تو بھلا روزِ قیامت   مارے ہوئے کب لعلِ فسوں گر کے اٹھیں گے
جس وقت وہ دیکھے گا تری چشم کا فتنہ   آگے نہ قدم فتنۂ محشر کے اٹھیں گے
مارِ خمِ گیسو جو لحد میں نظر آیا   مدفوں ترے اس دم ہی فغاں کر کے اٹھیں گے
گر صدمۂ محشر پہ نظر جائے گی ان کی   مٹی کے جو پتلے ہیں وہ پتھر کے اٹھیں گے
تب بھید کھلے گا تری نازک بدنی کا   جب پھول سحر کو ترے بستر کے اٹھیں گے
منظور دکھانا ہے انھیں حلقِ بریدہ   کل حشر میں کشتے ترے بن سر کے اٹھیں گے
چل چل کے وہ رہ جائے ہے ہر لحظہ گلے پر   یہ ناز نہ ہم سے ترے خنجر کے اٹھیں گے

حشر آئے تو زنجیر بپا کنجِ لحد سے ہم شوق میں اس زلفِ معنبر کے اٹھیں گے
ہم سایوں کو گر سونگھ گیا مارِ شبِ ہجر تو دیکھیو اندر کے نہ باہر کے اٹھیں گے
اے مصحفی پھینک آ اسے اس بت کی گلی میں
تجھ سے نہ یہ صدمے دلِ مضطر کے اٹھیں گے

473

اپنا نصیب خفتہ و بیدار ایک ہے رنگِ کشاد و گرمیِ بازار ایک ہے
بلبل کہے تھی نالہ کروں یا فغاں کروں کیا کیا کروں میں اس سے یہ منقار ایک ہے
گر ایک ہاتھ میں ہے مرے خانہ جنگ کے تو دوسری کمر میں بھی تلوار ایک ہے
دیر و حرم بہ چشمِ حقیقت نہیں جدا یعنی مآل سبحہ و زنار ایک ہے
گر سو طرح سے مرغِ چمن ہے صفیر سنج نالہ ترا بھی مرغِ گرفتار ایک ہے
بے امتیازیِ چمنِ دہر کیا کہوں اس گلستاں میں قدر گل و خار ایک ہے
ہے اک بلائے جاں تری تصویرِ نیم رخ ہر چند چشم و ابرو و رخسار ایک ہے
گر اس کا جی سے سوزنِ مژگاں کرے سراغ تو اب تلک بھی دل میں مرے خار ایک ہے
کبکِ دری ہزار روش کب تو چل سکا تجھ کو تو یاد شیوۂ رفتار ایک ہے
آفت یہ چکوے چکوی پہ لائی شبِ فراق دریا کے وار ایک ہے تو پار ایک ہے
ہے رنج و راحت ایک جنھیں ان کے کان میں صوتِ قفس، ترانۂ گلزار ایک ہے
پرکار کی طرح سے میں رکھتا ہوں پانو دو گر ایک کام میں ہے تو بے کار ایک ہے
اک دن کہا میں اس سے جو رستے میں مل گیا ق خدمت میں تیری عرض مرے یار ایک ہے
سودائے جنسِ حسن جو منظور ہو تجھے تو اب تلک بھی اس کا خریدار ایک ہے
سن سن کے میری بات کو اور جی میں سوچ سوچ کہنے لگا کہ چل بے تو عیار ایک ہے

474

دیکھوں تو ترے حسن کو میں پھاڑ کے آنکھیں　　پر نورِ تجلی کو نظر دیکھ سکے گی
ظاہر ہے ترے حسن کی تصویر کے ہوتے　　یوسف کو کبھی مصر میں قیمت نہ ملے گی
پہلے تو صنم ان کو مرے خوں میں ڈبو لے　　ورنہ ترے ہاتھوں پہ یہ مہندی نہ رچے گی
تو نے یہ جلایا ہے کہ اب پھر کبھی ہرگز　　بجلی نہ تری برقِ تبسّم سی ہنسے گی
ہے اب تو گلا ڈوک[1] میں، تب سنیو ترانہ　　جب گانے میں اس شوخ کی آواز منجے[2] گی
دریائے محبت کے تھپیڑے ہیں قیامت　　کشتی جو بہے گی بھی تو سیدھی نہ بہے گی
اُس گل نے خطِ سبز کا عالم جو دکھایا　　طوطی بھی وونہی دام میں بلبل کے پھنسے گی
مقتل میں شہیدوں کے تو پھرتا ہے خراماں　　دامن کی ترے زہ نہ لہو بیچ بھرے گی
ہے ننگ اسے ایسے چمکّو[3] کا جلانا　　بجلی پہ تری برقِ تبسّم نہ گرے گی
مذکور ترے حسن کا گر میری زباں سے　　سن پاوے گی تو شمع بہت جی میں جلے گی
قاتل تو دمِ قتل تو کچھ پوچھ لے مجھ سے　　اچھا نہیں حسرت جو مرے دل میں رہے گی

تو مصحفی کچھ یاں سے نہ لے جائے گا ہرگز
یہ جان کی حسرت ہی ترے ساتھ چلے گی

475

فقط نہ گریۂ خونیں سے آستیں تر ہے　　پڑا تھا شب میں جہاں واں کی سب زمیں تر ہے
تڑپ تڑپ کے موا ہے جہاں ترا بسمل　　کہیں ہے خشک زمیں واں کی اور کہیں تر ہے
ہوئی ہے یہ لبِ لعلیں سے تیرے جی میں خجل　　کہ آبِ خشک میں یاقوت کی نگیں تر ہے
نگاہِ گرم نے کس کے تجھے فشار دیا　　پسینے میں تری چولی جو نازنیں تر ہے

1۔ گلا ڈوک میں ہونا: زمانہ بلوغ میں کنٹھ پھوٹنے سے آواز کا بھاری ہو جانا　　2۔منجنا: منجھنا

3۔ چمکّو: چمکدار، نیز شوخ لڑاکا عورت

ملا تھا بالوں سے کپڑے اتارنے کے جو دن		ہنوز عطر میں وہ جعدِ عنبریں تر ہے
صفائے رو و بنا گوش سے تری ہو خجل		گل آب آب ہے اور برگِ یاسمیں تر ہے
میں سوزِ غم سے ترے بسکہ گریہ کرتا ہوں		برنگِ شمع مرا داغِ آتشیں تر ہے
تو کس کے گھر سے صنم منفعل ہو آتا ہے		کچھ آج بوندوں سے خی کی تری جبیں تر ہے
زبسکہ قلزمِ خوں میں شناوری کی ہے		لہو سے کشتوں کے گھوڑے کا تنگِ زیں تر ہے
کیا ہے ذبح کسے ایسی بے دریغی سے		جو خوں میں قبضے تلک تیری تیغِ کیں تر ہے
وداعِ یار کا عالم قریب آ پہنچا		تبھی تو چشم مری وقتِ واپسیں تر ہے
نہیں ہے مجھ میں گر آثارِ مرگ کیوں اس دم		ہجومِ اشک سے رومالِ ہم نشیں تر ہے

میں مصحفی نہ کہوں کیوں کے آبدار غزل
کہ شعرِ تر سے مرے شعر کی زمیں تر ہے

476

فقط نہ خوں سے مرے تیری تیغِ کیں تر ہے		غضب تو یہ ہے کہ دامان و آستیں تر ہے
تری شبیہہ کی حسرت سے حوضِ غیرت میں		شبیہہ زندہ صورت نگاہ چیں تر ہے
شفا ہوئی نہیں داغِ جگر کو خاطر خواہ		کہیں سے خشک ہوا ہے تو پھر کہیں تر ہے
مفرّحِ دلِ بیمارِ عشق کیوں کہ نہ ہو		بہ آبِ سیبِ ذقن خالِ عنبریں تر ہے
شبِ وصال بھی آوے ہی گی نہا دھو کر		گر آنسوؤں سے تری چشمِ پاک بیں تر ہے
ہے کیوں پسینے پسینے ترا بدن سچ کہہ		کس انفعال میں اتنا تو مہ جبیں تر ہے
نہ کیوں کہ ملک یہ پورب کا سبز حاصل ہو		ہے جائے زرع ترائی کی جو زمیں تر ہے
ہے آہ گرم مری نخل، اشک اس کا ثمر		عجب یہ ہے ثمرِ نخلِ آتشیں تر ہے
جو دردکش کوئی لب اپنے تر کیا چاہے		تری شراب کا اب تک بھی ساتگیں تر ہے
صنم نہ کیوں گلِ شبنم زدہ ہو اس سے خجل		نمِ جمال میں تیرا رخِ حسیں تر ہے

کرے گی کیا لبِ لعلیں سے اس کے دعویٰ رنگ
ابھی تو مصحفی پانی ہی میں نگیں تر ہے

477

گر ملاقات کبھی اس سے یہ مقصود ہوئی — آ کے طالع کی نحوست وونہی موجود ہوئی
فائدہ کیا جو ہم اب پیکِ صبا کو پہنچیں — جب رہِ نامہ و پیغام ہی مسدود ہوئی
اس ستم پر کہ رہی سبزۂ پامالِ چمن — نہ زباں اپنی کسی دن گلہ فرسود ہوئی
چشم نے کھول دیا اپنا جواہر خانہ — ہر مژہ ہجر کی شب میں گہر آلود ہوئی
خوں میں تھا شورِ ملاحت جو مرے اس باعث — ماہیِ تیغ تری اس میں نمک سود ہوئی
دیکھیو رشک، نجومی نے نہ بتلائی وہی — وصل کی شب میں جو ساعت کوئی مسعود ہوئی
جس طرح آئے تھے دنیا میں چلے پھر وونہی — شبِ مولود ہی اپنی شبِ موعود ہوئی
تو نے مارا جو غلام اپنے کو از بہرِ ایاز — بات یہ اچھی تو کچھ تجھ سے نہ محمود ہوئی
تیری صورت کے سوا خلق ہوا کب ثانی — آپھی ساجد وہ بنی آپ ہی مسجود ہوئی
گر نکاح اک زنِ بیوہ سے وہ سوچا جی میں — تو سمجھتا ہے خطا تجھ سے جو داؤد ہوئی
پیکرِ خصم مقابل مرے آئی جو کبھی — ہو کے واصل بہ جہنم وونہی نابود ہوئی

مصحفی رنگ کئی آہ نے میری پکڑے
پہلے آتش ہوئی، پھر شعلہ تو پھر دود ہوئی

478

ہوائے کوچۂ قاتل پہ جان جاتی ہے — ہوائے خلدِ بریں ہم کو کب خوش آتی ہے
شبیہ کش دہنِ تنگ سے ہے گل کی کلی — جو پیرہن میں وہ پھولی نہیں سماتی ہے
کروں میں اور سو کیا وصفِ طفلِ میوہ فروش — ذقن ہے سیب تو رخسار ناشپاتی ہے
کسی کو یہ نہیں معلوم اس کا کیا ہے گناہ — جو شمع آگ میں پروانے کو جلاتی ہے

لکھا ہے جس میں کہ مانی نے حسن کا نقشا وہی شبیہہ مری جان و دل کو بھاتی ہے
ہوں میں بھی سوچ میں یہ جانِ ناتواں کیونکر مصیبتِ شبِ ہجراں کی تاب لاتی ہے
ہے سبزۂ لبِ جُو کی جو لہلہی سبزی تری مسوں کے وہ سبزے پہ زہر کھاتی ہے
دکھایا ہم کو جو پیری نے نیک و بد دیکھا اب آگے دیکھیے تقدیر کیا دکھاتی ہے
تو خواب میں تو صنم اپنی شکل دکھلا جا کہ دیکھنے کو ترے جان تلملاتی ہے
میں اس بتِ دکنی پر ہوا ہوں عاشق زار دکن کی چوٹ[1] کی باندھے ہوئے جو گاتی[2] ہے

پڑا ہے گورِ غریباں میں مصحفی تنہا
سرہانے اس کے جو دیکھا، دِیا نہ باتی ہے

479

شبِ فراق میں ہم فاش اگر فغاں کرتے تو ہم سے اتنا تغافل نہ مہ وشاں کرتے
سمجھ کے دوں گا میں نامے کو دستِ قاصد میں ابھی تو جی سا الجھتا ہے خط رواں کرتے
جو کچھ شکستہ قفس کی ہی تیلیاں ملتیں تو ہم انہی کو خس و خارِ آشیاں کرتے
نہ دی فلک نے ہمیں فرصت اس قدر ورنہ کسی طرح تو ترے دل کو مہرباں کرتے

480

میری اس پر بھی نہ اس شہر میں حسرت نکلی شکل جس گھر سے کوئی نکلی وہ آفت نکلی
نالۂ صبح تو اٹھا تھا علم ہاتھ میں لے اشک کی بوند بھی آنکھوں سے قیامت نکلی
سرِ بازار رسن باندھ کے اس کو کھینچا نعش عاشق کی ترے کُو سے بہ ذلت نکلی
حیرتی حسن کا تیرے وہ ہوا جس دن سے چشمِ آئینہ سے زنہار نہ حیرت نکلی
رکھ دیا ہاتھ سے آئینے کو دیکھ اس بت نے سچ اگر پوچھو تو اک اس میں بھی غیرت نکلی
لوٹ لیوے گا چمن کو وونہی اک آن کے بیچ گل میں جس دن ترے رخسار کی رنگت نکلی

1۔ چوٹ: ایک طرح کی چادر (پلیٹس) 2۔ گاتی: کاندھے پر ڈالنے کی چادر، ایک لباس

دھوم تھی جس کے جنوں کی پسِ مردن آخر | اس کی کہتے ہیں بڑی دھوم سے میّت نکلی
منھ شبِ ہجر کا دیکھا تو بہ ناچاری لیک | ملک الموت کی سی اس میں تو ہیبت نکلی
شکر کی جا ہے کہ منھ سے مرے مرتے مرتے | نزع کے دم بھی نہ دلبر کی شکایت نکلی
ہو گیا خاک بھی میں راہِ وفا میں تیری | پر ترے دل سے نہ اس پر بھی کدورت نکلی
حسنِ یوسف کو بنا کر نہ بنایا ویسا | ایک ہی خامۂ نقاش سے صورت نکلی

مصحفی گورِ غریباں میں ہوا تھا کب دفن
کوچۂ یار ہی میں اس کی تو تربت نکلی

481

حال میرا کچھ اس سے نامہ بر نہیں کہتے | اور جو واں کی پوچھوں میں تو خبر نہیں کہتے
آپ ہی آپ تو ہر دم زار زار روتی ہے | ہم تو تجھ سے رونے کو چشم تر نہیں کہتے
صاحبِ حیا وہ ہیں، حوصلہ انھوں کا ہے | وہ جو بدنظر کو بھی بدنظر نہیں کہتے
جس نے سقف گردوں میں آگ سی لگا دی ہو | ایسی آہِ سوزاں کو بے اثر نہیں کہتے
سیب کو لے نارنگی اس میں سب پھل آتے ہیں | سرو قد کو ہم اس کے بے ثمر نہیں کہتے
یوں تو آتے ہیں دن رات خوبرو ہمارے پاس | مقصدِ دلی اپنا ہم سے پر نہیں کہتے
مُو کی کیا حقیقت ہے ہیں جو صاحبِ دقّت | خوش کمر سوا اس کو مو کمر نہیں کہتے
تجھ کو کیا خبر اس کی ہم ہیں مطلع اے دل | چین سے وہ بیٹھا ہے کس کے گھر نہیں کہتے

قافیوں کی بندش کا مصحفی ہے تم کو شوق
ہم غزل اسی باعث مختصر نہیں کہتے

482

مردم جو تیری چشم کے بیمار ہو گئے | زلفوں سی اک بلا میں گرفتار ہو گئے
الٹا نقاب کس نے جبیں سے چمن کے بیچ | نظروں میں باغباں کے جو گل خار ہو گئے
خورشید کی پڑی تھی نظر اس پہ ایک دن | اس دن سے بند رخنۂ دیوار ہو گئے

میرے جنونِ عشق سے فصلِ بہار میں ہنگامے سیکڑوں سرِ بازار ہوگئے
اللہ رے جنسِ حسن کہ مفلس تھے اس کو دیکھ رستے میں جاتے جاتے خریدار ہوگئے
ہم نے شرابِ عشق کا دیکھا عجب نشہ بیہوش ہوگئے، کبھی ہوشیار ہوگئے
ان کی اور ان کے عکس کی صحبت بگڑ گئی آخر وہ آرسی سے بھی بیزار ہوگئے
آئی شبِ فراق تو ڈر اس کا مان کر گردوں سے گم ثوابت و سیّار ہوگئے
دو دن ترا خیال اگر ہم سے رک رہا کیا کیا نہ ظلم ہم پہ شبِ تار ہوگئے
ہیں ہم بھی تاڑ باز ہمیں سب کی ہے خبر نظروں میں جو جو غیر سے اقرار ہوگئے
پوچھو نہ میرے گریۂ رنگیں کا ماجرا دامن کے پاٹ تختۂ گلزار ہوگئے
پیری میں فکرِ شعر کا کیا لطف مصحفی
دن زندگی کے تھے سو مرے یار ہوگئے

483

تجھ سا کوئی مہ پارہ زمانے میں نہیں ہے ایسی تو رقم شہ کے خزانے میں نہیں ہے
دمساز میں کس کا ہوں جو گل چاہے ہے مجھ سے وہ سوز جو بلبل کے ترانے میں نہیں ہے
نظروں سے گرا کیوں ترے یارب یہ مرا اشک سرخی تو اس الماس کے دانے میں نہیں ہے
میں حالِ دل اپنا جو لگا کہنے تو بولے یہ ذکر تو مجنوں کے فسانے میں نہیں ہے
غیرت پہ نظر کیجیو محبوب کی میرے سورج کو گزر جس کے زنانے میں نہیں ہے
وہ زلف کا وابستہ تو وہ رخ کا فدائی کچھ فرق تو آئینہ و شانے میں نہیں ہے
اک دم تو ٹھہر جاؤ یہاں پاس ہمارے کچھ فائدہ ہر دم کے بہانے میں نہیں ہے
چلتے تو کیا ناوکِ بیداد سے بس بس اب آگے سکت دل کے نشانے میں نہیں ہے
اے مصحفی حیرت کے سوا گر کوئی دیکھے
کچھ اور تو اس آئینہ خانے میں نہیں ہے

484

گر حنائی دست کا مضموں قلم سے گر پڑے
صفحۂ کاغذ پہ اشکِ خوں قلم سے گر پڑے

وصف اس سروِ سہی کا گر لگوں کرنے رقم
خود بخود اک مصرعِ موزوں قلم سے گر پڑے

ہوں مقامِ نفی میں یاں تک وہ میرے شعر پر
صاد گر کرنے لگے تو نوں قلم سے گر پڑے

گر دکھاؤں خصم کو علمِ ریاضی کے فنون
نقش عرش و کرسی و گردوں قلم سے گر پڑے

خاک سر پر تیرہ بختی کی روا ہے ڈالنی
جو سیاہی لکھتے میں افزوں قلم سے گر پڑے

میں تو کرتا ہوں بہت سا ضبط پر چاہے ہے شوق
لوح پر دردِ دلِ محزوں قلم سے گر پڑے

خط تو تُو لکھتا ہے لیلیٰ کو و لے رکھیو یہ دھیان
حرف کچھ بیجا نہ اے مجنوں قلم سے گر پڑے

جا رہے ہیں آستیں گریہ سے طوفاں کا تنور
چاہیے خط لکھنے میں جیحوں قلم سے گر پڑے

آؤں گر معجز طرازی پر تو ہنگامِ نوشت
راز لوح صدر افلاطوں قلم سے گر پڑے

جس کا نقشا تو لکھے یوں چاہیے اس نقش میں
حسن بھی اے صانعِ بے چوں قلم سے گر پڑے

گر بلاق اس کے کا لہو لکھتے فرو آجائے یاد
جائے نقطہ اک دُرِ مکنوں قلم سے گر پڑے

چشمِ کافر کا کسی کی ماجرا لکھتا ہوں میں
مصحفی کیا جانے کیا افسوں قلم سے گر پڑے

485

خامش ہیں ارسطو و فلاطوں مرے آگے
دعویٰ نہیں کرتا کوئی موزوں مرے آگے

دانش پہ گھمنڈ اپنی جو کرتا ہے بہ شدت
واللہ کہ وہ شخص ہے مجنوں مرے آگے

لاتا نہیں خاطر میں سخن بیہدہ گو کا
اعجازِ مسیحا بھی ہے افسوں مرے آگے

دشوار ہے رتبے کو پیمبر کے پہنچنا
ہے موسیِ عمران بھی ہاروں مرے آگے

باندھے ہوئے ہاتھوں کو بہ امیدِ اجابت
رہتے ہیں کھڑے سیکڑوں مضموں مرے آگے

جب موج پہ آجائے ہے دریائے طبیعت
قطرے سے بھی کم ٹھہرے ہے جیحوں مرے آگے

بدبینی پہ آؤں تو ابھی اہلِ صفا کے ہو جاویں شبہ[1] سب دُرِ مکنوں مرے آگے

استاد ہوں میں مصحفی حکمت کے بھی فن میں
ہے کودکِ نو ارس و فلاطوں مرے آگے

486

ہے جامِ طرب ساغرِ پُر خوں مرے آگے ساقی تو نہ لا بادۂ گلگوں مرے آگے

ٹک لب کے ہلا دینے میں حسّانِ عجم کا ہو جاوے ہے احوال دگرگوں مرے آگے

سمجھوں ہوں اسے مہرۂ بازیچۂ طفلاں کس کام کا ہے گنبدِ گردوں مرے آگے

سب خوشہ رُبا ہیں مرے خرمن کے جہاں میں کیا شعر پڑھے گا کوئی موزوں مرے آگے

جب تیجے پہ آتا ہے مرا توسنِ خامہ بن جاویں ہیں تب کوہ بھی ہاموں مرے آگے

میں گوز سمجھتا ہوں سدا اس کی صدا کو گو بول اٹھے اڈھے کی چوں چوں مرے آگے

قدرت ہے خدا کی کہ ہوئے آج وہ شاعر طفلی میں جو کرتے تھے نہ غاں غوں مرے آگے

موسیٰ کا عصا مصحفی ہے خامہ مرا بھی
گو خصم بنے اسودِ افیوں مرے آگے

487

قلم سے روز مرا مدّعا ٹپکتا ہے پر اس کو علم نہیں مجھ سے کیا ٹپکتا ہے

رہے ہے اشک سے ہر بار نخلِ مژگاں کا شبِ فراق پہ میوہ بلا ٹپکتا ہے

یہ کس کی سرخیِ پاں چشم میں سمائی ہے جو طرح ریَنی[2] کے آنسو پڑا ٹپکتا ہے

چٹک رہی ہے مگر کوے یار میں گولی چُوا گر ایک تو پھر دوسرا ٹپکتا ہے

مَلا ہے کیا کفِ پا سے ترے عذار اس نے نچوڑوں گل کو تو رنگِ حنا ٹپکتا ہے

زمینِ مسلخ و مقتل پہ کچھ نہیں موقوف شہیدِ ناز کا خوں جابجا ٹپکتا ہے

1۔ شبہ: مونگا 2۔ رینی: پرنالہ

چڑھا ہے مستی پہ از بس کہ پیلِ مستِ قلم
جب اس کو دیکھو تو صبح و مسا ٹپکتا ہے
مرے تو دل میں نہیں کچھ میں اس میں ہوں مجبور
اگر زبانِ قلم سے گلا ٹپکتا ہے
نہیں ہے تجھ کو صنم احتیاجِ بادہ کشی
کہ انکھڑیوں سے تری خود نشا ٹپکتا ہے
خدا کے واسطے ابر گہر کرم تو نہ کر
کہ میں غریب ہوں اور گھر مرا ٹپکتا ہے
کرے ہے صفحۂ کاغذ پہ مصحفی اسے ثبت
جو غیب سے کوئی مضموں نیا ٹپکتا ہے

488

ہے طلوعِ نشۂ مے یا جہاں گردش میں ہے
ساتھ سر پھرنے کے جو کون و مکاں گردش میں ہے
قرعۂ رمّال کی مانند دستِ چرخ سے
بعد مرنے کے مرا ہر استخواں گردش میں ہے
بعدِ نقلِ روح بھی آرام کی صورت نہیں
شیشۂ ساعت کا جوں ریگِ رواں گردش میں ہے
شرط ہے زیر و زبر ہونا ہمیں بھی اس کے ساتھ
تا ہنڈولے کی طرح یہ آسماں گردش میں ہے
مختلف کیسی ہوا ہے اس چمن کی جس کے ساتھ
رنگِ روئے گل بھی جوں برگِ خزاں گردش میں ہے
ٹھوکریں کھاتا ہوا رلتا پھرے ہے خاک میں
کاسۂ سر کا یہ کس کے استخواں گردش میں ہے
تہِ ہے مسوسائیوں کا عشق کی وادی مگر
جس میں رہ ملتے نہیں اور کارواں گردش میں ہے
جستجوئے ناقۂ لیلیٰ میں اب تک خاک قیس
گرد باد آسا فضائے کارواں گردش میں ہے
کس کے زیرِ ضربِ چوگاں ہے جو، از روزِ ازل
آج تک ویسے ہی گوئے آسماں گردش میں ہے
انقلابِ دہر سے ہرگز کوئی خالی نہیں
عرش و کرسی تک ورائے لامکاں گردش میں ہے
دیکھیو چکّر نہ ہووے مصحفی کے پانو میں
یونہی اک مدت سے یہ مسکیں جواں گردش میں ہے

489

تجھ بن کوئی ہرگز مرا محبوب نہیں ہے
تو اَور کا مذکور کرے خوب نہیں ہے

پہلے ہی کیا ہے میں صبا کے وہ حوالے نامہ مرا قاصد کے تو مصحوب[1] نہیں ہے
لیلیٰ نے کہا دیکھ کے مجنوں کی نگاہیں عاقل ہے یہ دیوانہ تو مجذوب نہیں ہے
آشوب سے اس نرگس بیمار کے تیری میں کیوں کہ کہوں شہر پُر آشوب نہیں ہے
ہو جس کے لفافے سے ذرا دل کو تشفی قاصد کے سرِ دست وہ مکتوب نہیں ہے
اے عشق ذرا میری بھی عزت کا تو رکھ پاس اتنی تو مذلت مجھے مطلوب نہیں ہے
کیوں حسن پرستی کو برا جانے ہے مُلّا نزدیکِ فلاطوں تو یہ معیوب نہیں ہے

اے مصحفی یہ ہے اثرِ سوزشِ سینہ
تربت پہ اگر میرے ہری دوب نہیں ہے

490

سج دھج جو نئی اس نے بہ یکبار نکالی پہلے سرِ عاشق ہی پہ تلوار نکالی
دریا میں کشف نے ترے شمشیر کے ڈر سے گردن نہ سپر سے کبھی زنہار نکالی
آنکھوں پہ پڑے پردے جدائی کے فلک نے کیا خوب مری حسرتِ دیدار نکالی
ثالث سے یہ پرہیز تھا اس کو کہ شبِ وصل خلوت سے بروں صورتِ دیوار نکالی
قاتل ہی کے میں سایۂ شمشیر میں سو کر دل سے ہوسِ سایۂ دیوار نکالی
گر گل بھی دکھایا ہے کسی نے مجھے تو بھی میں چاکِ قفس سے نہیں منقار نکالی
بن پونچھے ہوئے مستی کا عالم جو غضب تھا مانی نے شبیہ اس کی دھواں دھار نکالی
کب شعبدہ بازی سے ہوا چرخ کو آرام روز اک نئی لعبت سرِ بازار نکالی
مانی کا گیا دل پھسل اس وقت جب اس نے مستانہ قدِ یار کی رفتار نکالی
دس دن میں مٹایا مری تربت کے نشاں کو اس فتنۂ عالم نے یہ رفتار نکالی
گو سادہ بھی اچھا تھا ولے سبزۂ خط نے کچھ اور ہی زیبایشِ رخسار نکالی

1۔ مصحوب: ساتھ کیا گیا، ہمراہ

جب مصحفیِ زار نے لکھی غزل اک اور
اس میں نئی رنگینیِ گفتار نکالی

491

آہ از جگرِ نرگسِ بیمار نکالی — کاجل کی دھنک اس نے دھواں دھار نکالی
ضد تو نے نئی مجھ سے یہ اے یار نکالی — کھڑکی طرفِ خانۂ اغیار نکالی
صیاد نے گو حسرتِ گلزار نکالی — بلبل کے نہ دل سے خلشِ خار نکالی
رنجش یہ نئی تو نے ستم گار نکالی — جو بات کے کہتے دونہی تلوار نکالی
جب خاک میں ہم مل گئے تب دیکھنے آئے — رفتار نکالی تو یہ رفتار نکالی
تسبیح کو زاہد نے رکھا ہاتھ میں تو کیا — دل سے نہ اگر الفتِ زنّار نکالی
پہروں ہی نمیں دیکھا کیا تصویر کو تیری — مہجوری میں یوں حسرتِ دیدار نکالی
دانہ جو گرا خاک پہ مجھ سوختہ جاں کے — سبزی بھی کبھی اس نے نہ زنہار نکالی
جب سامنے آیا نمیں کیا آئینہ حائل — یہ خو نئی اے آئینہ رخسار نکالی
اے جانِ بلب آمدہ چل راہِ عدم لے — کیا جاتے ہوئے تو نے یہ تکرار نکالی
تلوار لگا بیٹھا مرے ہنستے ہی ہنستے — یہ زور ہنسی مجھ سے جفاکار نکالی
صیاد نہ چھوڑے گا تجھے زندہ قفس میں — گر سانس بھی اے مرغِ گرفتار نکالی
تصویرِ زمانے کی جو نقاشِ ازل نے — اس صفحۂ ایجاد پہ یکبار نکالی
سائے سے ترے رخ کی رخِ روز بنایا — بالوں کی سیاہی سے شبِ تار نکالی

مے پی نہیں کیا، مصحفیِ زار نے آخر
چوری تری اے نرگسِ بیمار نکالی

492

آئے تھے ترے کوچے میں جو دور سے چل کے — اُن کشتوں پہ احسان ہیں شمشیرِ اجل کے

مجروحوں کو تیغ اپنی کے ٹک دیکھ تو جا تو
مہماں یہ بجاں آئے ہیں کوئی دم کوئی پل کے

جب ضعف نے جانے نہ دیا اس کی گلی تک
ہم راہ ہی میں بیٹھ رہے گھر سے نکل کے

دشوار ہے اب وصل کہ دیوانِ قضا میں
لکھ اس نے دیے ہیں مرے ملنے کے مچلکے

رخ کا نہ زنخداں ہی کا اس کے لیا بوسہ
شرمندہ ہیں اس باغ سے ہم پھول نہ پھل کے

کب کوفت کو مانے ہے مرا مرغِ معانی
چو پلکیں ٹکیں یا کہ ٹکیں اس کے دو پل کے

ہے کچھ تو سبب اس کا جو مجھ تک نہیں آتے
بیڑی میں قضا کے ہیں مگر پانو اجل کے

اک جلوہ دکھایا تھا ترے حسن نے جن کو
وہ آج تلک ہوش میں آتے نہیں کل کے

ٹک مصحفی کی رکھو خبر ہوگا تلف ہی
بیمار پڑا اب کے جو یہ خستہ سنبھل کے

493

پانو پہ گری اس کے جو تلوار اُگل کے
ہاتھوں میں لیا اس کو میں پھرتی سے اچھل کے

جب رہ گئے پروانے سرِ شمع پہ جل کے
شعلہ بھی گیا بجھ کفِ افسوس کو مل کے

اس شوخ کا قدغن ہے کہ اب راتوں کو کوئی
کھنکھارے نہ کھانسے پسِ دیوار و محل کے

عاشق نے بھی کیا لاگ کی اک بات رکھی ہے
لے جائے ہے ہر شب تری تلوار بدل کے

ہرگز نہ ہیواؤ اپنا پڑا کوے بتاں میں
ہر چند کہ راتوں کو گئے بھیس بدل کے

یہ جذبِ محبت ہے کہ ٹھہرے ہے بہر گام
عاشق کا جنازہ ترے کوچے سے نکل کے

اک روگ سا رہتا ہے لگا لغزشِ پا کا
ہم ضعف سے گر پڑتے ہیں خشکی میں پھسل کے

اے مصحفی گر چشمِ حقیقت سے تو دیکھے
جو خاک کے پُتلے ہیں یہ سب پُتلے ہیں کل کے

494

شبیہ اس نے جو کھینچی ہے صاف چوٹی کی
ہے سیلی رشک فزا تا بہ ناف چوٹی کی

بغل میں رات کوئی مشک مو کمر سویا رکھے ہے بو جو ہمارا لحاف چوٹی کی
حریم کعبہ معطر ہوئی کسی کی مگر گرہ کھلی تھی بوقتِ طواف چوٹی کی
شبِ وصال مجھے سانپ ہو کے لپٹی وہ نہ یہ خطا میں کروں گا معاف چوٹی کی
پڑے نہ خرمنِ صبر و شکیب پر بجلی غضب ہے اس کی مقیشی مباف چوٹی کی
تو اپنے قلّے پہ بے جا گھمنڈ کرتا ہے خبر ہے اس کی بھی کچھ کوہ قاف چوٹی کی
تو مو بہ مو اسے دیکھے تو مصحفی میں نے
غزل لکھی ہے یہ لاف و گزاف چوٹی کی

495

پھر ان دنوں وہ تیغ و سپر باندھنے لگے پھر قتلِ عاشقاں پہ کمر باندھنے لگے
بارے ہمارے اشک کی قیمت ٹھہر گئی بنیا کٹھوت میں یہ گہر باندھنے لگے
ہر ایک پیچ میں دلِ عاشق نہ پیچ کھائے پگڑی وہ اب بہ رنگِ دگر باندھنے لگے
دلّی کے لڑکے بھان متی ہیں مگر تمام ہر شعبدے میں اپنی نظر باندھنے لگے
گلچیں نے آڑے ہاتھوں لیا ہم کو باغ میں دامن میں ہم جو لختِ جگر باندھنے لگے
پلکوں تک آ کے کلفتِ دل جمع جو ہوئی دریا کا باندھ دیدۂ تر باندھنے لگے
رخصت کا وقت اپنے ہے نزدیک کیا ہوا گل کو کہ جوں چراغِ سحر باندھنے لگے
ہم آئے زخم خوردۂ حرماں چمن سے آہ پوٹوں میں میوہ چیں جو ثمر باندھنے لگے
ہے کوتوال عشق کا سخت ان دنوں عمل شانوں پہ نالے دست اثر باندھنے لگے
اتنا تو تیرے کشتوں کا رتبہ ہوا بلند ترکان شکار بند میں سر باندھنے لگے
دستار پھیر باندھی ہے خوباں نے ہم پہ آہ کچھ اور باندھنو یہ مگر باندھنے لگے
روزِ سفر کے دن ابھی باقی ہیں مصحفی
تم تو ابھی سے بارِ سفر باندھنے لگے

496

نادیدہ جس کو جنّ و بشر چاہنے لگے
بینندہ کی نہ کیوں کر نظر چاہنے لگے

توبہ تو کی ہے عشق سے پر اس کا کیا علاج
بے قصد دل کسی کو اگر چاہنے لگے

دیکھے جو رشکِ گل کو مرے سیرِ باغ میں
بلبل مرے، نسیمِ سحر چاہنے لگے

پودے کو میری آہ کے واں باغباں لگا
جس باغ میں شجر کو شجر چاہنے لگے

دل میں بتوں کے حسن نے آخر اثر کیا
انساں تو یک طرف ہیں حجر چاہنے لگے

سیبِ ذقن کو تیرے نہ ہم نے ہی دل دیا
اس کو بہشت کے بھی ثمر چاہنے لگے

جاوے کسی کے گھر جو وہ مہماں طریق بھی
منہ دیکھتے ہی سب اسے گھر چاہنے لگے

آبی ہوا معاملہ یاں تک کہ عاقبت
خشکی ہمارے دیدۂ تر چاہنے لگے

دل کا مقابلہ صفِ مژگاں سے ہو تو یہ
اپنی شکست، اس کی ظفر چاہنے لگے

جب مالدار ہوتے وہ مفلس رکھے اسے
مرگِ پدر نہ کیوں کہ پسر چاہنے لگے

ڈالے جو اس نے مکاں میں موتی برائے زیب
اس روے صاف کو وہ گہر چاہنے لگے

گر ایک خوبرو سے رِہا ہم ہوئے تو آہ
پھر دوسرے کو بارِ دگر چاہنے لگے

ہوتا نہیں ہے عشق سفر مصحفی مفید
کیا روے خوش کو اہلِ سفر چاہنے لگے

497

جائیو تو نہ ادھر کپڑے بدل کر مَیلے
ہیں مریضوں کے ترے بالش و بستر مَیلے

مَیں مکرّر جو کبھی مسجدِ جامع میں گیا
میری پرچھائیں سے ہو جاویں گے پتھر مَیلے

وصل کا ان کے ارادہ کوئی کیا خاک کرے
ہاتھ لگتے ہوں جو خوبانِ سمن بر مَیلے

کیوں نہ میں شستہ لباسوں سے خجالت کھینچوں
پیچ پگڑی کے مری جب کہ ہوں سر پر مَیلے

چاہیے عشق میں عاشق کے تئیں اتنا ضبط
آ بنے جان پہ اور ہوویں نہ تیور مَیلے

چرک[1] اقبال شہاں سے مرے دامن کے یہ پاٹ شکل رومال بورچی کے ہیں یکسر مُیلے
حسن نے سوگ یہ کس کشتۂ مفلس کا لیا کپڑے پہنے ہوئے رہتا ہے جو دلبر مُیلے
راہ پیدا کریں ہم اس سے کہ سونگھوں میں انھیں کپڑے دھوبی سے تو دھلوائے گا دلبر مُیلے
خلوتِ خاک میں عالم ہے جو یک رنگی کا واں نظر آتے ہیں درویش و تونگر مُیلے
لااُبالی ہے وہ اتنا کہ ہیں قاتل کے مرے نیمچے زنگ زدہ اور ابھی خنجر مُیلے
لعل گودڑ کا سمجھتا ہوں میں ان کو ہر چند خلق کی چشم مَیں اُجلوں سے ہیں بدتر مُیلے
کس کی آہوں کا دھواں سوئے فلک جاتا ہے نظر آتے ہیں شبِ ہجر کے اختر مُیلے
خاکساروں ہی کا دنیا میں بڑا رتبہ ہے قیمتی ہوتے ہیں جو ہوتے ہیں گوہر مُیلے
آب شور اشک کا آنکھیں مری لے دوڑیں وونہی اس کی نتھ کے جو وہاں ہوگئے گوہر مُیلے
ملگجے کپڑوں میں دیکھے کوئی محبوبوں کو دونے لگتے ہیں بھلے دل کو یہ کافر مُیلے
بلج کرتا ہے کنھیاں کی طرح اژدرِ ہجر جن کو، ہو جاتے ہیں رخ ان کے مقرر مُیلے
اس کے مس سے مجھے ڈر ہے یہی پیارے نہ کرے تیرے رخسار تری زلفِ معنبر مُیلے
گل پہ رہتے ہیں عذار اس کے نہ ان پر سچ ہے اس کے گل تکیے سرہانے کے ہوں کیونکر میلے
عیب میں اہلِ فضیلت کے نہیں داخل چرک صاحبِ علم رہا کرتے ہیں اکثر مُیلے

مصحفی بادہ کشوں میں ہے وہ صاحب اقبال
جو کفِ یار سے اپنے کیے ساغر مُیلے

498

چھپایا تو نے منہ، بینش ہوئی یوں دور آنکھوں سے کہ جیسے مردے کی جاتا رہے ہے نور آنکھوں سے
نہیں رکھتا وہ آپ آئینہ اک دم دور آنکھوں سے ہوا ہے عشق جو اپنی اسے مخمور آنکھوں سے
مجھے اس شہر میں لے جا کے قاتل قتل تو کیجو نہ پٹی باندھنے کا ہو جہاں دستور آنکھوں سے
خواص دور بیں آئینۂ دل میں ہے عاشق کے نظر نزدیک آتا ہے وہ جو ہو دور آنکھوں سے

1۔ چرک : غلاظت

جہاں میں رنگ تھے جتنے نہ سمجھا ان کی کیفیت رہے وہ کور مادر زاد کی مستور آنکھوں سے
کہا تو نے نگہ مجھ پر نہ کر صدقے گیا تیرے بجا لاؤں گا تیرا حکم تا مقدور آنکھوں سے
خدا جانے طلوعِ نشہ میں یہ کیا غضب لاویں ٹپکتی ہے پڑی مستی تری مخمور آنکھوں سے
چمن میں شوق سے پھر تو کھلے بندوں مہِ تاباں بھلا دیکھے گی کیا نرگس تجھے بے نور آنکھوں سے
نہ سمجھے رتبہ تیرے حسن کا گو شخصِ نابینا قصور اس کا ہے کیا جو ہووے خود معذور آنکھوں سے
صفِ عشاق میں ایذا نہ ہوتا دست و بازو کو سدا لیتے ہیں کارِ تیغ یہ مغرور آنکھوں سے
اگر میں مصحفی رضواں کو لکھ کر یہ غزل بھیجوں
لگاوے خط مرا جنّت کی ہر اک حور آنکھوں پر

499

تیر کھا کر مگر آتا ہے یہ اس کے کُو سے آج کچھ بال کبوتر ہیں بھرے لوہو سے
شانہ اک لحظہ نہ ہوتا تھا جدا گیسو سے جن دنوں ربط تھا واں آئینے کو زانو سے
مجھ کو معلوم ہوئی خواہشِ طبعِ معشوق سر اٹھا تکیے پہ رکھا جو مرے زانو سے
چھوڑ دیتے ہیں جو عاشق کو پری چہرہ بتاں تو بھی جانے نہیں دیتے ہیں اسے قابو سے
اس سے جاتا ہی نہیں حسن پرستی کا خیال ہوں میں عاجز دلِ کمبخت کی اپنی خو سے
تیر سا دل میں لگا بادِ بہاری کی طرح ناقہ لیلیٰ کا جو مجنوں کے گیا پہلو سے
بھر کے خوں کاسے پہ کاسہ نہ پیے تا قاتل تشنگی جاتی ہے اس کی کوئی دو چلّو سے
میں تو اس سرو کو ساتھ اپنے چمن میں لایا کھا گئی جان مری فاختہ کیوں کُو کُو سے
مصحفی آپ کو دانستہ بنایا میں اَصم
رنج تا دل کو نہ ہووے سخنِ بدگو سے

500

پھر کرے سامنا آئینہ ترا کس رو سے تیر پر تیر لگے جب نگہِ جادو سے

شاہدِ حی کے مگر دستِ حنائی دیکھے خون جاری ہے جو چشمِ سیہ آہو سے
ایک کی بھی نہ صدا ہم نے سنی ٹوٹنے کی شیشے کتنے ہی گرے طاقِ خمِ ابرو سے
روزِ محشر نظر آوے گی حیاے زہّاد اٹھ گیا پردہ اگر اس کے رخِ نیکو سے
ساتھ پیکاں کے مری جان نکل آئی وونہی تیر ظالم نے جدا جب کہ کیا پہلو سے
شبِ فرقت بھی ہمیں زور دکھاتی ہے سمیں اشکِ خوں آنکھوں میں جھمکے ہیں پڑے جگنو سے
اک تو تھا ہی دہنِ تنگ ترا غنچۂ گل اور مسّی نے اسے تنگ کیا مازو[1] سے
زیبِ سر تھا جو ترا وصل کی شب اے ناداں باندھ دینا تھا وہ تعویذ مرے بازو سے

مصحفی خوب سا روتا ترا ٹھنڈا ہو دل
آتشِ عشق کوئی بجھتی ہے دو آنسو سے

501

جگر پہ صدمانِ غم سے ہے کچھ تو دل ہی دل میں ملال بھی ہے
سرِ تفکر ہے وقفِ زانو کہ شب بھی جوشِ خیال بھی ہے
لبوں پہ مسّی کی ہے دھڑی اور منہ اس کا پانوں سے لال بھی ہے
سوالِ بوسہ گر اس سے کیجے تو آج وقتِ سوال بھی ہے
لگے ہی جاتی ہے مجھ سے ہر دم یہ کون خو ہے یہ وضع کیا ہے
تپِ جدائی ترا برا ہو نہ چھیڑ کچھ مجھ میں حال بھی ہے
چمن میں نرگس کو کیا مرض ہے جو زرد ہوتی ہی جاتی ہے یہ
وگرنہ گل کی مزاج داں تو صبا بھی بادِ شمال بھی ہے
تجھے قسم ہے دھرم کی اپنے مجھے بتا دے تو سچ نجومی
ہے تیری پوتھی میں ہجر کی شب ویا کہ روزِ وصال بھی ہے

1۔ مازو = ماجو : ایک تخم جس سے مسّی تیار ہوتی ہے

بہ چشمِ کم تو نہ دیکھ زاہد زمینِ ناپاک میکدہ کو
ہے مستِ ذکرِ غفور ہر دم جو واں کا سنگ و سفال بھی ہے

کبھی ہے سرخی، کبھی ہے سبزی، کبھی سپیدی، زہے نزاکت
نہیں ہے اک رنگ پر کسی دم گر اس کا چہرہ بحال بھی ہے

صدا کرے ہے تمھارے در پر جو پھیری والا سا روز کوئی
یہ آنا جانا نہ بے سبب ہے کچھ اس کا آخر سوال بھی ہے

موے ہیں فرقت میں زہر کھا کر یہ جتنے عاشق ہیں اس صنم کے
گیا ہے یا سانپ سونگھ ان کو گلا کسی کا حلال بھی ہے

جہاں سمند اور ناقہ اس کا چلا پھرا ہے اسی زمیں پر
قرانِ خورشید و ماہ بھی ہے وصالِ بدر و ہلال بھی ہے

نشانِ دنداں کا شک پڑے ہے گمانِ بد کے سبب جو مجھ کو
جلائے ہے وہ بھی جی کو میرے جو لب پر اس مہ کے خال بھی ہے

نہ جاؤ سیرِ چمن کو صاحب کہ دوپہر روز آچکا ہے
مزاج میں ہے تمھارے گرمی پھر اس پہ وقتِ زوال بھی ہے

بہارِ گل میں ہو کیوں کہ یا رب نوائے مرغِ اسیر رنگیں
چمن سے افتادہ دور ہے یہ، قفس میں فرسودہ بال بھی ہے

اگرچہ اشعار اس زمیں میں درست کہنے ہیں سب کو مشکل
کہیں ہیں کچھ ایک مصحفی کو اور اک غزل کا خیال بھی ہے

502

وہ بحرِ خوبی ہے آفتِ جاں کسی میں ایسا جمال بھی ہے
حباب غبغب جو بدر ہے تو وہ موجِ غبغب ہلال بھی ہے

کرشمہ مژگاں سے تیغ زن ہے نشے میں ہر آنکھ لال بھی ہے
طلوع صہبائے لالہ گوں ہے فروغ حسن و جمال بھی ہے
کسی کو تلووں تلے مسلنا، کسی کا دل ایڑیوں میں ملنا
غرض کہ سروِ رواں کی میرے یہ چال بھی ہے وہ چال بھی ہے
پری و انسان و حور نے بھی نہ ہرگز اس کا سا چہرہ پایا
مثال دیوے تو کوئی کس سے جہاں میں اس کی مثال بھی ہے
شب عروسی ماہ ازیں کو اسیر کرنے کو مرغ زریں
محافے پر جو پڑے ہے اس کے وہ نور بھی ہے وہ جال بھی ہے
نہیں تڑپتا بہ زیر خنجر، ہے آنکھیں کھولے بروے قاتل
گلو بری بعد مرغ دل کو مگر امیدِ وصال بھی ہے
یہ کس کا سر باندھ کر کے تم نے کیا ہے گل رنگ دامن زیں
شکار بند اور رکاب تر ہے لہو میں رنگیں دوال بھی ہے
گلی میں اس قاتل جہاں کے جو جاوے تو کیوں کہ جاوے قاصد
قدم قدم پر پڑی ہیں لاشیں گزرنا واں سے محال بھی ہے
زبس رکھے ہے کمالِ شوکت وہ شاہِ خوباں حواشیوں میں
کرے کچھ احوال عرض اپنا کسی کی اتنی مجال بھی ہے
غرورِ عاشق نہ کیوں کہ ہووے شکستہ حالی ہے اور افزوں
ہے وہ بھی موے کمر سے مانا جو کاسۂ سر میں بال بھی ہے
قبول طبع سگاں ہوا ہے جو کوئی کشتے کا تیرے لاشہ
اسی کو زاغ و زغن ہیں کھاتے وہ رزقِ گرگ و شغال بھی ہے
بہ چشمِ کم بھی تو مصحفی کو نہ دیکھو کوئی کہ یہ خوش الحاں
اگرچہ جوں مہ زوال میں ہے ولیکن اس میں کمال بھی ہے

503

ایک رہرو کا نظر آیا ہے نقشِ پا مجھے
واے ناکامی ملا ہے سادہ یہ صحرا مجھے

کھینچتا تھا باب پیشانی پہ میرے اک الف
کس قدر آزاد کا طفلی میں تھا سودا مجھے

مثلِ مجنوں ہو کے زنجیری میں گلیوں میں پھرا
یہ نہ سمجھا تھا کرے گا عشق یوں رسوا مجھے

کرمکِ شب تاب کے رکھتا ہوں میں گم گشتہ بخت
جز بہ شب دن کو کسی نے بھی نہیں دیکھا مجھے

تیغ ابرو سے جو بچ کر دشت میں جاویں تو واں
خنجرِ فولاد ہو ہر بید کا پتا مجھے

اشک جو آنکھوں سے ٹپکے دانۂ انگور وار
یاد آیا کیا کسی کے کان کا سبزا مجھے

دِل گیا دیں بھی گیا، جاں بھی گئی، سر بھی گیا
اور خبر ان جانے والوں کی نہیں اصلا مجھے

دور رکھا بزمِ وصلِ گل رخاں سے تا بہ زیست
آسماں سے کیا ہے اپنے بخت سے شکوا مجھے

مصحفی عہدِ رضاعت تھا میں طفلِ بے زباں
ہوں ثنا گو اس کا اب جس نے کیا گویا مجھے

504

جان سے آخر فراقِ یار نے مارا مجھے
آہ پیش آیا وہی رہتا تھا جو دھڑکا مجھے

قصدِ ساحل ہے پہ ہاتھ اس پر پہنچ سکتا نہیں
بے قراری نے کیا موجِ لبِ دریا مجھے

گر یہی لیت و لعل ہے اور یہی دار و مدار
مار رکھے گا تمھارا وعدۂ فردا مجھے

شکرِ نسیانِ قضا مجھ پر ترحّم کر گئی
جبر تھا روزِ قیامت خواب سے اٹھنا مجھے

میرے صانع نے کیا احساں تو لیکن کیا کیا
خاک پر پٹکا بنا کر خاک کا پُتلا مجھے

جوں خسِ ناچیز میں از بس ضعیف و زار ہوں
لے اُڑے ہے ہر طرف اک باد کا جھونکا مجھے

مصحفی کوئی اگر مجھ کو برا پیچھے کہے
میں ہوں مستغنی، نہیں اس بات کی پروا مجھے

505

گر گیا یوں چھوڑ کر اے شوخِ بے پروا مجھے
صبح دم بستر پہ پاوے گا نہ تو جیتا مجھے

کام اپنا کر رہے گی اس کی چشمِ سرمہ ناک گر یہ وحشت ہے تو ہو جاوے ہی گا سودا مجھے
عاقبت میں روٹھ کر ان سے رہا خلوت میں بیٹھ خوش نہ آیا اختلاطِ مردمِ دنیا مجھے
آمدِ موسم کا کچھ بے ڈھب نظر آتا ہے ڈھنگ نوبہاراں میں نہ یہ گل سے کرے رسوا مجھے
بید کی مانند میں نے گل ہی لایا، نے ثمر خونِ دل سے سینچ پچھتایا چمن میرا مجھے
دم بدم حسنِ شباب اس کا ترقی پر جو ہے کچھ نظر آتا ہے ہر دم اور ہی نقشا مجھے
ایک دم کنجِ قفس میں تو بھلا رہنے دو چپ اے اسیرانِ قفس دیتے ہو کیوں ایذا مجھے

مصحفی اک میں رہا ہوں یادگارِ رفتگاں
جان تُو قائم مقامِ میرؔ اور مرزاؔ مجھے

506

مل رہا ہوں خاک میں بستر کی کیا پروا مجھے اک لگاوٹ نے ترے کاجل کی بس مارا مجھے
خال و خط کا عشق ہے، نے زلف کا سودا مجھے نیند پھر سونے نہ دے گی قلقلِ مینا مجھے
میری تربت پر حریفوں کی ہے گریہ میکشی پیار دلواتی ہے ناحق صورتِ زیبا مجھے
جنگ میں آخر صفِ مژگاں کے پانو اکھڑے مرے تھا ثبات اپنی کا بے جا اس قدر دعویٰ مجھے
اے فلک اٹھتی عمارت کا گرانا لطف کیا دے نہ تو داغِ شکستِ لالۂ حمرا مجھے
آفریں کی جا زباں پر میری آیا حرفِ تلخ ساقیا! دینی نہ تھی دُردِ تہِ صہبا مجھے

مصحفی کس زندگانی پر بھلا میں شاد ہوں
یاد ہے مرگِ قتیلؔ و مُردنِ انشاؔ مجھے

507

خوبرویوں کی حقیقت میں ہے چاہت باقی بعد مرنے کے بھی رہتی ہے محبت باقی
جو کوئی عالمِ فانی سے گزر کرتا ہے اس گلستاں کی اسے رہتی ہے حسرت باقی
لاؤں کس طرح سے میں تاب جفاہائے فراق سچ تو یہ ہے کہ بدن میں نہیں طاقت باقی

اس کا احوال بیاں تجھ سے کروں کیا مت پوچھ
تیرے بیمار میں مطلق نہیں حالت باقی

مجھ کو تب خلق کیا دل میں خوش اندا موں کے
جب کہ مطلق نہ رہی مہر و مروّت باقی

کوتہی ٹُو تو نہ اب کیجیو اے صبحِ وصال
آج تھوڑی سی رہی ہے شبِ فرقت باقی

آہ کیا ظلم ہوا صبح نمودار ہوئی
تھی ابھی شب بہ شبِ وصل شکایت باقی

دل و دیں یار کو دے کر کے ہوئے ہم فارغ
پاس جب کچھ نہ رہا، رہ گئی خجلت باقی

تیری تصویر تو حاضر ہے کرے اس میں چرخ
کلکِ صنعت میں ہو گر اور بھی صنعت باقی

دلِ بیمار جو کہنا ہو سو کہہ لے مجھ سے
دم میں رہنے کی نہیں اتنی بھی فرصت باقی

مصحفی ہجر کبھی، وصل کبھی ہووے گا
یار باقی ہے تو تا زیست ہے صحبت باقی

508

رو بہ مغرب منہ سے کون الٹے نقاب استادہ ہے
دیکھنے کو جس کے اب تک آفتاب استادہ ہے

پھاڑ کر پرزے کیا خط اس نے قاصد سادہ لوح
ناحق اس در پر بہ امیدِ جواب استادہ ہے

جب سے مہتابی پہ بچھوایا ہے اس مہ نے پلنگ
بہرِ امرِ پاسبانی ماہتا استادہ ہے

دیکھ کر جھمکا ترے کانوں میں اے دریائے حسن
چشمِ حیراں بن لبِ جُو پر حباب استادہ ہے

ایک دن دیکھا تھا منہ دھوتے جو تجھ کو حوض پر
آج تک فوارہ با چشمِ پُر آب استادہ ہے

اشک ریزاں کو مری نسبت سمندر سے نہ دو
اس کا پانی ہے رواں اور اس کا آب استادہ ہے

کس کی ہے تصویر میں حیراں ہوں اے مانی بتا
سامنے عاشق کے جو یوں بے حجاب استادہ ہے

بیٹھنے کا ذکر بزمِ بادشاہاں میں نہیں
ہے ادب کی جا یہاں ہر شیخ و شاب استادہ ہے

مصحفی کو بھیک گر دینا نہیں تو دو جواب
دیر سے اس در پہ یہ خانہ خراب استادہ ہے

509

اتنا تو کہے مرغِ گرفتار سے کوئی
تیلی بھی نہ ٹوٹی تری منقار سے کوئی

اس کوچے میں تکتا ہے مری چشم کا ہر سو
شاید نکل آوے در و دیوار سے کوئی

دشمن بھی مرے حال پہ کرتا ہے تأسف
مذکور مرا کچھ تو کرے یار سے کوئی

پھر باندھے ہلاکی پہ کمر روزِ جدائی
جاں بر ہو جو ہجراں کی شبِ تار سے کوئی

ڈر ہے مجھے سرگوشی کو جھکتے ہیں رقیباں
بوسہ تو نہ لے لے ترے رخسار سے کوئی

کیا مرغِ گرفتار کو پھر گل کی خبر ہو
قاصد بھی تو آتا نہیں گلزار سے کوئی

اک بوسے پہ دیتا ہوں تجھے نقدِ دل و جاں
منھ موڑتا ہے ایسے خریدار سے کوئی

کرتا ہے یہ ہر دم ہوسِ سیبِ زنخداں
کیا عہدہ برآ ہو دلِ بیمار سے کوئی

کیوں چپ یہ پڑا رہتا ہے بستر پہ ہمیشہ
کچھ دل کی تو پوچھے ترے بیمار سے کوئی

چھینٹیں تو میرے خون کی دھلوائیں ولیکن
دھبّا نہ گیا دامنِ دلدار سے کوئی

ابرو کے شہیدوں میں قیامت کو نہ اٹھا
مارا نہ گیا تا تری تلوار سے کوئی

گر جنبشِ ابرو کا یہ انداز ہے، اک دن
کاٹے گا گلا دیکھیو تلوار سے کوئی

کہتے ہیں کہ ڈالا اسے بالی میں پری نے
گل ٹوٹ پڑا تھا جو ترے ہار سے کوئی

گر دردِ محبت کی دوا ہاتھ نہ آوے
تو زہر ہی لادے مجھے بازار سے کوئی

رہیے نہ میاں مصحفی یوں اس سے کشیدہ
کرتا ہے کنارا بھی طرحدار سے کوئی

510

میلانِ طبع اس کو اِدھر کھینچ لائی ہی
ملنے کی غیر کے قسم اس بت نے کھائی ہی

جی اس کا روزِ وصل کی سن کر نہ رہ سکا
دوڑی شبِ فراق بھی پیچھے سے آئی ہی

تھا گل سے خامشی کا جو وعدہ کہاں رہا
مرغِ چمن نے دھوم چمن میں مچائی ہی

ممنوں، حنائی پا کا میں اس کے نہ کیونکہ ہوں
کٹنی یہ اس کو ساتھ لگا کر لے آئی ہی

آخر نہ اس سے ضبط نگاہوں کا ہوسکا
آنکھ آرسی میں عکس سے اپنی لڑائی ہی

سن سن کے کانپتا تھا میں جس تیرہ شب کا نام	آخر وہ شب بھی دورِ فلک نے دکھائی ہی
رحم اس کو صائموں پہ نہ آیا شبِ فراق	نالے نے میرے صبح کی نوبت بجائی ہی
کیا غم ہے گو نہ واں کی ہمیں سلطنت ملی	کوچے میں اس کے یار کریں گے گدائی[1] ہی

آزادی کا بھرے تھا وہ دم مجھ سے مصحفی
تو نے تو در پہ یار کے دھونی رمائی ہی

511

بادِ صبا[2] پیامِ گلِ صبح لائی ہی	مرغِ اسیر کی اجل اے وائے آئی ہی
اندیشہ اس کی چشم کا شاید کچھ آگیا	نرگس نے مجھ سے آنکھ چمن میں چرائی ہی
کہہ کر گیا تھا یہ تو نہ آؤں گا میں کبھی	آکر غمِ فراق نے صورت دکھائی ہی
منھ دیکھ کر میں بلبلِ نسیاں کا رہ گیا	نالے کی میرے طرز جب اس نے اڑائی ہی

شب نالہ کر کے مصحفی خاموش رہ گیا
تالو سے بس زبان شکایت لگائی ہی

512

گھر کا رستہ تو مرے تو نے میاں دیکھا ہے	بس اکیلا ہی چلا آ جو مکاں دیکھا ہے
ہم نشیں غیر کا میں اس کو جہاں دیکھا ہے	حلق پر رشک کے خنجر کو رواں دیکھا ہے
وعدہ کر کے نہیں آیا تو مرے گھر جس رات	صبح تک چشم کو اپنی نگراں دیکھا ہے
پارۂ شیشۂ دل وصل جو کر دیتے ہیں	تم نے گھر اس کا بھی اے شیشہ گراں دیکھا ہے
ہر سڑی کو ہے یہاں عقل کا اپنی دعویٰ	جس کو دیکھا ہے فلاطونِ زماں دیکھا ہے
آج قمری ہے قفس سے جو رواں ہونے پر	اس نے شاید کہ کوئی سروِ رواں دیکھا ہے

1۔ اس شعر سے واضح ہو جاتا ہے کہ ردیف "ہے" نہیں بلکہ "ہی" ہے۔

2۔ اس غزل کے شروع میں یہ نوٹ درج ہے: "غزل ثانی حسب فرمائش عزیزی گفتہ شد"۔

گرچہ ہیں پیر، پہ بسیاریِ شادی کے سبب آپ کو وصل کی شب ہم نے جواں دیکھا ہے
سب ہیں پرسش کے گرفتار ترے کوچے میں خلق نے حشر کا ہنگامہ عیاں دیکھا ہے
تاب رہتی نہیں عاشق کو دمِ دیدۂ دوست سامنے ماہ کے رعشے میں کتاں دیکھا ہے
کیا غریبوں کو بتاویں گے رہِ ملکِ عدم گم ہیں آپھی وہ جنھوں نے وہ وہاں دیکھا ہے
مصحفی تو جو یہ کہتا ہے میں دیکھا ہے اسے
جھوٹ کہتا ہے ابے چل، تو نے کہاں دیکھا ہے

513

دوسرا تجھ سا کم اے آفتِ جاں دیکھا ہے گرچہ ان آنکھوں نے بھی ایک جہاں دیکھا ہے
طرفِ نجد میں ناقے کو رواں دیکھا ہے اس نے بھی قیس کا شاید کہ مکاں دیکھا ہے
برگِ سوسن مری نظروں سے گرا جاتا ہے رنگ مسّی کا جو واں زیبِ زباں دیکھا ہے
تیرے دامن کو میں کھینچا ہے گراے سرورواں سالہا خونِ دل آنکھوں سے رواں دیکھا ہے
کیا تماشا ہے تہِ خاک یہ معلوم نہیں چشمِ نرگس کو ادھر ہی نگراں دیکھا ہے
ایسے معشوق کی پھر کیوں کہ تجسس کیجے نام ہی جس کا سنا ہے نہ نشاں دیکھا ہے
یوں ہی بکتا ہے یہ واہی سا منجّم نے ابھی زائچہ طالعِ مجنوں کا کہاں دیکھا ہے
علم والے نہیں محروم تری رویت سے آگ بھی دیکھ رہیں گے جو دھواں دیکھا ہے
کیا شبِ وصل کی مجلس کا بتاؤں تمھیں رنگ بھولتا دل سے نہیں واں جو سماں دیکھا ہے
میرے مژگاں پہ نہ ہوں کیوں مرے آنسو غلطاں سر کے بالوں پہ میں شیشے کو رواں دیکھا ہے
مصحفی گو ہیں سبک اس سے تواضع لی ہے
جس گراں ڈیل کو ٹک ہم نے گراں دیکھا ہے

514

قصۂ مجنوں پسندِ خاطرِ جانانہ ہے ورنہ خواب آور تو اپنے غم کا بھی افسانہ ہے

شمع کے شعلے سے بن بن برق گرتے ہیں شرار
مضطرب صحنِ لگن میں کیا کوئی پروانہ ہے

خواہ وہ سیدھا رکھے اس کو بناوے خواہ کج
اختیارِ زلفِ محبوباں بدستِ شانہ ہے

ہاتھ کو میرے گریباں سے ہوئی ہے آشتی
جب سے تزئینِ کمر واں بہلۂ ترکانہ ہے

کلبۂ دل کو مرے مت ڈھائیوا ے سیلِ اشک
اس کی تصویرِ خیالی کا یہ عشرت خانہ ہے

باغ کو جنت نہ سمجھیں کس طرح مستانِ عشق
شاخِ گل ہے حور کی ساعد تو گل پیمانہ ہے

بیشتر جاتا ہے مجنوں کوچۂ لیلیٰ کی سمت
پر کوئی کیونکر کہے اس کو کہ یہ دیوانہ ہے

تین حصے ہیں زمیں کے غرقِ دریاے محیط
ربع مسکوں میں کچھ آبادی ہے کچھ ویرانہ ہے

واں رسائی ہی نہیں مجنونِ صحرا گرد کی
عالمِ امکاں سے بھی باہر مرا ویرانہ ہے

مصحفی دنداں جو تیرے گر گئے تو غم نہ کھا
سیروں انگور اس کے باغِ حسن میں بیدانہ ہے

515

ظلمت زدہ ہے سرخی ترے رنگِ آل[1] کی
کھو دیوے آگ جیسے سیاہی زکال[2] کی

ہوتا ہے ماہ کھیت میں کیسر کے جلوہ گر
گاتی[3] جو باندھ لیوے ہے وہ زرد شال کی

واحسرتا! نصیب نے چونکا دیا وونہی
آئی نظر جو خواب میں صورت خیال کی

اے شوخ تیرے حسن کا عالم ہے گر یہی
پتلی سپید ہووے گی چشمِ غزال کی

نکلا زوال سے جو ترا آفتابِ حسن
کیا آنکھ پڑ گئی کسی صاحب کمال کی

اُس کبکِ خوش خرام کی طرزِ خرام نے
کھیتی ہمارے دل کی ہری پائمال کی

گریے نے دل نہ صاف کیا اپنا یا نصیب
باراں سے گرد دھوئی گئی ہر سفال کی

وہ آفتاب چہرہ اگر آئے بام پر
پھر جائے نورِ ماہ سے کشتی ہلال کی

خوش لہجہ گر غلط بھی کہے کچھ، وہ ہو صحیح
تعریف کی نبیؐ نے اذانِ بلالؓ کی

1۔ آل : سرخ　　2۔ زکال: کوئلہ　　3۔ گاتی: چادر جو سینے پر لپیٹ لی جائے

اس چرخِ کج خرام سے شکوہ رہا یہی　صورت نہ اس نے ہم کو دکھائی وصال کی
اس ماہِ کوچہ گرد کو دیکھا تھا ایک رات　اس شب سے نیند جاتی رہی کوتوال کی
خورشید و ماہ پہیوں میں ہو جاویں اس کے چرخ　گر کشتیِ سپہر بنے اس کی پال[1] کی
کوچے کا تیری زلف کے ہادی کروں اسے　شانے نے سیر کی ہے ترے بال بال کی
محتاج سے نہ پوچھ کہ کیا تجھ کو چاہیے　مردِ فقیر آپ ہے صورت سوال کی

دنیا کبھی ہوئی بھی ہے تسخیر مصحفی
جاتی نحوست اپنے اگر ماہ و سال کی

516

آنکھوں کو اس کی دیکھ کے بیمار ہم ہوئے　زلفوں سی اک بلا میں گرفتار ہم ہوئے
جب فصلِ گل قفس میں گرفتار ہم ہوئے　یہ جی رندھا کہ زیست سے بیزار ہم ہوئے
تو عزّتِ رقیب کا خواہاں رہا سدا　ظالم تری بلا سے اگر خوار ہم ہوئے
باندھے پھریں ہیں ہم پہ وہ دن رات تیغ کیں　سر بیچ کر کے جن کے خریدار ہم ہوئے
کچھ ایسا آنکھ کھلتے ہی آرام آگیا　جو صبحِ حشر کو بھی نہ بیدار ہم ہوئے
بادِ صبا بھی اینٹھ گئی ہم کو دیکھ کر　دو چار دن جو گل کے ہوادار ہم ہوئے
تو بھی کسی نے ہم کو چمن میں جگہ نہ دی　تا آں کہ آشنائے گل و خار ہم ہوئے
سر بار تھا، حوالۂ تیغِ اجل کیا　اب کے سفر میں خوب سبک بار ہم ہوئے
ایسا شرابِ عشق کا کچھ نشّہ چڑھ گیا　جو تا بروزِ حشر نہ ہشیار ہم ہوئے
کی دل ہی دل میں حسرتِ نظارہ ہم نے جوں　کس خوب رو کے طالبِ دیدار ہم ہوئے
بوسہ لیا نہ عید کی شب پاے یار کا　مہندی لگانے کے تو گنہگار ہم ہوئے
اب بزمِ عیش میں جو بلاتے نہیں بتاں　ان کافروں کے ایسے گنہگار ہم ہوئے
ناگفتنی ہے حالِ دلِ زار کیا کہیں　کن کن مصیبتوں کے سزاوار ہم ہوئے

1۔ پال کی: یعنی پالکی

چاہت میں تیری لاکھ طرح کے ستم سہے لوہولوکا[1] گہہ، گہے بیمار ہم ہوئے
مجنوں کی طرح ہو کفِ طفلاں سے سنگسار تشہیر شہر کوچہ و بازار ہم ہوئے
سرگشتہ گردباد صفت گہہ پھرا کیے گہہ پائے بندِ دامنِ کہسار ہم ہوئے
آخر دیا بہ ترک محبت قرار عشق سمجھے بھلا اسی میں جو ناچار ہم ہوئے
حیرت نے کس کے حسن کی گھیرا یہ مصحفی
تصویر کی طرح سے جو بیکار ہم ہوئے

517

گولی سے چوئے کوئی، کوئی تیر سے ٹپکے پر خوں نہ زمیں پر تری شمشیر سے ٹپکے
جب زہر ہی آبِ دمِ شمشیر سے ٹپکے کیا ذبح کے دم خوں ترے نخچیر سے ٹپکے
خجلت دہِ زاہد ہے ریاکاریِ زاہد کیوں کر نہ عرق سبحۂ تزویر سے ٹپکے
بے اصل سے سیراب نہ ہو مزرعِ خواہش قطرہ نہ کبھی ابر کی تصویر سے ٹپکے
گر اس سے جدا ہو تری انگشت حنائی کیا دور جو خوں دیدۂ رہگیر سے ٹپکے
مژگانِ پری خامۂ مانی میں بندھے کاش تا رنگِ نزاکت تری تصویر سے ٹپکے
اس دستِ حنائی کا اگر وصف لکھوں میں کاغذ پہ لہو خامۂ تحریر سے ٹپکے
مجروح ہیں ساقیں مری کیا اس کا عجب ہے چلنے میں جو خوں حلقۂ زنجیر سے ٹپکے
مجھ پیر میں آجائے نئے سر سے خوابی ٹپکا کوئی ایسا فلکِ پیر سے ٹپکے
انجیر ہو گر زاغ کی منقار سے زخمی قسمت سے مری خوں ہی اس انجیر سے ٹپکے
گر عالمِ علوی ہو سبھی تعزیہ خانہ اک اشک نہ چشمِ فلکِ پیر سے ٹپکے
اے مصحفی جب ایسی غزل تو نے کہی ہو
تو کیوں نہ فصاحت لبِ تقریر سے ٹپکے

1۔ لوہولوکنا: خون ڈالنا

518

لختِ دل چشم سے یاقوت کے رنگ آتا ہے
اس لطافت سے کسے گریے کا ڈھنگ آتا ہے

آپ کو میں نے کیا ہجر کی شب آپ ہلاک
یہی ہوتا ہے جب انسان بتنگ آتا ہے

جس جگہ قیس کی تربت ہے زیارت کو وہاں
شیر آتا ہے گہے، گاہ پلنگ آتا ہے

رقصِ جمّازہ دکھاوے گا مگر مجنوں کو
ناقہ باندھے ہوئے جو پانو سے زنگ آتا ہے

آدمی کیا وہ نہ ہو جس میں ذرا بھی غیرت
لال مادہ کے لیے برسرِ جنگ آتا ہے

کوچۂ یار میں جس وقت کہ رکھتا ہوں قدم
شیشۂ دل پہ مرے چرخ سے سنگ آتا ہے

یار کا تیر ہوائی جو گرے ہے سوے خاک
میری تربت ہی پہ آخر وہ خدنگ آتا ہے

تجھ میں جو کچھ ہے صنم لیلیٰ و عذرا میں نہیں
دلفریبی کا نہ ہر ایک کو ڈھنگ آتا ہے

یا کبھی دم ہی نکلتا تھا پری زادوں پر
یا یہ نفرت ہے کہ اب نام سے ننگ آتا ہے

مصحفی عشق کی آتش سے ذرا بچ کے نکل ق جل ہی جاتا ہے جو شعلے میں پتنگ آتا ہے

غنچۂ گلزار میں جب برسرِ رنگ آتا ہے
اور مرغِ چمنی جی سے بتنگ آتا ہے

رجم منظور ہے مجنوں کا مگر جانبِ دشت
ہر بگولہ جو لیے جھولی میں سنگ آتا ہے

مسّی آلودہ ہوئے یار کے دندانِ سپید
کشورِ حسن میں موتی پہ یہ رنگ آتا ہے

519

دہانِ غنچہ وش اس کے پہ گل کے پاس عاشق ہے
نہ کیوں کہ خوش ہو وہ معشوق جس کے پاس عاشق ہے

منڈانے سے بھی باز آتا نہیں سبزہ ترے خط کا
عجائب ماجرا ہے یہ کہ گل پر گھاس عاشق ہے

سدا امیدواروں میں گنے جاتے ہیں ہم تیرے
نہیں ہوتا ہمارا کام، ہم پر یاس عاشق ہے

ہوا ہے ہے دل تو اس کا تجھ پہ لیکن لیک جینے سے
جدائی میں تری اے بے وفا بے آس عاشق ہے

اگر لب سے نکلتا ہے تو پھر گھیرے ہے راس اس کو — ہمارے مہرِ طالع پر ذنب اور راس عاشق ہے
لبِ شیریں پہ تیرے کچھ نہ میں ہی جان دیتا ہوں — اسی آبِ بقا پر خضر اور الیاس عاشق ہے
اندھیرے اور اجالے اس کو اس کوچے میں دیکھوں ہوں
تمھارا مصحفی بھی کتنا بے وسواس عاشق ہے

520

جہاں باہم محبت ہو گئی ہے — دلوں کے بیچ الفت ہوگئی ہے
ترے امیدواروں کی دمِ نزع — نگاہِ یاس حسرت ہوگئی ہے
کیا ہے عود پھر دردِ جگر نے — اگر دو روز فرصت ہوگئی ہے
جدائی میں بتاں کی، جان اپنی — بہت بے تاب و طاقت ہوگئی ہے
ترے پانو پہ کیوں سر رکھ نہ دیویں — یہی اپنی تو عادت ہوگئی ہے
جہاں مدفوں ہوئے ہیں تیرے کشتے — وہاں تربت پہ تربت ہوگئی ہے
نہیں رکھتے جو الفت مصحفی سے ق — انھیں پھر کس سے رغبت ہوگئی ہے
نگاہِ ناز اس کی ان دنوں تو
نہایت بے مروّت ہوگئی ہے

521

میں کعبۂ جنوں کے جو نکلا حریم سے — ناگہ ہوا دوچار بلائے عظیم سے
رنجِ فراقِ یار رہا ساتھ روح کے — مر کر بھی چھوٹے ہم نہ عذابِ الیم سے
اس کو بھی دیکھ لیں گے جو درپیش آئے گا — واعظ ڈرا نہ روزِ قیامت کے بیم سے
کیوں صبح دم جگا کے لے آئی نہ ہم کو ساتھ — اتنا گلہ کریں گے چمن میں نسیم سے
کچھ اختراع یہ ان کا نہیں بد مزاجیاں — ایسے ہی ہوتے آئے ہیں خوباں قدیم سے
ہم وے نہیں کہ ڈالیں رخِ اغنیا پہ آنکھ — تیور گدا کے کھلتے ہیں دستِ کریم سے

یا رب گناہ اپنے تو بے طور ہیں مگر امید پڑتی ہے، ترے لطفِ عمیم سے
اللہ رے داغِ عشق کی سوزش کہ رات دن رہتا ہے نت مقابلہ نارِ جحیم سے
داغِ شبِ وصال نہ عاشق کا کم ہوا تابش سہیل سے ہے تو جلنا ادیم سے
اتنا بھی ہو نصیب کسی کا نہ واژگوں گردش ہمارے بخت نے سیکھی ہے جیم سے
کیسے چمن میں آ کے گرفتار ہم ہوئے اپنا دماغ ہی نہیں واقف شمیم سے
دو چار دن سے اس کی تجلّیِ حسن نے چُھٹوا دیا ہے طُور کا جانا کلیم سے
ہووے جو مصحفی کا کوئی آج قدرداں
رتبے میں کم نہیں یہ کلیم و سلیم سے

522

کس نے رکھے تھے قفس ان پہ گرفتاروں کے کانٹے کیوں سرخ ہیں سب باغ کے، دیواروں کے
کون کہتا ہے کہ پھر خاک سے اٹھتے ہیں شہید سر اٹھا سکتے ہیں مارے تری تلواروں کے؟
کل جو آئے تھے ترے کوچے میں از بہرِ علاج آج جاتے ہیں جنازے انھی بیماروں کے
شعلۂ شمع سمجھ ان پہ گرے پڑتے ہیں بسکہ پروانے ہیں عاشق ترے رخساروں کے
سرخیِ رنگ میں زردی سی جھلک جاتی ہے کس نے بوسے یہ لیے ہیں ترے رخساروں کے
اس گھڑی دیکھیو ہنگامۂ محشر کی نمود وا ہوں جب نامۂ اعمال گنہ گاروں کے
وا ہوا گر سرِ بازار ترے رخ سے نقاب دم بھڑک جائیں گے رستے میں خریداروں کے
اپنی نظروں تری صورت کا نہیں کوئی چڑھا نقش دیکھے ہیں بہت ہم نے طرحداروں کے
سیوتی کے وہی گل چیں نے چنے نازک پھول جن نے گل تکیے بنیں گے ترے رخساروں کے
ایسی آسان ہے کیا محنت شب بیداری دیدے آئے ہیں اگل جاگنے سے تاروں کے
شعر و شطرنج سوا مشغلہ پھر کون سا ہے
مصحفی کام بھی کچھ ہوتے ہیں بیکاروں کے

523

ان بتوں کی چال سے جاتے ہیں برباد آدمی
ظلم سے کرتے ہیں ان کے داد و بیداد آدمی

نیل کی کھتری کا جانا کیوں نہ یاد آوے کہ ہاے
واں بھی آتے تھے نظر کیا کیا پریزاد آدمی

محکمے میں ایسے پھر جانا ہے میرا کیا ضرور
کر سکے ہرگز جہاں تیری نہ فریاد آدمی

سچ بتا نا سخت جاں مجھ سا بھی دیکھا ہے کوئی
عاقبت مارے ہیں تو نے کتنے جلاد آدمی

حاملِ بارِ امانت اس کو ہوتا ہی نہ تھا
آہ کیا چوکا نہ تھا کچھ کوہ فولاد آدمی

لاکھ طائر کے گلے پر پھر رہی ہے یاں چھری
رحم کیا جانے کہ کیا ہوتا ہے صیّاد آدمی

کہہ دیا میں نے تو اے قمری نہ جانا اس کے پاس
ہے لباسِ سرو میں پنہاں یہ صیّاد آدمی

اس کے کوچے میں طرف مقتل کے جانا کیا ہے فرض
یہ وہ جا ہے جس میں جی دیتے ہیں ناشاد آدمی

قدر تب ہووے گی اس دنیاے فانی کی اسے
جاوے گا جب چھوڑ کر یہ عشرت آباد آدمی

آدمی سے آدمی کی جب نہ حاجت ہو روا
کیوں خدا ہی کی کرے اتنی نہ پھر یاد آدمی

قطرۂ ناپاک سے پیدا کیا خالق نے پاک
کیوں کرے غرّا جو سمجھے اپنی بنیاد آدمی

اس کا ثانی آج تک تو کوئی میں دیکھا نہیں
مصحفی کہتے ہیں جس کو ہے وہ استاد آدمی

524

سودے میں تری تیغ کے جاں یار لگائی
عاشق نے یہ قیمت سرِ بازار لگائی

دالان میں پردے کی ہوئی جب اسے خواہش
خادم نے وہاں اوٹ کی دیوار لگائی

آتی ہے نظر رو بہ کمی سوزشِ سینہ
کیا سرد دوا کچھ دلِ بیمار لگائی

آنے کا تصور جو رہا یار کے، ہم نے
دروازے کی کنڈی نہ شبِ تار لگائی

کہتے ہیں کہ مشاطۂ بے رحم نے اس شب
مہندی ترے ہاتھوں کو قلم کار لگائی

صیاد کا بے جا یہ اسیروں پہ غضب ہے
کس دن گرہِ دام سے منقار لگائی

کم قسمتیِ طالعِ عاشق پہ نظر کر پٹ پھر گئے قاتل نے جو تلوار لگائی
صادق نہ ہوا قول عدو کا کوئی، اس نے تہمت تو ترے وصل کی سو بار لگائی
شانے کی طرح کھال مری کیوں نہ ادھڑ جائے کچھی تری کاکل نے گرہ دار لگائی
اٹھ بیٹھا وونہی قبر سے وہ شوخ نے تیرے جس مردے کو ٹھوکر دمِ رفتار لگائی
مقدور ہے میرا کہ اسے ماروں گا گیندا پھولوں کی چھڑی جس کو نہ زنہار لگائی
اے مصحفی آنکھ اس کی بنی فتنۂ محشر
کاجل کی جو اک انگلی دھواں دھار لگائی

525

لاگ اس کے تصور نے جو اک بار لگائی بس منھ کے پھراتے وونہی تلوار لگائی
صیاد نے کل پھولوں کو بلبل کے قفس پر انبار کیا اتنا کہ دیوار لگائی
یہ کام کیا آہِ جگر سوختگاں نے دھونی ترے کوچے میں جفاکار لگائی
چھلا ترے پانو کا مرے ہاتھ نہ آیا آنکھوں سے نشانی یہ کئی بار لگائی
جب ذبح کو آیا وہ مرے، سنگ دلی دیکھ پتھر پہ بھی ظالم نے نہ تلوار لگائی
ہجراں میں کبوتر نے مری بے مزگی دیکھ منقار سے بادہ کی نہ منقار لگائی
وہ کیا کوئی رستے سے جو تصویر کسی کی
دنبالِ دلِ مصحفیِ زار لگائی

526

کاجل میانِ چشمِ خماری لگائیے خاطر سے اک سلائی ہماری لگائیے
گر دسترس رکاب تلک اس کی ہو ہمیں آنکھوں سے پانو وقتِ سواری لگائیے
عاشق کا قتل کیجے نہ جلاد کے سپرد تیغ اپنے ہاتھ سے کوئی کاری لگائیے
پہنچے نہ صدمہ پنجۂ نازک کو آپ کے قبضہ نہ پھل پہ تیغ کے بھاری لگائیے

عاشق کا سر گرا تو کہا جی میں یار نے ایسا کسی کے زخم نہ کاری لگائیے
سوسن کے سر پہ لائیے آفت نہ میری جاں ٹوپی میں سوسنی نہ کناری لگائیے
مرجھا چلا ہے غنچۂ دل، ہے مدد کا وقت اتنی نہ دیر بادِ بہاری لگائیے
بے چین ہوں الم سے شبِ ہجر مصحفی
آتا ہے جی میں اپنے کٹاری لگائیے

527

یوں چاہیے تو ایک کٹاری لگائیے پر ہم کو غیر سے تو نہ یاری لگائیے
بیٹھا جو میرے پاس وہ دم بھر تو نازِ حسن بولا وونہی کہ جلد سواری لگائیے
بے عشق کیا نہ گزرے گی ایسی غرض ہے کیا کیوں اس سے دل بہ منت وزاری لگائیے
آئے ہیں دن بہار کے اب چلیے سوے باغ واں دامِ طائرانِ شکاری لگائیے
آویں فرشتے چرخ سے اس کے طواف کو تصویر جس مکاں میں تمھاری لگائیے
کچھ میرا ذکر کیجیے نہ اس گل کے سامنے یہ آگ تو نہ بادِ بہاری لگائیے
تھوڑا نمک بھی ساتھ ہے قاتل کے اس لیے اس پر چھڑکیے زخم جو کاری لگائیے
دامن پہ ہے یہ اے بتِ رقاصہ دور اور پیٹھا جگہ سنجاف کی بھاری لگائیے
ناخن بھرے ہیں خوں میں مرے آج مصحفی
کچھ تو دواے سینہ فگاری لگائیے

528

شکلِ امید تو کب ہم کو نظر آتی ہے صورتِ یاس بھی بن بن کے بگڑ جاتی ہے
آج تک صورتِ شیریں سا نہ نکلا نقشا روحِ فرہاد بھی تیشے کی قسم کھاتی ہے
بعد چھٹی کے بھی کر دیتی ہے وہ روز کو شام مادرِ لیلیٰ نہیں لیلیٰ کو سمجھاتی ہے
بیچنے آئینۂ دل کو جو لاتا ہوں کبھی نگہِ ناز تری غیر سے انکواتی ہے

کشتۂ نفرتِ تصویرِ خیالی ہوں ترا ہے مرے پاس ہی اور وصل کو ترساتی ہے
بادہ نوشانِ محبت کی خبر کیا ہے اسے نرگسِ مست تری آپ ہی مدھ ماتی ہے
خندۂ برق نے پایا نہیں انداز اس کا مسکرانے کی ادا تیرے مجھے بھاتی ہے
کس کے آنے کی خبر ہے پئے گل گشتِ چمن جو ہر اک گل کی کلی آج کھلی جاتی ہے
سوزشِ دل سے میں دن رات پھنکا جاتا ہوں ہوئی اک عمر یہ اخگر نہیں کجلاتی ہے
ہے دِلا! ان سے عبث غیر کے ملنے کا گلہ خوبرویوں کی طبیعت ہی میں بدذاتی ہے
مصحفی گوشۂ میخانہ میں رہنا ہے برا
مست و مدہوش عجب اس کی خوش اوقاتی ہے

529

کب صبا سوے اسیرانِ قفس آتی ہے کب یہ ان تک خبرِ آمدِ گل لاتی ہے
دخترِ رز کی ہوں صحبت کا مباشر کیوں کر ابھی کم سن ہے، بہت مرد سے شرماتی ہے
کیوں کہ فربہ نہ نظر آوے تری زلف کی لٹ جونک سی یہ تو مرا خون ہی پی جاتی ہے
جسم نے روحِ رواں سے یہ کہا تربت میں اب مجھے چھوڑ کے تنہا تو کہاں جاتی ہے
کیا مگر اس نے سنا شہرۂ حسن اس گل کا آنکھیں کجال سے نرگس بھی جو بنواتی ہے
لاکھ ہم شعر کہیں، لاکھ عبارت لکھیں بات وہ ہے جو ترے دل میں جگہ پاتی ہے
ہووے کس طرح دلیرانہ وہ عاشق سے دوچار اپنے بھی عکس سے جو آنکھ کہ شرماتی ہے
مصحفی کو نہیں کچھ وصفِ اضافی سے تو کام
شعر کہنا زبس اس کا صفتِ ذاتی ہے

530

نرمیِ بالشِ پر ہم کو نہیں بھاتی ہے دمِ شمشیر پہ سر رکھیں تو نیند آتی ہے
کیا بری خو ہے مری بھی کہ بہ ایں دعویِ عقل میں بھی جاتا ہوں وہاں جان جہاں جاتی ہے

ناقبول اتنا ہوں مردے کو مرے بعد از مرگ ۔۔۔ گور میں رکھیں تو مٹی بھی نہیں کھاتی ہے
حسن دیکھا ہے مگر ہند کی تصویروں کا ۔۔۔ لیلیٰ بازار میں شکل اپنی جو بدلاتی ہے
نہ بچے گا کوئی ہرگز جو ہے رخ کی یہ صفا ۔۔۔ نہ جیے گا کوئی مطلق جو یہ خوش گاتی ہے
خیر سلا سے نسیمِ سحری گھر جاوے ۔۔۔ کر کے ذکرِ رخِ گل کیوں مجھے پٹواتی ہے
ستمِ بادِ خزاں سے جو کوئی گل کی کلی ۔۔۔ شاخ پر خشک ہو رہ جاتی ہے مرجھاتی ہے
بے کسی اپنی کا عالم مجھے آجائے ہے یاد ۔۔۔ کہ گریباں میں مرا سر یوں ہی جھکواتی ہے

مصحفی کی کوئی امید تو بر لا یا رب!
مدتوں سے یہ ترے در کا مُناجاتی ہے

531

پھر لگا سودا سا کچھ ہونے شروع سال سے ۔۔۔ یاد دلواتی ہے سرسوں زعفرانی شال سے
ماریں ہیں لگ لگ کے گیندے باغ میں گیندے کے پھول ۔۔۔ دل میں کچھ سوئیاں سی چبھتی ہیں گیہوں کی بال سے
حقّہ کش عاشق نکالیں ان سے گردِ جگر ۔۔۔ کم نہیں شبّو کے گل بلّور کی منہنال سے
اب تو ہم سیرِ چمن میں آ پھنسے جی آ پھنسے ۔۔۔ دیکھیں کب ہو عشق پیچے کے نکلنا جال سے
دھوم سے آتی ہے اب کے باغ میں فصلِ بہار ۔۔۔ یہ خبر ہم نے سنی اک مرغِ فرخ فال سے
اب انھیں برگ و ثمر سے دیکھتا ہوں میں نہال ۔۔۔ وہ درختِ خشک آتے تھے نظر کنگال سے

نورسانِ[1] باغ کے چہرے کا دھووے گی غبار
سوجھتا ہے مصحفی یہ آبِ جو کی چال سے

532

خوش نہیں ہوتا دل اب مذکورِ خط و خال سے ۔۔۔ لڑ رہی ہے آنکھ اپنے نامۂ اعمال سے
جذبۂ عشقِ رخِ گل نے دکھایا گر کمال ۔۔۔ اک پھڑک میں باغ تک پہنچے گی بلبل جال سے

1۔ نورساں (نورس کی جمع) تازہ پھل

اہلِ دولت گر نہیں شایانِ دولت جانتے　مجھ کو بھی بالطبع نفرت ہے قبا و شال سے
آپ واقف ہے تو اے دانندۂ رازِ نہاں　گو نہ شرحِ خواہشِ دل ہو زبانِ لال سے
بادشاہانِ جہاں آتے ہیں بن مجرم کی شکل　باندھ کر ہاتھ اپنے تیرے سامنے رومال سے
باندھ کر پوٹ اس کو دریا میں بہا دیتے جو یار　مردہ میرا چھوٹ جاتا منّتِ غسّال سے
روزِ محشر سرخ رو اٹھا وہی اس کا شہید　لال منہ جس کا کیا تھا اس نے لالو دال سے
گر نہ اس قاتل کو آیا اپنے کشتے سے حجاب　مار کر تلوار پھر کیوں منہ چھپایا ڈھال سے
نامہ گر بھیجے مجھے وہ شوخ لازم ہے اسے　باندھ دے خط کی کمر چوٹی کے اپنے بال سے

مصحفی میں ہوں فقیر اللہ کا عزلت نشیں
کام کچھ مجھ کو نہیں ادبار اور اقبال سے

533

رہیں وہ اس چمن میں جن کو لطفِ آشیاں بھی ہے　خیالِ روئے گل کے ساتھ پھر ذوقِ فغاں بھی ہے
کشادہ رو جو تیرے ہیں بتاں دلی کی گلیوں میں　یہ کس کے حفظ میں ہیں کوئی ان کا پاسباں بھی ہے
گلی میں اس کی جانا سہل سمجھے کس طرح عاشق　ملامت گر کا خطرہ، تس پہ بیمِ طاعناں بھی ہے
اُڑھا لے اپنے محمل کو گھٹا ٹوپ آج اے لیلیٰ　کہ ساتھ اس قافلے کے قیسِ عالی دودماں بھی ہے

نہ سمجھے مصحفی کچھ بے حقیقت اس قدر کوئی
دل اس کا موم تو ہے لیک یہ آتش زباں بھی ہے

534

جمع جب بالیں پہ میری آشنا سارے ہوئے　نزع میں سن وہ بھی آئے مہرباں بارے ہوئے
حکم پرواز آسماں کس کا ہے میں حیران ہوں　روز و شب جاتا ہے رخشِ عزم کو مارے ہوئے
اک نگاہ گرم نے میری یہ آتش پھونک دی　دونوں عارض لال اس کے جیسے انگارے ہوئے
ایک نے تا صبح دم صورت نہ دکھلائی مجھے　ہجر کی شب کی سیاہی میں یہ گم تارے ہوئے

لگ چلے ہے اس سے جب چوسر کی بازی میں رقیب — بولتے ہیں کچھ نہ کچھ ہم بھی پہ جی ہارے ہوئے
چشمِ گریاں نے دکھائی پھر ہزارے کی بہار — باغ میں چھٹنے سے جب موقوف فوّارے ہوئے
آرسی میں عکس سے لڑتی ہے ہر دم چشمِ شوخ — تم بھی کھورم کھاریوں [1] سے آشنا بارے ہوئے

مصحفی الفت نہ خوباں کی گئی دل سے مرے
جوں جوں پیاران کو کیا وہ اور بھی پیارے ہوئے

535

رفتہ رفتہ وہ بھی میرے آشنا بارے ہوئے — جو بغل میں نیمچہ پھرتے تھے نت مارے ہوئے
زخمِ سینہ پر نمک چھڑکا کیے تا صبح دم — ہجر کی شب نیند کے دشمن مری تارے ہوئے
باغ میں آیا جونہی وہ فتنہ پردازِ جہاں — درہم و برہم چمن کے پھول و پھل سارے ہوئے
شب طبق میں آسماں کے گر پڑے تھے میرے اشک — کچھ ثوابت بن گئے کچھ ان سے سیارے ہوئے
بزمِ عشرت میں جو نکلا وہ مہِ شب بے خبر — خوب سی دیدیں اڑائیں، خوب نظارے ہوئے
باغ میں اس نازِ بستاں بِن جو گزرے ہم کبھو — آتشیں گولے ہمارے حق میں انگارے ہوئے
دن کو ہے صحرانوردی سے ہمیں کام اے رفیق — شب کو بستر پر پڑے رہتے ہیں من مارے ہوئے
جی چھپایا تیغِ ابرو سے جو جا کر باغ میں — نیم کی پتے دہانِ زخم کو آرے ہوئے
ٹک اِدھر آ، منھ چھپائے جائے ہے کیا سچ بتا — یہ ترے بوسوں سے کس کے، سرخ رخسارے ہوئے
کچھ نہیں موقوف یوسف پر ہے دنیا جائے مرگ — خاک میں پنہاں ہزاروں ایسے مہ پارے ہوئے

مصحفی یہ وہ غزل ہے جو کہی ہے میر نے
آئے ہو کیا جانیے تم کس کے سنکارے [2] ہوئے

536

مقتل سے کل جو ہم پسِ قاتل رواں ہوئے — ہمرہ ہمارے اور بھی بسمل رواں ہوئے
خیراتِ حسن ان کو نہ دی کیا کسی نے ہائے — اس در سے کر سوال جو سائل رواں ہوئے

1۔ کھورم کھار : دنگا فساد 2۔ سنکارنا : اشارہ کرنا

کشتی ہماری بیٹھ گئی مانجھ دھار میں　جو آشنا تھے وہ سوے ساحل رواں ہوئے
مجنوں کی ایک پر نہ پڑی آنکھ بل بے ضبط　لیلیٰ کے قافلے میں جو محمل رواں ہوئے
اپنی غرض کو آئے تھے وہ رات مصحفی
لے کر مری بغل سے مرا دل رواں ہوئے

537

اپنی تو رات گریہ و زاری میں کٹ گئی　اور یوں ہی کچھ ستارہ شماری میں کٹ گئی
ظالم خدا کے واسطے اب مجھ سے ہاتھ اٹھا　شہ رگ تو میری ایک کٹاری میں کٹ گئی
ترسوں ہوں بوے مشک کو میں وہ ہی خوش رہیں　جن کی کہ شاہدانِ تتاری میں کٹ گئی
نخلِ حیات نے جو بڑھائی تھی شاخِ عمر　آمد شدِ دو دم کی دو آری میں کٹ گئی
شمشیرِ آبدار رخِ سادہ کی چمک　بجلی بھی دیکھ ابرِ بہاری میں کٹ گئی
اِس سے گلہ کیا، کبھی اُس سے گلہ کیا　اوقات یوں ہی شکوہ شماری میں کٹ گئی
گزری بہ عیش عمر جوانی تو مصحفی
پیری رہی سو شکوہ گزاری میں کٹ گئی

538

وہ قاتل گو مری زنجیر کاٹے　کڑے لوہے کو کیا شمشیر کاٹے
بناوے تیر گر، گر تیر اس کے　جرّت بھی بہرِ زیبِ تیر کاٹے
خداوندا کوئی شب تو کسی طرح　مرے گھر وہ بتِ بے پیر کاٹے
جدائی میں جیے ہم لیک بے ڈول　جو دن کاٹے سو بے تدبیر کاٹے
جو جاوے اس گلی میں پانو اس کا　خداوندا، سگِ بے پیر کاٹے
جو کچھ بولے تو پھر مجلس میں آکر　زبانِ شمع کو گل گیر کاٹے
یہی ہے تیشۂ فرہاد کا کام　تراشے سنگ، جوے شیر کاٹے

سُجھا اے عشق مضموں مصحفی کو
قلم کب تک دمِ تحریر کاٹے

539

زِرہ جس شوخ کی شمشیر کاٹے نہ بانکوں کا سر و زنجیر کاٹے
نہ سمجھو نیمچہ ابرو کو اس کے اسی تلوار نے شہتیر کاٹے
تری تیغِ تغافل نے ستم گر گلے کتنوں کے بے تقصیر کاٹے
اذیّت وہ نہ پائی نقل مو سے نہ دیکھا مار کی تصویر کاٹے
وہ دیوانہ ہوں جو دہشت سے جاں کی نہ آہن گر مری زنجیر کاٹے
گنہ کیا تھا جو یوں بندوں سے اس نے سب اعضاے بدن نخچیر کاٹے
وہ مومن مصحفی جو عمر اپنی
بہ عشقِ حیدرؓ و شبّیرؓ کاٹے

540

رہا میں غم زدہ جوں گردِ کارواں پیچھے کہ مجھ کو چھوڑ گئے میرے ہم زباں پیچھے
خیال ہے اسی جعدِ سیاہ کا مجھ کو پڑے کسی کے نہ ایسی بلاے جاں پیچھے
ہے طرفہ اُنسِ عزیزاں کہ مجھ کو بعدِ فنا ملا کے خاک میں ڈھونڈھیں ہیں استخواں پیچھے
صدا کو سنتے ہی لیلیٰ نے ناقہ ٹھہرایا پکارتا ہوا آتا تھا اک جواں پیچھے
بہ زردیِ زرِ گل پہلے باغباں کو پکڑ صبا! تو ڈھونڈیو بلبل کا آشیاں پیچھے
خرامِ ناز سکھاتا ہے ہردم اس منہ کو پڑا ہے جان کے میرے جو آسماں پیچھے
بری لگے نہ بھلا قیس کو ملامتِ عشق جب اک غریب کے ہوں لاکھ بدزباں پیچھے
بچے بہ صیدِ دلِ مصحفی سو کیوں کہ وہ شوخ
پھرے ہے اس کے لیے ناوک دکماں پیچھے

541

پھرا کے منہ جو وہ دیکھے تھا ہر زماں پیچھے مگر نہفتہ کوئی اس کے تھا رواں پیچھے
کبھی تو نجد میں اے ناقہ ہو سبک رفتار کچھ اس روش سے کہ رہ جائے سارباں پیچھے
ملا نہ سایۂ دیوار زندگی میں تو کیا ہوا مزار پہ گو تیرے سائباں پیچھے
بھلا وہ کون سی تقصیر ان کی مجھ سے ہوئی بھلا برا جو مجھے کہتے ہیں بتاں پیچھے
غمِ عمارتِ تن کھا کے جب ہوئی یہ خراب نہ کام آوے گا ہرگز کوئی مکاں پیچھے
بناوے ہے کوئی باغ اور کوئی کنواں اس سے غرض ہے اتنی کہ رہ جائے کچھ نشاں پیچھے
مزہ دیا جو مری اور تری محبت نے فسانہ اس کا بنا دیں گے قصہ خواں پیچھے

جو مصحفی کی نہیں قدر ان کو اب تو نہ ہو
کریں گے یاد بہت اس کو دوستاں پیچھے

542

یہ جوشِ غم ہے کہ پڑتا نہیں ہے جی پیچھے نہ آدمی کے پڑے اتنا آدمی پیچھے
یہ مضطرب ہے دلِ زار وقتِ رفتنِ یار کہ سایہ ساں کبھی آگے ہے اور کبھی پیچھے
کچھ اعتبار نہیں ربط خوب رویاں کا یہ کر کے دوستی کرتے ہیں دشمنی پیچھے
ہمارا کوئی نہیں اٹھ گئے جہاں سے جو ہم ہماری گور پہ رووے گی بے کسی پیچھے
مزے سے چاہ کے واقف ہیں کچھ وہی معشوق بگاڑ کر کے جو کرتے ہیں آشتی پیچھے

کڑی تھی عشق کی منزل پہ تھک گیا وہ غریب
کہ قافلے کے رہا آج مصحفی پیچھے

543

ہوں شیخ مصحفی کا میں حیرانِ شاعری اللہ مفلسی میں یہ کچھ شانِ شاعری
روندا اسے تمام مرے رخشِ کلک نے سودا سے بچ رہا تھا جو میدانِ شاعری

میں اور لے کے سودہ نمک اس میں بھر دیا تھا اس کا کم نمک جو نمکدانِ شاعری
ہندوستاں کے گردنِ خورد و بزرگ پر ہے سچ تو یہ مرا ہی ہے احسانِ شاعری
پیرو ہیں میری طرز کے یاں چھوٹے اور بڑے ملکِ سخن کا ہوں میں سلیمانِ شاعری
رہتے ہیں اینچا تانی[1] میں اب اس کے اور یار تھا ہاتھ میں مرے جو گریبانِ شاعری
رکھتی ہے نوکِ خامۂ جادو رقم ہنوز مژگانِ تر سے تازہ گلستانِ شاعری
موندی جو آنکھ میں نے تو چشمِ زمانہ سے چھپ جائے گا وونہی مہِ تابانِ شاعری
میں ابتدائے عمر میں مدت تلک بہت چھانا ہے فارسی کا صفاہانِ شاعری
بعد اس کے ریختے کی بھی رکھی ہے وہ بنا حیراں ہیں جس کے نقش طرازانِ شاعری
کچھ کچھ کہے ہیں پھر عربی میں جو شعر و نظم اس میں بھی بن گیا ہوں میں سحبانِ شاعری
دن رات میرے ناخنِ نوکِ قلم میں ہیں لاکھوں طریق و شیوہ و عنوانِ شاعری
ہر سفلہ کا دہن یہ نہیں ہے کہ ہو سکے میرے سوائے شمع شبستانِ شاعری
جس روز میرے جسم سے نکلے گی میری جاں یہ جانیو تو آج گئی جانِ شاعری

لاکھوں ترانہ سنج ہوئے اس کے ریزہ چیں
اے مصحفی مرا ہی ہے وہ خوانِ شاعری

544

میں طرح ڈالوں اگر سوچ کر کہیں گھر کی تو آسماں ہو مرے حق میں وہ زمیں گھر کی
ہوئی ہے دیکھ رخِ یار یہ زخود رفتہ کہ آرسی کے تئیں کچھ خبر نہیں گھر کی
ہزار شکر ہوئی چشم جائے لختِ جگر تلاش رکھتے تھے مدت سے یہ مکیں گھر کی
دریغ اشک کی باراں میں دل خراب ہوا خبر نہ ہم نے رکھی ایسے نازنیں گھر کی
غبارِ دل کو میں مژگانِ یار سے جھاڑا کہ سچ ہے ہوتی ہے جاروب آستیں گھر کی
مباد فتنۂ عالم ترا سراغ کرے بتا نہ راہ تو ہر اک کو مہ جبیں گھر کی

1۔ اینچنا: کھینچنا، اینچا تانی = کھینچا تانی

مباد پھونک دے یہ مصحفی کا خس خانہ
کہ مدعی ہے مری آہِ آتشیں گھر کی

545

ہے مار خیز بلاؤں سے سب زمیں گھر کی
تجھے خبر نہیں کچھ اپنی شانہ بیں گھر کی

بہ فوج تم نے کیا میرا ملکِ دل ویراں
کہ خشت بھی نظر آئی نہ پھر کہیں گھر کی

جہانِ چشم جہاں بیں میں اپنے آئینہ
کہے ہے صاف حقیقت یہ دور بیں گھر کی

بتاں نے کعبۂ دل کو مرے کیا برباد
عمارت آہ ڈہی ایسے دل نشیں گھر کی

بلائے مارِ شبِ ہجر کا نہیں خطرہ
کہ مجھ کو کاٹنے دوڑے ہے خود زمیں گھر کی

نہ بات جاوے کوئی باہر اتنا کیجو ضبط
شبِ فراق تو اے نالۂ حزیں گھر کی

طلا کا خانہ ملا ارسی کو تیری جان
تھی آرزو اسے ایسے ہی نازنیں گھر کی

نہ اتنا دولتِ دنیا پہ ہو تو شیفتہ یار
کنیز کچھ وہ ترے مصحفی نہیں گھر کی

546

تمنائے زلفِ رسا ساتھ ہے
جہاں جاؤں میں یہ بلا ساتھ ہے

کٹے گی تو کیوں کر شبِ تارِ گور
نہ بیگانہ، نے آشنا ساتھ ہے

اسیرِ بلا پھر یہ ہوتا ہے کیوں
جو بندہ کہ ہر دم خدا ساتھ ہے

نہیں اپنے بے نالہ آنسو رواں
مرے کارواں کی درا ساتھ ہے

اگر اڑ کے جاوے تو اے مشتِ خاک
چمن تک تو بادِ صبا ساتھ ہے

نہیں مہلت اک دم کی دیتی اسے
ہر اک آدمی کی قضا ساتھ ہے

مجھے پھر کے دیکھا تو اس نے کہا
ابھی میرے یہ، بے حیا ساتھ ہے؟

میں ہوں خسروِ بحر و بر مصحفی
مرے سر کے بالِ ہما ساتھ ہے

547

سوز ناک آتی ہے ہر گھر سے صدا ساون کی
دل میں اک آگ لگاتی ہے حنا ساون کی

ان دنوں بابِ اجابت جو کھلے رہتے ہیں
جلد کر جاتی ہے تاثیر دعا ساون کی

کیوں نہ اس رت میں کریں پیر و جواں سیرِ چمن
غنچۂ دل کو کھلاتی ہے ہوا ساون کی

اس کے عارض پہ ہے یوں زلفِ پریشاں کی بہار
چاند پر جیسے کہ چھا جائے گھٹا ساون کی

استخواں کہنہ دفینوں کے اسے تھے مطلوب
راہ اک عمر سے دیکھے تھا ہما ساون کی

شستہ و رفتہ نظر آئے ہے کوہ و صحرا
خار اور خاک سے روشن ہے صفا ساون کی

ریگ شوئی پہ زبس ابر نے باندھی ہے کمر
ذرّے ذرّے میں چمکتی ہے صفا ساون کی

پیڑ گل مہندی کے دو چار لگا رکھ اے گل
جب تلک کٹنے پر آ جائے حنا ساون کی

مصحفی گریۂ بے فاصلۂ عاشق میں
وقت شدت کے نکلتی ہے ادا ساون کی

548

خون پیتا ہوں میں جس تیغ دو نابی کے لیے
وہ کمر زیب ہے سو خانہ خرابی کے لیے

زلف اس رشک سے مرتی ہے کہ میرے ہوتے
بوسے کیوں تل نے ترے روے کتابی کے لیے

استخواں پر مرے شمشیر تری ٹوٹ گئی
کیوں نہ غم کھاؤں میں کافر کی خوش آبی کے لیے

رات میخانے میں ساقی نے بڑھائے شیشے
اور ترستے رہے ہم ایک گلابی کے لیے

ایسی ہم مرثیہ خوانی سے دلا درگزرے
جس میں غم کھانا پڑے زور جوابی کے لیے

وقت پر اپنے جو ہاتھ آئے پئے دفعِ خمار
ایک فنجان بھی کافی ہے شرابی کے لیے

لطف مستوں کو گزک کا تھا جو ملتی جاگہ
درِ میخانہ پہ دوکانِ کبابی کے لیے

شب دبے پانو گیا تا بہ لگن شمع کا چور
گھات میں تھا وہ زبس اس کی رکابی کے لیے

مصحفی دلّی کی گلیوں میں در ایامِ شباب
خاک چھانی ہمیں صد احسنِ نقابی کے لیے

نالہ ہی اپنا باعثِ معراج ہو گیا پہنچا دیا فلک پہ ہمیں اس کمند نے
اے وائے شب دیا دلِ حرماں نصیب کو مجلس میں داغِ تازہ فغانِ سپند نے

549

چشم تر ہے نہ رات بھیگی ہے اشک سے کائنات بھیگی ہے
یاسمن تیری گات سے ہو خجل اوس میں پات پات بھیگی ہے
اس نے پہنا ہے جس گھڑی مالا آبِ گوہر میں گات بھیگی ہے
کس کے پانو کے واسطے مہندی طشت میں ساری رات بھیگی ہے
لکھتے خط اس کو ہم پہ روئے ہیں خوں کہ لہو سے دوات بھیگی ہے
لبِ شیریں ہیں اس کے خوش بو یا کیوڑے میں نبات بھیگی ہے
نالہ گو آتشیں ہو، ساون میں گھر کی ساری قنات بھیگی ہے
مصحفی خی میں تب تو آدم کی پیکرِ بے ثبات بھیگی ہے
تا چہل روز مینہ میں رحمت کے
گِلِ والا صفات بھیگی ہے

550

مینہ کیا کیا نبات بھیگی ہے زور ساون کی رات بھیگی ہے
شکر شیریں کے جوئے شیر میں آج پیکرِ خوش صفات بھیگی ہے
گل کی پتی خیِ خجالت میں دیکھ کر اس کی گات بھیگی ہے
عشقِ موئے کمر میں روئی ہے شب مژۂ کائنات بھیگی ہے
خط پہ خط یاں سے جاتے ہیں اور ابھی واں مِداد و دوات بھیگی ہے
کچھ سبب ہے جو آج زاہد کی جا نمازِ صلوات بھیگی ہے

مصحفی اس نگہ سے گل کی کلی
زہر میں پات پات بھیگی ہے

551

جب زباں پر نبات بھیگی ہے   شہد میں اس کی بات بھیگی ہے
چھال کیکر کی رات بھیگی ہے   خم میں چوبِ حیات بھیگی ہے
بسکہ روئی ہے دیکھ اس کی کفک   حور کی خوں میں گات بھیگی ہے
صفِ مژگانِ تر کو دھوپ نہ دوں   دیر سے یہ قنات بھیگی ہے
ماتمِ شہ میں وہ یہ روئے ہیں   کہ عبائے ثقات بھیگی ہے
ہمیں "یہ" مسلا ہے دخترِ رز کو   کہ پسینے میں رات بھیگی ہے
بچ کے چل شیخ، دلقِ رندِ خراب   مے میں اے نیک ذات بھیگی ہے
مصحفی رشحۂ قلم سے مرے
میر کی کلّیات بھیگی ہے

☆☆☆☆

رباعیات

انسان جو فعلِ بد سے تائب ہو جائے بس اس پہ وونہی بہشت واجب ہو جائے
جگنوں کی چمک ہے زندگی تب سمجھے جب یہ بھی نظر سے اس کی غائب ہو جائے

مر جائے وہ حسین اک بلا جینا ہے کیا دوست بغیر دوست کا جینا ہے
مرزا جعفر ہی جب نہ دنیا میں رہے گر مصحفی ہم رہے تو کیا جینا ہے

ہم سمجھتے تھے عمر کو یہ کب آخر ہے پر غور جو کی کھلا یہ اب آخر ہے
اے مصحفی جاگے بہت اس بزم میں ہم اب خواب ہی خواب ہے کہ شب آخر ہے

آتی ہے صدا سانس سے زاری کی سی آنکھوں کے تلے چھا گئی تاریکی سی
جلد آکہ ترے فراق میں اے کافر حالت ہے مری نفس شماری کی سی

افسانہ کہیں ہے بت پرستی کا مری کوئی ذکر کرے ہے عشق و مستی کا مری
میں دیدۂ غور سے جو دیکھا سمجھا ہستی ہے مری ننگ ہی ہستی کا مری

قطعہ

خدا یگانہ یہ معمول ہے قدیم سے یوں کہ جو کوئی کسی عمدہ کی مدح کہہ لاوے
تو چاہیے وونہی وہ اس کے دستِ بخشش سے صلہ نہیں تو تبرک ہی بارے کچھ پاوے
سو آج تک تو تبرک ہوا مجھے نہ صلہ جو صاف کہیے تو کچھ میری عقل میں آوے
رکھا ہے آپ نے مجھ کو تو پھر تبرک ہو وگرنہیں تو صلہ دو کہ لے کے گھر جاوے

قطعات

قطعۂ تہنیتِ عیدِ غدیر

برائے کلب علی خاں پسر نواب سعادت علی خاں بہادر مرحوم

قریب پہنچے جو رحلت کے دن سمجھ کے بات — کیا نبیؐ نے علیؓ کو وصی بہ خُمِ غدیر
کہ یعنی بعد مرے ہو یہ جانشین مرا — کریں متابعت اس کی سبھی صغیر و کبیر
سو تہنیت اسے اس دم تو سب نے دی لیکن — ہوا بطون میں بعضوں کا دل شکست پذیر
بہ ایں خیال کہ شایاں تھے ہم خلافت کے — کہاں یہ مردِ جواں اور کہاں یہ امرِ خطیر
جو ماجرا ہے سو سب مومنیں پہ ظاہر ہے — کروں دعا کو میں آقا کی اپنے اب تحریر
جنابِ کلبِ علی خاں تمھیں مبارک ہو — یہ روزِ عشرتِ عیدِ غدیر، جمِّ غفیر
جو مدّعی ہیں تمھارے ذلیل و خوار رہیں — جو خیر خواہ ہیں حشمت میں ان کی ہو توفیر
نگاہِ لطف نہ اب مصحفی سے رکھیو دریغ — کہ ہے یہ اہلِ معانی میں صاحبِ توقیر

قطعہ در غسلِ صحت

میر فضل علی داروغۂ سرکار بادشاہ بیگم صاحب

روزِ جشنِ غسلِ صحت میر صاحب کا ہے یہ — جس کے باعث گردِ غم جتنی تھی سب دھوئی گئی
ہر طرف جوشِ مبارک باد کی پہنچی صدا — نرگسِ بیمار کو ان کی شفا حاصل ہوئی
بے طلب سائل کو دینا ہے یہ ہمت کا کمال — دیکھنے میں اپنے کم آیا کوئی ایسا سخی

مصحفی کی یہ دعا ہے اب کہ تا روزِ قیام ۔۔۔ تو رہے بے رخ اور آنکھوں کی تیرے روشنی
دشمنوں کے دل کو پہنچے داغِ محرومی مدام ۔۔۔ دوستوں کے سر پہ ہووے سایۂ فضلِ علیؑ

قطعۂ دیگر در تہنیتِ غسلِ صحت

صد شکر کیا آپ نے غسلِ صحت ۔۔۔ حمامیوں کے ہوگئے کیسے پُر زر
گرتے ہی ہوا جسمِ مبارک پہ عیاں ۔۔۔ ہر قطرۂ آب بر مثالِ گوہر

ایضاً

دیے آغا نے گر روپے چالیس ۔۔۔ قوتِ تنخواہ کر گیا یہ جبر
بھاگتے چور کی لنگوٹی ہے ۔۔۔ مصحفی ہاتھ گر لگے کر صبر

ایضاً

مصحفی ساکنانِ خطۂ خاک ۔۔۔ کس طرح آسمانیوں سے ملیں
اس کے ابرو کو تم کہو ہو ہلال ۔۔۔ عقل کے اپنے آپ ناخن لیں

ایضاً

پھنس گیا دامِ زلفِ مشکیں میں ۔۔۔ نہ رہا ہائے لطفِ آزادی
دل نے میرے دلا کے یاد اسے ۔۔۔ ہاتھی کے منہ میں لکڑی پکڑا دی

☆☆☆☆

مثنوی

لکھ قلم وصفِ میر فضل علی — کہ وہ فیاّض ہے خفی و جلی
سیّدِ پاک زاد، نیک نہاد — حکم میں اس کے سب کے سب کشاّد
صاحبِ علم و صاحبِ دانش — صاحبِ فضل و صاحبِ بینش
رتبہ سب سے فزوں ہے اس گھر کا — ماہ سائل بکف ہے اس در کا
اک ذرا سا وہ جس کا ہووے نصیر — نہ رہے دامِ مفلسی میں اسیر
مصحفی کی دعا ہے یہ شب و روز — کہ رہے دشمنوں پہ تو فیروز
دن ترا عید ہو اور شب شبِ قدر — گھر کا روشن چراغ ہووے بدر
یا الٰہی قبول کر یہ دعا — بہ طفیلِ نبیؐ و آلِ عباس

یاں کسی کو نہیں دیتا ہے کوئی پارۂ نان
مصحفی! جان غنیمت جو میسّر ہو جائے

☆☆☆☆

مخمسات

مخمس حسبِ فرمائش عزیزی گفتہ شد

حسنِ معنی دیدۂ مدرک سے نامحسوس ہے　　پاسکے ہے اس کو کب گو عقلِ کل جاسوس ہے
معرفت حیرت سے یاں مالاں کفِ افسوس ہے　　کس کی نیرنگی یہ برقِ خاطرِ مایوس ہے
جو شرر دل سے اٹھا وہ جلوۂ طاؤس ہے

گُل کی رنگینی سے آجاتی ہے بلبل زیرِ دام　　دشمنِ جانِ کتاں ہے جلوۂ ماہِ تمام
جل کے گر رہتا ہے پروانہ دیے سے وقتِ شام　　حسن کو اپنے ہواداروں سے کاوش ہے مدام
ہر تپش یاں شمع کی برقِ دلِ فانوس ہے

دیکھ اس کی شکل کو جیتے نہ یاں سے گھر گئے　　نیم بسمل کچھ ہوئے کچھ زہر کھا کر مر گئے
پوچھتا کیا ہے تو کہہ ساتھی ترے کیدھر گئے　　صبر و طاقت تو کبھی کے کوچ یاں سے کر گئے
اب وداعِ ننگ ہے اور رخصتِ ناموس ہے

جلوہ گر ہے سب میں وہ نورِ تجلی آپھی آپ　　گو کہ مومن ہووے بیٹا راہبِ بت خانہ باپ
نغمۂ توحید میں باہم سُروں کا ہے ملاپ　　ایک ہی پردے کے گر سمجھو تو ہیں یہ سب الاپ
گر صدائے زنگ ہے ور نغمۂ ناقوس ہے

روز مفلس سے سیہ تر شب گزرتی تھی مجھے　　میرے ہم جولی ہر اک دم نام دھرتے تھے مجھے
بے کسی یہ دیکھ آہِ سرد بھرتی تھی مجھے　　کل ہوس اس طرح سے ترغیب کرتی تھی مجھے
کیا ہی ملکِ روم کیا ہی سرزمینِ طوس ہے

چندروزے عزت وحرمت سے کیجے زندگی مثلِ شاہاں ناز اور نعمت سے کیجے زندگی
شاد وخرم رہیے نت راحت سے کیجے زندگی گر میسر ہو تو کسی عشرت سے کیجے زندگی
اِس طرف آوازِ طبل اودھر صدائے کوس ہے

اے سبک سر حال پر اپنے بھی ٹک لازم ہے غور کیوں کہ آتا ہے نظر ان روزوں تیرا رنگ اور
زندگانی کا بن آوے تب تک اس محفل میں طور صبح سے تا شام چلتا ہو مئے گلگوں کا دور
شب ہوئی تو ماہ رویوں سے کنار و بوس ہے

گوش بر آواز تھے میرے وہ یہ اب کیا کہے یا جواب اس کا مجھے کچھ دیوے یا بس چپ رہے
جب مری آنکھوں سے اشکِ ناامیدی بہہ چلے سنتے ہی عبرت یہ بولی ایک تماشا میں تجھے
چل دکھاؤں تو جو قیدِ آز کا محبوس ہے

کچھ نہ دیکھا اس نے میرے یاس وحرماں کی طرف نے دلِ غمگیں و نے چاکِ گریباں کی طرف
ساتھ لے جا کر مجھے اپنے بیاباں کی طرف لے گئی یک بارگی گورِ غریباں کی طرف
جس جگہ جانِ تمنا سو طرح مایوس ہے

دوستوں کی طرح پھسلا کر مجھے کہنے لگے سر جھکا کانوں میں سمجھا کر مجھے کہنے لگے
پاس مدفونوں کے لے جا کر مجھے کہنے لگے مرقدیں دو تین دکھلا کر مجھے کہنے لگے
یہ سکندر ہے، یہ دارا، یہ کیکاؤس ہے

کیا ہوا وہ طمطراق اور کیا ہوا وہ تخت و تاج کیا ہوا وہ سرکشانِ دہر سے لینا خراج
ہیں پڑے کنجِ لحد میں شب ہے ان کی بے سراج پوچھ تو ان سے کہ جاہ و تمکنت دنیا سے آج
کچھ بھی ان کے پاس غیر از حسرت و افسوس ہے؟

بے زری نے کھو دیا زہد و ورع کا مرتبہ شاہ جی کو اس پہ ہے نت بادہ نوشی کا مزا
مصحفی میں ان کو میخانے میں دیکھا بارہا کل تو قدرت پائے خم پر رکھتی تسبیح ریا
آج رہنِ جامِ مے یہ خرقۂ سالوس ہے

مخمّس مطلعِ غزلِ حافظ

بطور ترجیع بند گفتہ شد

وقتیکہ نالہ برمن از مرد و زن برآید در خامۂ فراشم بوے کفن برآید
آں دم ہم ایں کلامِ خوش از دہن برآید دست از طلب ندارم تا کامِ من برآید
یا تن رسد بہ جاناں یا جاں ز تن برآید

جس روز سے ہوا ہے دل اُس پری پہ شیدا وحشی سا میں ہوں پھرتا روتا بکوہ وصحرا
آغازِ دوستی میں سوجھی ہے مجھ کو کیا کیا دست از طلب ندارم تا کامِ من برآید
یا تن رسد بہ جاناں یا جاں ز تن برآید

ملنے کی آرزو جو اس کے رہی ہمیشہ آنکھوں سے جوے خوں ہی میرے بہی ہمیشہ
جب تک کہ دم میں دم ہے، ہے بر دہن ہمیشہ دست از طلب ندارم تا کامِ من برآید
یا تن رسد بہ جاناں یا جاں ز تن برآید

ناصح مزے زباں کے گو اپنی لوٹتا ہے یاں سنگ بن ہی شیشہ تقوے کے پھوٹتا ہے
کب اس گلی کا جانا اب مجھ سے چھوٹتا ہے دست از طلب ندارم تا کامِ من برآید
یا تن رسد بہ جاناں یا جاں ز تن برآید

ہاتھ آوے بارِ پستاں یا وہ ترنج غبغب تاریک شب میں شاید مل جاے لب سے بھی لب
میں اس کے گھر گئے بن یاں چین سے رہا کب دست از طلب ندارم تا کامِ من برآید
یا تن رسد بہ جاناں یا جاں ز تن برآید

چہرے پہ میرے بھائی گو آ گئی ہے زردی آوارہ یہ کرے ہے کچھ ان دنوں میں سردی
پاے جنوں مبارک ہو تجھ کو دشت گردی دست از طلب ندارم تا کامِ من برآید
یا تن رسد بہ جاناں یا جاں ز تن برآید

آنکھوں سے میری آنسو رہتے ہیں بسکہ جاری پہلو میں دل کرے ہے ہر لحظہ بے قراری
گو یار سے جدا ہوں پر ہے یہ شرطِ یاری دست از طلب ندارم تا کامِ من برآید
یا تن رسد بہ جاناں یا جاں ز تن برآید

سینے میں دل کو مسلے گو دردِ نا صبوری نزدیک اپنے دشمن گو جی کی ہووے دوری
ابرام عاشقی میں عاشق کو ہے ضروری دست از طلب ندارم تا کامِ من برآید
یا تن رسد بہ جاناں یا جاں ز تن برآید

ہر چند پاشنوں تک پانو میں آبلے ہیں کانٹوں کی نوکوں سے پر تلوے بھی سب چھلے ہیں
ویسا ہی جوشِ سودا ویسے ہی ولولے ہیں دست از طلب ندارم تا کامِ من برآید
یا تن رسد بہ جاناں یا جاں ز تن برآید

بادِ صبا کو گاہے قاصد بناؤں ہوں میں گہہ مرغِ نامہ بر کو اس سو اڑاؤں ہوں میں
ملنے کی خاطر اس کے سو رنگ لاؤں ہوں میں دست از طلب ندارم تا کامِ من برآید
یا تن رسد بہ جاناں یا جاں ز تن برآید

گو پشتِ پا سے میرے کانٹوں نے سر نکالا گو سُفتہ دُر بنا ہے ہر اک کفک کا چھالا
میں وادیِ جنوں کا ہوں راہ چلنے والا دست از طلب ندارم تا کامِ من برآید
یا تن رسد بہ جاناں یا جاں زتن برآید

عاشق کی جاں کنی ہے ناداں عدو، نصیحت کچھ فائدہ نہ دے گی اے پند گو، نصیحت
مجھ کو عبث کرے ہے دن رات تو نصیحت دست از طلب ندارم تا کامِ من برآید
یا تن رسد بہ جاناں یا جاں زتن برآید

للچاویں آکے مجھ کو گو خوش گلو ہزاروں دکھلاویں آکے مجھ کو گو پشت رو ہزاروں
سمجھاویں آکے مجھ کو گو پند گو ہزاروں دست از طلب ندارم تا کامِ من برآید
یا تن رسد بہ جاناں یا جاں زتن برآید

ہو جاوے حال میرا اس مخمصے میں گو کچھ تقدیر میں الٰہی ہونا ہو میرے جو کچھ
موت وحیات یعنی دونوں میں ایک ہو کچھ دست از طلب ندارم تا کامِ من برآید
یا تن رسد بہ جاناں یا جاں زتن برآید

در عالمِ تصور جب جابجا پھروں ہوں دزدیدہ اس کی گھاتیں سب دیکھتا پھروں ہوں
اس کے خیال کے میں پیچھے لگا پھروں ہو دست از طلب ندارم تا کامِ من برآید
یا تن رسد بہ جاناں یا جاں زتن برآید

دل جس پہ غش ہو کیوں کر ایسا نگار چھوڑوں مشکل ہے دیدِ گل کو فصلِ بہار چھوڑوں
ممکن نہیں کہ کف سے دامانِ یار چھوڑوں دست از طلب ندارم تا کامِ من برآید
یا تن رسد بہ جاناں یا جاں زتن برآید

از بسکہ اِن دنوں ہے دیوانہ پن کا طغیاں　جوں گردبادِ صحرا سرگشتہ و پریشاں
یہ بیت میں پھروں ہوں پڑھتا بہ چشمِ گریاں　دست از طلب ندارم تا کامِ من برآید
یا تن رسد بہ جاناں یا جاں زتن برآید

چلنا پڑا ہے مجھ کو بر سطحۂ ہمہ خوں　پائے پُر آبلہ کا کیوں کر نہ ہوں میں ممنوں
اک لیلیِ زماں کا دل ہو گیا ہے مجنوں　دست از طلب ندارم تا کامِ من برآید
یا تن رسد بہ جاناں یا جاں زتن برآید

میں عشق کے میاں میں بے تیغ ہو کے گھائل　مارے تھا دست و پا جب مانندِ نیم بسمل
اس نظم کا تھا گویا اس شعر کا تھا قائل　دست از طلب ندارم تا کامِ من برآید
یا تن رسد بہ جاناں یا جاں زتن برآید

راہِ وفا میں اپنا سر دے دے مارتا تھا　اوقات چوں مسافر اپنی گزارتا تھا
لب بند ہیں تو گو ہوں دل یوں پکارتا تھا　دست از طلب ندارم تا کامِ من برآید
یا تن رسد بہ جاناں یا جاں زتن برآید

تھا مصحفی جو یارو اہلِ سخن کا مرجع　عمرِ عزیز اس کی جب لائی رو بہ مقطع
وردِ زبان اُس دم حافظ کا تھا یہ مطلع　دست از طلب ندارم تا کامِ من برآید
یا تن رسد بہ جاناں یا جاں زتن برآید

☆☆☆☆

سلام

1

مجرئی پاویں گے شاباش وہ رحماں سے شہید
سرخ رو ہو جو گئے عالمِ امکاں سے شہید

ماتمِ شاہِ شہیداں کی خبر جب پاویں
کیوں نہ کاٹیں لبِ افسوس کو دنداں سے شہید

مژدۂ آمدِ شہ دینے وہ رضواں کو گئے
پیشتر وہ جو ہوئے شاہِ شہیداں سے شہید

اپنے حلقومِ بریدہ کا بہم نیزوں پر
جاتے ہیں دھونے لہو دیدۂ گریاں سے شہید

اشک کا آنکھوں میں لانا ہے شجاعت کا جو ننگ
کام رکھتے نہیں کچھ دیدۂ گریاں سے شہید

غیرِ عباس کہ بوچھار میں تیروں کی مُوا
کوئی ہوتے نہ سنا بارشِ باراں سے شہید

شوق میں سجدۂ خالق کے یہ چاہیں ہیں کہ پھر
سر کو گردن سے ملالیں کسی عنواں سے شہید

سرنگوں خاک پہ تم ان کو نہ سمجھو بے وجہ
لکھتے ہیں محضرِ خوں خامۂ مژگاں سے شہید

سر ہیں نیزوں پہ چڑھے، دوشِ ہوا پر گیسو
شام کو جاتے ہیں کیا اک سروساماں سے شہید

قطعہ کیا دشتِ بلا کا ہے چمن جو اس میں
اٹھتے ہیں دشت و بغل لالۂ نعماں سے شہید

اپنے سر کو جو کٹاتے ہیں خوش ہو ہو آپ
کچھ تو پاتے ہیں مزہ خنجرِ برّاں سے شہید

ریگِ صحرا تو ہے زخموں کی انھوں کے بخیہ
شکوہ کس منھ سے کریں گردشِ دوراں سے شہید

دست رس دامنِ صحرا پہ گر ان کی ہوتی
ڈھانپتے اپنے بدن چشمِ غزالاں سے شہید

سر پہ ہے سایہ فگن تاجِ شہادت ان کے
ننگ رکھتے نہیں ہرگز سرِ عریاں سے شہید

باغِ جنّت میں ہوئے بال فشاں طائرِ روح
جب کہ آزاد ہوئے جسم کے زنداں سے شہید

کربلا ارضِ قیامت کے برابر ہو گی
بن سرے حشر کو جب اٹھیں گے میداں سے شہید

صبر پاداش پہ کرتے تھے سمجھ کر جی میں
معنیِ آیۂ "مَن قُتِل" کو قرآں سے شہید

خوش و خرم انھیں پاتا ہوں مگر جاتے ہیں گلشنِ نور میں اِس تیرہ شبستاں سے شہید
پیاس آبِ دمِ خنجر نے بجھائی ان کی تھی نہ سیراب سرِ چشمۂ پیکاں سے شہید
خون سے ان کے اگر لالہ بنے کیا ہے عجب اُنس جیتے میں بھی رکھتے تھے گلستاں سے شہید
نہیں معشوقِ شہادت پہ نظر گر ان کی تک رہے ہیں یہ کسے دیدۂ حیراں سے شہید
ان کا مقصود ہے خود اپنا گلا کٹوانا جان دیتے ہیں کوئی حسرت و حرماں سے شہید
ایک تو سرخیِ لب دوسرے وہ سرخیِ خوں گل پہ کیونکر نہ ہنسیں پھر لبِ خنداں سے شہید
ہے یہی شوقِ شہادت تو یقیں ہے مجھ کو سر نکالیں گے نئے اور گریباں سے شہید

مصحفیؔ تُو تو ہے مدّاح انھوں کا اغلب
نگہِ گرم کریں تجھ پہ دل و جاں سے شہید

2

"حیدرؑ" جو سلامی کے لبِ جاں سے نکل جائے نام اس کا وونہی دفترِ عصیاں سے نکل جائے
دم اس کا جو گھٹتا تھا تو کہتی تھی سکینہ آہوں کا دھواں خانۂ زنداں سے نکل جائے
یا سینہ زنی کام ہے عشرے کی سحر کو گو تکمۂ خورشید گریباں سے نکل جائے
کرنے دے قضا اس کو تو کبریٰ سے دو باتیں تا حسرتِ قاسم اسی عنواں سے نکل جائے
ارزق بھی جو قاسم کے مقابل ہو نہ ٹھہرے پانو اس کا وونہی رزم کے میداں سے نکل جائے
صغرا سے ملی آکے نہ پھر ہائے سکینہ جان اس کی اسی حسرت و حرماں سے نکل جائے
ماتم ہے یہ اُس شخص کا بس سنتے ہی جس کے "ہے ہے" دہنِ گبر و مسلماں سے نکل جائے
گر حور سنے واقعۂ شاہِ شہیداں سر پیٹ کے وہ روضۂ رضواں سے نکل جائے
اس واسطے روتا ہوں میں کہہ "وائے حسینا" تا کچھ تو بخار اس دلِ نالاں سے نکل جائے
خوش ہو غمِ شہ میں جو پرِ پشّہ برابر نم اشک کی باہر بُنِ مژگاں سے نکل جائے
تھا رحم جو آتا تپِ عابد پہ اجل کو کہتی تھی یہ اب زحمتِ بحراں سے نکل جائے

خیمے میں لعیں آ جو پڑے بولی یہ زینب
یہ بادِ خزاں کاش گلستاں سے نکل جائے

اے دل غمِ اصغر میں بھری آتی ہیں آنکھیں
یوں ہائے وہ بازی گہِ طفلاں سے نکل جائے

رو اتنا کہ طاقت ہو جو کچھ تیرے بدن میں
ساری وہ رہِ دیدۂ گریاں سے نکل جائے

چاہے تھا صفِ جنگ میں ہر ایک دلاور
آگے علمِ شاہِ شہیداں سے نکل جائے

یہ تعزیہ خانہ ہے حسینؑ ابن علیؑ کا
یاں بات نہ بیجا کوئی انساں سے نکل جائے

شبنم سے رہے وہ تہِ دندانِ تاسف
غنچے کی ہنسی گر لبِ خنداں سے نکل جائے

بوچھار سے تیروں کی یہ عباس کو غم تھا
پانی نہ کہیں مشک کا پیکاں سے نکل جائے

جب پائے علم مصحفی یہ نوحہ پڑھوں میں
اَحسنت لبِ زمزمہ سنجاں سے نکل جائے

3

سلامی اشک سے یہ چشمِ مومنیں تر ہے
کہ جس سے فرش ہے نم ناک اور زمیں تر ہے

جو دستِ شاہ میں تھی خاتمِ رسولؐ اللہ
رکھ اس کو منھ میں کہا کچھ تو یہ نگیں تر ہے

تمام عمر یہ رویا پدر کے ماتم میں
نہ آج کل ہی رخِ زین العابدیں تر ہے

یہ پُر ہوئے ہیں شہیدوں کے خون سے تھالے
کہ قتل گاہ کی دو دو وجب زمیں تر ہے

سپرد کی ہے جو قاسم نے وقتِ رخصت کے
وہ اشکِ گریۂ کبریٰ سے آستیں تر ہے

بخارِ عابدِ بیمار ہے بہ شدت، اور
عرق میں اس کا سراپائے نازنیں تر ہے

ملک فلک پہ جو ہر لحظہ گریہ کرتے ہیں
انھوں کے اشک سے تا چرخِ ہفتمیں تر ہے

فلک سے یہ عمل ایسا ہوا کہ آج تلک
ہے آفتاب حمل ماہ کی جبیں تر ہے

نہ اک شلوکا ہی خوں میں بھرا ہے اصغر کا
کہ اس کی ٹوپی بھی باز لفِ عنبریں تر ہے

پسینہ تن سے جو عابد کے پونچھے تھی زینب
دویم بھی نم ہے جو رومالِ اوّلیں تر ہے

کوئی رہا نہیں بن زخم کھائے میداں میں
لہو میں واں تنِ شیرانِ پوستیں تر ہے

زبسکہ کاسۂ سر شاہوں کے اتارے ہیں اک انفعال میں تیغِ معاندیں تر ہے
بہ حالِ زارِ شہیدانِ اوفتادہ بہ دشت ہر اک غزال کا واں دیدۂ نمیں تر ہے
لکھوں میں حال شہیدوں کا مصحفی کب تک
کہ دیدۂ قلمِ معجز آفریں تر ہے

4

رکھے جو مجرئی گام ایسی زمیں پر کیوں نہ ہو اس کا مقام عرش بریں پر
تا صبح قیامت نہ ہوئی دہر میں طالع؟ باندھیں کمر اہل شام خانہ نشیں پر
نامۂ بیعتِ یزید پہنچے جو مدینہ لاوے وہ آفت تمام گوشہ گزیں پر
صبر اسے کہتے ہیں ذبح کے دم بھی چیں نہ لائے امام اپنی جبیں پر
پڑھتے تھے اکبر کے شاہ تا بہ جوانی سورۂ یوسف مدام روے حسیں پر
عطش کی شدت میں جھیل ظلم گیا حیف اصغرِ معصوم نام جانِ حزیں پر
قول میرا مصحفی ہے تو بھی سن
بھیجوں پیاپے سلام سرورِ دیں پر

☆☆☆☆